ہُما
اردو ڈائجسٹ
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر
THE ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ہندوستان کی بہترین مطبوعات میں سے ایک

اگست ۱۹۷۲ء
جلد ۸
شمارہ ۴۳

مدیر
عبدالوحید صدیقی

فون
۷۸۸۶۴

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

قیمت :- چار روپے

عام شمارہ کی قیمت، ایک روپیہ پچھتر پیسے۔ سال بھر کی قیمت تیس روپے۔ جس میں سالنامے کی قیمت و بارہ روپے رجسٹری و اک خرچ کے لئے بھی شامل ہیں۔ ہر شمارہ رجسٹری سے بھیجا جاتا ہے

اردو ڈائجسٹ ہما۔ جے ۱۷ جنگپورہ ایکسٹنشن، نئی دلی ۱۴

ہمارے بال و پر

ایک شام ۱۹۷۲ء

اچھا — یا — بُرا

منظومات

ترتیب:۔ احمد مصطفیٰ صدیقی ——— تزئین کار:۔ بہزاد لاہی ——— ناظم اعلیٰ:۔ خالد صدیقی

——— مطبوعہ:۔ شرما آفسٹ پریس چاوڑی بازار دہلی ——— پرنٹر پبلشر:۔ عبدالوحید صدیقی ———

مالکان:۔ ہما پبلیکیشنز، نئی دہلی ۱۴ ——— مقام اشاعت:۔ جے ۱۷ جنگپورہ ایکسٹنشن، نئی دہلی ۱۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقرأ باسم ربک الذی خلق ۝ خلق الانسان من علق ۝ اقرأ وربک الاکرم ۝ الذی علم بالقلم ۝

علم الانسان ما لم یعلم ۝

وضاحت

اپنے اس پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ـــ لوگو! پڑھو تمہارا پروردگار بڑا کرم کرنے والا ہے۔ وہ، وہ ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو ان چیزوں کا علم دیا جس کو وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا

نوٹ۔ قرآن حمید کی پہلی وحی کا پہلا لفظ ہی "تعلیم" ہے اس کے بعد انسانی تخلیق کا بیان ہے گویا انسان اور تعلیم کا جسم و جان کا تعلق ہے۔ لیکن تعلیم سے مراد وہی تعلیم ہے جو انسان بنانے والی ہے۔ مختصر یہ کہ قرآنی تعلیم اور پھر اس معیار پر جو تعلیم بھی آجائے یعنی ساری دنیا کی جائز تعلیم۔

(احمد مصطفیٰ صدیقی)

میں کہاں رُکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

۳۷ ویں منزل

انگریزوں کے دورِ حکومت میں جب انگریزی زبان نے سرکاری دفاتر سے فارسی کو بیدخل کر کے اس کی جگہ اپنا سکہ چلایا اور نظامِ حکومت میں حصہ دار بننے کے لئے انگریزی زبان اور جدید علوم سے ——— آگاہی ناگزیر بننے لگی تو ہوا کا رخ پہچان کر ہندوستانیوں کے دانشمند طبقوں نے حکمرانوں کی زبان سیکھنے اور جدید علوم حاصل کرنے کی طرف سبقت کی۔ نتیجے میں وہ بتدریج اعلیٰ عہدوں اور منصبوں پر فائز ہونے لگے۔ لیکن مسلمان اپنے مذہبی پیشواؤں کی ہدایت کے مطابق انگریزی تعلیم اور علوم جدیدہ کی تحصیل سے گریزاں رہنے کی بنا پر نظامِ حکومت میں مؤثر اور قابلِ قدر جگہ حاصل کرنے کے قابل نہ بن سکے۔ اور اس پسماندگی کا اثر ان کے پورے معاشرہ میں نمایاں ہونے لگا۔ سر سید احمد خاں نے اپنے فرقہ کی اس کوتاہی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ اگر مسلمان اس دوڑ میں شریک ہونے سے اسی طرح گریز کرتے رہے تو وہ بالکل مفلوج ہو کر رہ جائیں گے اور ان کا مستقبل بیحد تاریک ہو جائے گا۔ اس احساس کے ساتھ ہی ان کا دردمند دل تڑپ اٹھا اور انہوں نے مسلمانوں کو انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کے حصول کی طرف مائل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور کسی دوسرے کی نہیں خود مسلمانوں کی حوصلہ شکن مخالفتوں کے باوجود اپنے پائے عزم و استقلال میں لغزش نہ آنے دی۔ چنانچہ ان کی پُرخلوص کوششیں بارآور ہوئیں اور "مدرستہ العلوم" کی شکل میں جو ننھا سا پودا علیگڈھ کی سرزمین پر نصب کیا گیا تھا۔ اس کی شاخوں نے پھیل کر جلد ہی "مسلم اینگلو اورنیٹل کالج" کی شکل میں ایک تناور اور فیض بار درخت کی حیثیت اختیار کر لی اور پھر یہی درخت ایک مثالی یونیورسٹی بن کر کئی براعظموں کے تشنگانِ علومِ جدیدہ کو سیراب کرنے لگا ——— آج ہم اسی یونیورسٹی کا تعارف ہما کی اس خاص اشاعت

کے ذریعہ کرا رہے ہیں۔ اس یونیورسٹی نے کتنے
عظیم کارنامے انجام دیئے ــــــ کیسی کیسی نامور شخصیتیں پیدا کیں۔ زندگی کے ہر میدان میں کس طرح اپنی
افادیت اور خدمت کے جھنڈے گاڑے یہ سب کچھ آپ کو اس خاص شمارہ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ ہم تو
ان سطور میں صرف چند قابلِ توجہ حقیقتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

مدرسۃ العلوم علیگڈھ کا قیام ایسے وقت میں ہوا جب فرنگی ہندوستانیوں کو مذہبی بنیادوں پر ایک دوسرے
سے متنفر کرکے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ ایسے میں کسے گمان ہو سکتا تھا
کہ کوئی سرپھرا ہندوستانی انگریزوں کی اس بنیادی پالیسی پر ضرب کاری لگانے کی جرأت کر سکتا ہے۔
لیکن سید احمد خاں نے "جام وسنداں باختن" کا یہ کھیل اتنے خوبصورت انداز میں کھیلا کہ باغباں بھی خوش
رہا اور صیاد بھی ناراض نہ ہوا یعنی انہوں نے یہ علمی مرکز قائم تو اس لئے کیا کہ مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے آشنا بناکر
ترقی کی دوڑ میں دوسرے ہم وطنوں سے پیچھے نہ رہنے دیا جائے لیکن ان کی حکمتِ عملی کا روشن ترین پہلو یہ تھا کہ جب
حاکم و محکوم دونوں میں سے کوئی بھی "سیکولرزم" کی اصطلاح سے آشنا نہ تھا اُس وقت انہوں نے اس مبارک مدرسہ میں
نعروں اور ڈھنڈوروں کے بغیر "سیکولرزم" کی بنیادیں استوار کیں، انہوں نے فرقہ وارانہ منافرت کے افعی کا سر خاموشی
کے ساتھ کچلا، انہوں نے ہندو مسلمان کو اس مادرِ علمی کی آغوش میں بھائی بھائی بنکر رہنا سکھایا۔ اساتذہ کی صف ہو یا طلبا
ــــــ کی دنیا یہاں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز کہیں سر نہ اُبھار سکا، اور یہ حسین منظر ایسی حالت میں تھا کہ اس ادارہ کے
سرپر "مسلم" کا طغرائے امتیاز تھا، یہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا تھا، اس کے ذریعہ مسلمانوں کی علمی پسماندگی دور
کرنی تھی۔ یہاں مسلم فرقوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام تھا، یہاں ان کی عبادت گاہیں تھیں۔ گویا یہاں کا در و بست مسلم
تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا اور اس کے بغیر یہاں رواداری ہوتی، یہاں فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہوتی
اور یہاں سچی ہندوستانیت ہوتی تو ان محاسن کا سہرا مسلمانوں کے سر کیسے بندھ سکتا۔ مسلمانوں کو تو اس کا کریڈٹ اسی
وقت مل سکتا ہے جب رواداری، بھائی چارے، فرقہ وارانہ میل ملاپ اور باہمی محبت و یکجہتی کا مظاہرہ ایسے
ماحول میں ہو جہاں کے مالک و مختار بلا شرکت غیرے وہ خود ہوں اور سید احمد خاں نے یہی کرکے دکھایا اور آنیوالی
مسلمان نسلوں کے لئے آب زر سے لکھنے کے لائق یہ سنہرا ضابطۂ حیات چھوڑا۔ مسلم یونیورسٹی کا یہ مثالی کردار
آزاد ہندوستان کے آزاد باشندوں کو بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے اور آج جبکہ فرقہ وارانہ یکجہتی اور سیکولرزم
کے مفہوم اور اسکی اہمیت سے ہر ہندوستانی واقف ہوچکا ہے مسلم

یونیورسٹی کے اس امتیاز کو نہ صرف محفوظ رکھنے کی بلکہ اسے اور آگے بڑھانے کی بہترین کوششیں ہونی چاہئیں اور یہی مزاج دوسرے تمام ایسے تعلیمی اداروں کا بنانا چاہئے جو کسی ایک فرقہ کیساتھ منسوب ہوں اور جن پر ان کا مکمل انتظامی اور عملی کنٹرول ہو۔ ارباب حکومت اور مختلف الخیال سیاسی جماعتوں کو سنجیدگی کیساتھ اس راز کو سمجھنا چاہئے کہ یکجہتی وہی دیرپا اور بہترین نتائج کی حامل ہو سکتی ہے جو اپنے اندر سے پیدا ہو۔ باہر سے لادی ہوئی یکجہتی سے پیدا ہونے والے نتائج نہ دیرپا ہوں گے نہ نتیجہ خیز۔

مسلم یونیورسٹی ایکٹ :۔ مسلم یونیورسٹی بل جسے حکومت نے حیران کن سُرعت اور چابکدستی سے ایکٹ کی شکل دیدی آجکل ارباب دانش اور اہل فکر کے لئے موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اسکی مخالفت بھی ہو رہی ہے اور موافقت بھی۔ ہمارا یہ خاص نمبر پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس ایکٹ کے حامیوں اور مخالفوں کو مسلم یونیورسٹی کی حقیقت اور اسکا نصب العین سمجھنے میں مدد ملے اور انکی حمایت یا مخالفت اندھے کی لاٹھی نہ بن جائے۔ ہم اس مختصر معروضہ میں ایکٹ کی خامیوں اور خوبیوں سے بحث نہ کر سکیں گے پھر بھی چند ضروری پہلوؤں پر روشنی ضرور ڈالیں گے۔

ایکٹ نے یونیورسٹی کے سر پر "مسلم" کا طغرائے امتیاز باقی رکھا ہے، اسلامی عبادتگاہوں کو باقی رکھا ہے، اسلامیات کے مطالعہ کا دروازہ بند نہیں کیا ہے لیکن اس مطالعہ کے سلسلہ میں یہ اضافہ ضرور کر دیا ہے کہ اسلامیات کے مطالعہ کے ساتھ ہی یہاں ہندوستانی مذاہب اور تہذیب کا مطالعہ بھی کیا جائے گا۔ یہاں بلا ارادہ مذہبی اسلام اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب کے درمیان جو حد فاصل قائم ہو گئی ہے وہ ذہنی اعتبار سے کتنے بھیانک نتائج کی حامل ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں ہے۔ کاش یہی بات اس طرح کہی گئی ہوتی کہ "اسلامیات کے مطالعہ کے ساتھ ہی یہاں ہندوستان کے دوسرے مذاہب و تہذیب کے مطالعہ کا انتظام بھی کیا جائے گا۔" تو کتنی اچھی بات ہوتی اور ایک لفظ "دوسرے" کے اضافہ سے مفہوم کتنا خوشگوار ہو جاتا ۔۔۔۔۔ اسی طرح ایکٹ کے مخالفوں اور حامیوں نے "اقلیتی کردار" اور "تاریخی کردار" کی نئی اصطلاحات کے جھگڑے کھڑے کر کے بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے۔ حالانکہ ایک مسلم یونیورسٹی کا کردار "مسلم" ہی ہونا چاہئے۔ یعنی وہی "تاریخی کردار" جو سید احمد خاں کے پیش نظر تھا اور جس کا عملی مظاہرہ مدرسۃ العلوم کے قیام سے لیکر یونیورسٹی کی ابتک کی عملی زندگی سے ہوتا رہا ہے ۔۔۔۔ اگر یونیورسٹی کو "مسلم یونیورسٹی" تسلیم کر لینے کے بعد اسکے کردار کو ابتک کا تقاضی مسلم کردار تسلیم کر لیا جاتا تو نہ "اقلیتی کردار" کی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت ہوتی نہ "تاریخی کردار" پر زور دینے کی احتیاج باقی رہتی ۔۔۔۔ یہ کہنا بھی اپنے اندر کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتا کہ اسے اقلیتی (مسلم) ادارہ تسلیم کر لیا جائیگا تو اس میں صرف ۸ ہزار مسلمان تعلیم حاصل کر سکیں گے باقی مسلمان تعلیم حاصل کرنے کے لئے کہاں جائیں گے۔ مسلم یونیورسٹی کو مسلم ادارہ تسلیم کر لینے کے یہ معنی تو نہیں ہونگے کہ دوسرے تعلیمی اداروں کے دروازے مسلمان طلباء پر بند ہو جائینگے۔ جسطرح مسلم یونیورسٹی کے دروازے غیر مسلم طلباء کے لئے کھلے ہوتے ہیں اسیطرح دوسرے تعلیمی اداروں کے دروازے مسلم طلباء کیلئے کھلے رہینگے۔ اگر صرف لڑکیوں کیلئے کوئی اسکول یا کالج مخصوص ہونے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ لڑکیاں دوسرے اسکولوں یا کالجوں میں داخلہ نہیں لے سکتیں۔ یا کسی ٹرین میں زنانہ کمپارٹمنٹ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ عورتیں کسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں بیٹھ ہی نہیں سکتیں، تو کسی اقلیتی ادارہ کی تعلیم گاہ کا بھی یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اس اقلیت کے امیدوار دوسری تعلیم گاہوں میں داخل ہی نہیں ہو سکتے ۔۔۔۔ اسی طرح کسی اقلیت کی تعلیم و کلچر وغیرہ کی حفاظت کے لئے حکومت کی طرف سے مالی امداد دینا بھی اس اقلیت کی خصوصیات کو ختم کر دینے کا موجب نہیں بن سکتا نہ اسکے "نیشنل" ہونے کے منافی ہو سکتا ہے۔ اقلیتیں بھی قوم کا ایک حصہ ہیں اور انکی ہر حیثیت کی حفاظت کرنا ایک اچھی اور جمہوری حکومت کا ضروری فریضہ ہے۔ اسلئے کسی اقلیتی ادارے کو مالی امداد دیکر اس کی روح اور بنیادی حیثیت کو ختم کرنے کا بہانہ کسی انصاف پسند کے نزدیک جائز نہیں ہو سکتا۔

حرفِ آخر :۔ اس وسیع موضوع پر ان مختصر گذارشات کے بعد ہم ارباب حکومت سے عرض کرینگے کہ وہ کسی منفی بحث میں پڑ کر ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے جذبات کے احترام کو ترک نہ کریں اور قانون کو ایسی شکل دینے کا جرأتمندانہ اقدام کریں جو مسلمانوں کی جائز خواہشات کو پورا کر سکے اور مسلمانوں سے ہماری درخواست یہ ہے کہ وہ سید احمد خاں کی پالیسی کو سمجھیں اور اس پر عمل کر کے زندگی کی دوڑ میں مسلمانوں کو پیچھے رہ جانے سے بچائیں۔ یہی ہمارا مشورہ ہے اور یہی ہماری درخواست ہے۔

عبدالوحید صدیقی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم اور اسٹوڈنٹس یونین کے صدر سید قمر محمود سے ملاقاتیں

(خالد ہندی)

میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کیمپس میں وکٹوریہ گیٹ کے سامنے کھڑا ہوا ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس عمارت کو دیکھ رہا تھا جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدموں کو جمانے اور پست ہمتی کو ہمت و استقلال اور عزم و حوصلہ میں بدلنے کا وسیلہ بنی۔ جس کی ہر اینٹ ایک مظلوم ملت کیلئے انتشار اور بربادی سے نکل کر اتحاد اور ترقی کی منازل طے کرنے کا ذریعہ بنی، جس کا ہر در اور جس کی ہر دیوار آج بھی زبان بے زبانی سے یہ کہہ رہی ہے کہ نعرے کسی بھی ملت کو تاریکی سے روشنی کی طرف نہیں لے جاتے۔ اگر اندھیرے سے نکلنا ہے اگر دنیا میں کچھ کرنا ہے اور اگر زندگی کو نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنی ملت اور اپنے ملک کے لئے مفید بنانا ہے تو صرف جذباتی نعرے نہ لگاؤ۔ حالات کا نوحہ نہ پڑھو۔ سینہ کوبی اور ہائے ہائے کو اپنا رہنما نہ بناؤ بلکہ عمل کرو۔ ایثار و قربانی کی راہ اختیار کرو۔ صبر و استقلال سے کام لو اور جہاد کرو۔ اپنے نفس کے خلاف، خود غرضی اور موقع پرستی کے خلاف۔ اگر تم عمل نہیں کرسکتے تو تمہیں دنیا فراموش کردے گی۔ تمہارا نام حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا اور آنیوالی نسلیں تمہیں فراموش کردیں گی۔

یہ وہ عمارت تھی جس نے ایک درماندہ قوم میں علم و فضل کا صحیح اور حقیقی ذوق پیدا کیا۔ جس نے اندھیرے میں بھٹکتی ہوئی ایک بے سہارا ملت کے لئے مینارہ نور کا کام کیا اور جس نے مسلمانوں کو نقالی، ظاہر پرستی اور خوش فہمیوں کی ٹیڑھی میڑھی راہوں سے ہٹا کر بامقصد زندگی کی راہ پر انکی رہنمائی کی۔

میں رو رہا تھا۔ میرا دل رو رہا تھا۔ اگر یہ عمارت نہ بنی ہوتی تو آج ہندوستان میں مسلمان جہالت کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہوتے۔ قومی زندگی میں ان کا کوئی اہم مقام نہ ہوتا۔ اور وہ اپنے گلوں میں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد کے تعویذ پہنے ہوئے بھکاریوں کی طرح سسک سسک کر زندگی گزار رہے ہوتے۔ اس عمارت نے انہیں احساس شکست اور احساس کمتری سے نکال کر باعزت زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا۔ فتح و نصرت سے ہمکنار کیا اور ان کے تن مردہ میں نئی جان ڈالی۔

آج اس عمارت کے اردگرد وسوسے، شکوک و شبہات اور خوف و ہراس کے بادل منڈلا رہے ہیں، مخالفت کی بجلیاں کوندرہی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ابھی کوئی بجلی گرے گی اور یہ عمارت خس و خاشاک کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔ غم اس کا نہیں کہ یہ عمارت بجلیوں کی زد پر ہے بلکہ رنج ہے اس بات کا کہ اگر یہ آشیانہ جل کر خاک ہوگیا تو کوئی سرسید نہ ہوگا جو اس خاک کے ڈھیر سے اس سے بہتر آشیانے کی تعمیر کرسکے گا اور کوئی محسن الملک نہ ہوگا جو ایک نیا آشیانہ تعمیر کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کرسکے اس لئے اگر میں یہ کہوں کہ یہ اینٹ اور گارے کی عمارت کروڑوں زندگیوں کی علامت ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اور شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اگر یہ عمارت اپنی پوری تاریخ، اپنی روایات اور اپنے عظیم ماضی کے رنگ و روغن سے محروم ہوگئی تو کروڑوں جسم بے روح اور بے جان ہوجائیں گے۔ اسی تصور کو لے کر میں آگے بڑھ گیا۔

اب میں علوم مغربی ایشیا کے مطالعہ کے مرکز میں داخل ہوگیا۔ اس مرکز کی لائبریری میں قیصر محمود مطالعہ میں غرق تھے ـــ قیصر محمود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کے صدر ہیں۔ دیکھنے میں کم عمر نظر آتے ہیں لیکن باتیں کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سوچنے سمجھنے کا انداز بالغوں جیسا ہے۔

وہ مجھے ایک بہت صاف ستھرے اور پرسکون کمرے میں لے گئے، جس کی دیوار پر ایک طرف مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کا نقشہ "ہرے آنسو" بہا رہا تھا اور دوسری طرف بلیک بورڈ پر علم حدیث کے متعلق چاک سے کچھ سوالات لکھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ پھر میں نے ان سے براہ راست یہ سوال کیا "مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء میں کیا خامیاں

ہیں اور آپ کیوں اس کے مخالف ہیں؟" انہوں نے بڑے نرم اور ملائم لہجہ میں جواب دیا "بنیادی طور پر اس میں چار خامیاں ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کا جو جمہوری اور خود مختاری کا کردار تھا وہ مجروح ہوا ہے کیونکہ سات سال پہلے جو آرڈیننس نافذ کیا گیا تھا اسی کو ایکٹ کی شکل دے دی گئی ہے اور وائس چانسلر کو بے تحاشہ اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ خاص طور پر اساتذہ کے تقرر کے سلسلہ میں اور تمام دیگر امور میں اسے آمرانہ اختیارات دیئے گئے ہیں۔ اور وائس چانسلر کے ذریعہ جو حکومت کا نامزد افسر ہے حکومت یونیورسٹی پر پورا کنٹرول رکھے گی۔

"دوسری بات یہ ہے کہ اس ایکٹ نے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو ختم کر دیا ہے جس کے سلسلہ میں وزیر اعظم نے الیکشن سے پہلے اپنی پریس کانفرنس میں اور پھر کانگریس کے انتخابی منشور میں وضاحت سے اپنا نقطہ نظر رکھا تھا اور اسی کی بنیاد پر پوری علی گڑھ برادری نے ان کی حمایت کی تھی۔ ایکٹ میں اس کردار کو برقرار نہیں رکھا گیا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کے نظم و نسق میں طلبہ کی کوئی نمائندگی نہیں ـــ کورٹ میں طلبہ کی نمائندگی میرے خیال میں وائس چانسلر کی نمائندگی ہے کیونکہ طلبہ کے ان نمائندوں کو وائس چانسلر نامزد کرے گا اور چونکہ وائس چانسلر حکومت کا نامزد کیا ہوا افسر ہوگا اس لئے ایک طرح سے یہ نمائندگی بھی حکومت ہی کی ہوگی۔ اسٹوڈنٹس کونسل میں بھی اسی چال سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں ۲۷ ممبر ہونگے۔ ۱۰ منتخبہ اور ۱۷ براہ راست نامزد کردہ، کونسل کے ۱۰ ممبروں کا انتخاب بھی جمہوری نہ ہوگا بلکہ وائس چانسلر کے نامزد کئے ہوئے طلبہ انہیں چنیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور مذاق کی بات یہ ہے کہ اسٹوڈنٹس کونسل کا چیرمین ٹیچر ہوگا اور وہ بھی وائس چانسلر کا نامزد کیا ہوا۔

"چوتھی بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کورٹ میں اساتذہ اور سابق طلبہ (اولڈ بوائز) کو مناسب نمائندگی نہیں دی گئی ہے۔ وہ بھی نامزد کئے ہوئے ہوں گے۔ اس طرح نامزدگیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہوگا جو یقینی طور پر آزادئ رائے کے لئے بہت بڑی رکاوٹ بنے گا۔" ایکٹ پر اپنے اعتراضات کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد قیصر محمود نے کہا۔ "اس ایکٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کو پارلیمنٹ نے تسلیم کر لیا ہے۔"

"کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آئینی اعتبار سے حکومت کسی اقلیتی فرقہ کے لئے کوئی ادارہ نہیں قائم کر سکتی۔ اس سلسلہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے قیصر محمود سے دریافت کیا اور انہوں نے زیر لب ہنستے ہوئے کہا "میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرے خیال میں اگر پارلیمنٹ یہ محسوس کرے کہ کوئی اقلیتی فرقہ پسماندہ ہے تو وہ اس کے لئے ایک ـــ

انٹرویو۔ ہما میں شائع ہونے والی ملاقاتوں کا مقصد آپ کو مختلف اور متضاد نظریات رکھنے والے ممتاز اور نمایاں افراد سے متعارف کرانا اور ان کے خیالات سے باخبر کرنا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ان کے خیالات سے ہمیں یا آپ کو اتفاق بھی ہو ان ملاقاتوں کے ذریعے آپکو ہر جماعت کے بڑے بڑے رہنماؤں کے دلوں کے مخفی گوشوں میں جھانک کر انہیں سمجھنے اور پہچاننے کا موقع ملتا ہے اور یہ ایک بڑا فائدہ ہے یاد رکھئے، کہ جس شخص سے انٹرویو لیا جاتا ہے ہم اس سے صرف سوالات ہی کر سکتے ہیں یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمارے ہر سوال کا جواب دے یا کسی اختلافی جواب پر ہم اس سے بحث کریں۔

(ادارہ)

ادارہ قائم کرسکتی ہے نہ کہ حکومت خود ہمارے قائم کئے ہوئے ادارہ پر قبضہ کرے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو تسلیم نہ کرنے کے سلسلہ میں حکومت جو دلیل دیتی ہے ـــ وہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر اس کی دلیل کو مان لیا جائے تو پھر حکومت کو یہ یقین دہانی کرانی ہوگی کہ مسلم پرسنل لاء ہو یا کسی اقلیت سے متعلق کوئی بھی مسئلہ پارلیمنٹ میں نہ آئے گا۔"

اب میں نے قیصر محمود سے پوچھا: "مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے سلسلہ میں بنارس اور فیروز آباد میں جو خون بہا اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟" انہوں نے بڑے تیکھے انداز میں جواب دیا "یہ خون ناحق ان لوگوں کی گردن پر ہے جنہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم تحریک نہ چلنے دیں گے۔ جمہوری حقوق نہ دیں گے اور پُر امن جمہوری طریقوں سے ایکٹ کے متعلق ایکٹ کے مخالفوں کو اپنا نقطۂ نظر نہ پیش کرنے دیں گے۔"

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ مسلم جماعتوں نے سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لئے یہ تحریک چلا رکھی ہے اور وہ الیکشن کے وقت کانگریس اور حکومت کے خلاف مسلمانوں کی بے چینی سے استفادہ کریں گے؟ کیا یہ خیال درست ہے؟" میرے اس سوال کے جواب میں قیصر محمود نے رُک رُک کر کہا: "میں بحیثیت صدر اسٹوڈنٹس یونین اس سلسلہ میں اپنی رائے نہیں دے سکتا کیونکہ یونین کی پالیسی اور روایت یہ ہے کہ کسی بھی مسلم تنظیم کے خلاف چاہے وہ سیاسی ہو یا مذہبی کوئی مذمتی بیان نہ دیا جائے۔" پھر وہ خاموش ہو گئے اور اپنے سامنے رکھی ہوئی کتاب کو الٹ پلٹ کر کہنے لگے: "ہندوستان میں ۷۵ یونیورسٹیاں ہیں اگر ایک یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے چھوڑ دی جائے تو آسمان نہ پھٹ پڑے گا۔"

میں نے ان سے پوچھا: "کیا ایک یونیورسٹی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرسکتی ہے؟" اور انہوں نے میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا: "کبھی نہیں۔ لیکن علی گڑھ کی بات دوسری ہے۔ یہ صرف ایک یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کا ثقافتی مرکز بھی ہے اور اس سے مسلمانوں کا تین چوتھائی صدی کا جذباتی لگاؤ بھی ہے اس کی کچھ اسلامی قدریں ہیں اس کا ہر جلسہ تلاوت قرآن سے شروع ہوتا ہے ـــ اس کی ہر ڈگری پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہوتا ہے اس کا مونوگرام اسلامی طرز کا ہے اور اس سے پڑھ کر نکلنے والے اپنے نام کے ساتھ علیگ لکھنا فخر کی بات سمجھتے ہیں۔

" ان تمام روایات کو اسی صورت میں زندہ رکھا جا سکتا ہے جب اس کے ایڈمنسٹریشن میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ جب ایکٹ میں ان سب کو برقرار رکھنے کی ضمانت دی جائے۔"

ایک زمانہ میں علیگڑھ کی شیروانی اور علیگڑھ کا پاجامہ مسلمانوں کی مجلسی زندگی میں اہم مقام رکھتا تھا لیکن اب علیگڑھ کا یہ امتیاز ختم ہو رہا ہے اور خال خال ہی شیروانی پاجامہ میں ملبوس طلبہ اور پروفیسر نظر آتے ہیں۔ یہ بات مجھے بڑی طرح کھٹکی اس لئے میں نے قیصر محمود سے جو خود یونیورسٹی کے روایتی لباس میں ملبوس تھے کہا: "کیا آپ لوگوں کے لئے یہ مناسب نہ ہوگا کہ تحریک چلانا مناسب نہ ہوگا؟"

انہوں نے میرے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے کہا: "آکسفورڈ اور کیمبرج کا بھی ایک لباس ہے۔ اسی طرح علی گڑھ کا بھی ایک لباس تھا۔ اس سلسلہ میں تین دفعہ یونین نے ریزولیشن پاس کرکے ایڈمنسٹریشن کو بھیجا ہے کہ وہ کوئی ایسا انتظام کرے کہ طلباء شیروانی میں آئیں لیکن ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہوا ہے۔" اب میں نے قیصر محمود سے پوچھا کہ: "کیا انکو ایکٹ کے خلاف تحریک کی کامیابی کی امید ہے؟" اور انہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا: "جس رفتار سے سیکولر اور جمہوری کمار ہمارے حق میں آ رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ اس ایکٹ میں ضروری ترامیم کرانے میں کامیابی ہوگی۔"

قیصر محمود کا یونیورسٹی میں یہ آخری سال ہے وہ ایم اے

مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی عظیم الشان عمارت جہاں یونین کا دفتر اور مہمان خانہ بھی ہے

(عربی) کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ان کا ارادہ مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ باہر جانے کا ہے۔ یونین کی صدارت کے عہدے پر وہ "مسلم یونیورسٹی بل" کو لے کر آئے ورنہ خود ان کے قول کے مطابق ان کا کوئی سیاسی کیریر نہیں ہے۔ ۱۲ سال کی عمر میں وہ ماں کی شفقت کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے ایک انگریزی اسکول مانٹیسری اکیڈمی (بہرائچ) میں حاصل کی۔ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے گورنمنٹ انٹر کالج بہرائچ سے ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور پوری یو۔پی میں انگریزی میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ وہ ۱۹۶۷ء میں علی گڑھ میں پہلی یونیورسٹی میں داخل ہوئے ــــــ بی۔ اے آنرز میں انہوں نے ٹاپ کیا اور اس وقت بھی یونین کی مصروفیات کے باوجود ان کا تعلیمی کیریر شاندار ہے۔ حالانکہ ان کا چہرہ داڑھی اور مونچھ کے "بوجھ" سے آزاد ہے لیکن وہ اسلامی مزاج رکھتے ہیں۔ فرقہ وارانہ تعصب ان کو چھو کر بھی نہیں گزرا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا کہنا ہے کہ "اس ایکٹ کے خلاف غیر مسلم طلبہ بھی ہمارے ساتھ ہیں اس کی وجہ خود مسلم یونیورسٹی کی رواداری ہے جہاں تمام مذاہب کا احترام کیا جاتا ہے۔ جس کی یونین کے ہال میں رام چندر جی اور کرشن جی کی بھی تصویریں ہیں۔ اور جہاں ہندو اور مسلمان طلبہ ہمیشہ سے ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں شیعہ سنی تو اختلافات بھی نہیں ہیں اور یہاں کے طلبہ میں مثالی اتحاد پایا جاتا ہے ــــــ"

یہ سب کہنے کے بعد انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ "نہ صرف بنارس ہندو یونیورسٹی میں اس فراخدلی کا فقدان ہے بلکہ ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں کسی بھی مسلم لیڈر کی کوئی تصویر آپ کو کسی بھی دیوار پر نظر نہ آئے گی۔"

اب ہمیں وائس چانسلر سے ملنے کے لئے جانا تھا۔ اس لئے میں نے قیصر محمود سے اجازت چاہی۔ وہ مجھے بصد خلوص باہر تک چھوڑنے آئے اور میں یہ سوچتا ہوا وائس چانسلر ہاؤس پہونچ گیا کہ کیا مسلم یونیورسٹی وسوسوں اور شکوک و شبہات کی موجودہ فضا سے کبھی نجات پائے گی جس نے نہ صرف ہندوستان کے ۷ کروڑ مسلمانوں کو بے چین کر رکھا ہے بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے اضطراب کا سامان کر دیا ہے۔

درست فرمالیجیے:۔ صفحہ ۱۸ کا نمبر صفحہ ۱۹ ...

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے موجودہ چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم نے اپنا یہ فوٹو خالد ہندی کو عطا کیا

علی گڈھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالعلیم علم کا بحر بیکراں ہیں ـــ ان کی علمی اور ادبی حیثیت مسلّم ہے، کم گوئی ان کی فطرت ہے، لیکن وہ بولتے ہیں تو ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ دل میں گھر کرتا چلا جاتا ہے اور سامع ان کی تقریر کے جادو کا شکار ہو جاتا ہے۔

موصوف ۲۵ راگست ۱۹۰۶ء کو غازی پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے ایس، ایل سی امتحان فرسٹ ڈویزن میں پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے بی۔ اے آنرز کا امتحان فرسٹ ڈویزن میں پاس کیا اور ۱۹ ء تک وہیں اردو اکیڈیمی کے فیلو رہے۔ اس کے بعد وہ برلن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جرمنی گئے اور وہاں اسلامی اسٹڈیز میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۳۲ اء میں جرمنی سے واپس آنے کے بعد انہوں نے بطور لکچرار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام شروع کیا اور ۱۹۳۴ء میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں آپ لکھنؤ یونیورسٹی میں چلے گئے۔ اور وہاں ۱۹۵۰ء تک عربی کے لکچرار رہے، اسی سال وہ علی گڈھ یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں ریڈر مقرر کیے گئے جہاں وہ ۱۹۵۴ء میں عربی کے پروفیسر اور مراسلات اسلامی کے ادارہ کے ڈائرکٹر بنے انھوں نے ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور چیف اکیڈیمک ایڈوائزر برائے یونیورسٹی کی حیثیت میں بھی کام کیا۔ جون ۱۹۶۸ء میں انہیں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔

پروفیسر علیم کئی کتابوں کے مصنّف ہیں ہندوستان کی تحریک آزادی سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے چونکہ ۱۹۴۱ء میں تحریک آزادی کے سلسلے میں گرفتار ہو کر ایک سال تک وہ جیل میں رہے اس لیے قوم پرور مسلمانوں میں ان کی ایک خاص حیثیت ہے اور ان کے انداز فکر میں بھی قوم پروری کا عنصر نمایاں ہے۔

میں یونیورسٹی کیمپس میں پروفیسر علیم سے ان کی کوٹھی پر ملنے کے لیے دو بار گیا، پہلی بار وہ اس قدر مصروف تھے کہ مجھکو شرف ملاقات نہ بخش سکے لیکن دوسری بار خود ان کے پی اے نے ٹیلی فون کر کے مجھے ملاقات کے لیے بلایا اور جب میں ان کے ایرکنڈیشنڈ کمرے میں ان سے ملنے کے لیے داخل ہوا تو ایسا لگا کہ کسی تپتے ہوئے صحرا سے نکل کر سرسبز و شاداب وادی میں پہنچ گیا ہوں۔

سفید کرتے اور سفید پاجامے میں ملبوس پروفیسر علیم نے مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا اور میں ان کی اس مسکراہٹ کی وسعت میں کھو گیا، پہلے تو انھوں نے معذرت کی کہ ایک ضروری میٹنگ کی وجہ سے وہ صبح مجھ کو شرف ملاقات نہ بخش سکے تھے اور پھر کہنے لگے ـــــ "کہیے میں آپ کی کیا خدمت کروں؟" ان کے اس مختصر سے سوال نے میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچادی، میرا جی چاہا کہ میں ان پر سوالات کی بوچھار کر دوں، تیکھے، کسیلے اور تلخ سوالات، لیکن میں نے ضبط سے کام لیا اور ان) سے عرض کیا ـــــ

"جناب میں تو صرف آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا تھا۔ اگر آپ سے ملے بغیر چلا جاتا تو دل میں ایک کسک سی رہ جاتی۔ اور علی گڑھ آنے کی کوئی خوشی نہ ہوتی۔"

وہ پھر مسکرا دیے ـــــ جیسے مسکرانا ان کی عادت ہو، کچھ توقف کے بعد انہوں نے میرے قیام و طعام کے متعلق پوچھا اور پھر خاموش ہو گئے۔

پھر میں نے اس سکوت کو توڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ابھی میں کچھ کہنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ خود پروفیسر علیم نے فرمایا۔ "یہاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔" "جی نہیں ـــــ" میں نے مختصر جواب دیا۔

میں چاہتا تھا کہ پروفیسر علیم سے پوچھوں کہ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے سلسلہ میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟ ان سے سوال کروں کہ کیا نیا ایکٹ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو ختم نہ کر دے گا؟ اور ان سے دریافت کروں کہ ان حالات میں مسلمانوں کو آپ کا کیا مشورہ ہے؟ لیکن علی گڑھ آنے کے بعد مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ ایکٹ پر

کنووکیشن ۱۹۶۰ء کا ایک منظر
بائیں سے دائیں
جسٹس ہدایت اللہ
نواب احمد سعید خاں چھتاری
ڈاکٹر عبدالعلیم
ڈاکٹر زبیر احمد

اظہار رائے کے سلسلے میں ہر شخص محتاط ہے بالخصوص ذمہ داران یونیورسٹی ضرورت سے زیادہ محتاط ہیں اس لیے میں نے ان تمام سوالوں کو دماغ سے نکال کر پروفیسر علیم سے پوچھا ــــ "کیا آپ اپنی زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ بتائیں گے"؟

اور پھر ان کے کتابی چہرے پر وہی مسکراہٹ بکھر گئی، انہوں نے اپنی ٹھوڑی کے برائے نام بالوں کو کھجاتے ہوئے فرمایا "میری زندگی خود ہی ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ ویسے جیل کی زندگی کافی دلچسپ تھی"۔

کمرہ میں پھر وہی سکوت چھا گیا، یہ سکوت مجھے بہت پُراسرار لگ رہا تھا، اور اس پُراسرار سکوت سے میرا دل گھبرا رہا تھا۔

پروفیسر علیم میرے سوالوں کا تحریری جواب دینا چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے مجھ سے کہا ــــ "آپ اپنا سوالنامہ مجھے دے جائیے، میں اپنا جواب آپ کو بھجوا دونگا"۔

اور میں نے ان سے رخصت ہونے کے بعد ان کے پی اے کو سوالنامہ دیدیا۔

لیکن نہ جانے کیوں وہ اب تک میرے سوالوں کا جواب نہیں دے سکے ہیں، شاید وہ بہت مصروف ہیں، یا وہ اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہتے؟

میں نہیں چاہتا کہ پروفیسر علیم پر عہد شکنی کا الزام لگاؤں، لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ایک ایسے ایکٹ پر انہوں نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی جس نے نہ صرف پوری ملت کو جھنجھوڑ کر رکھدیا ہے بلکہ پورے ملک میں ایک، سونامی سا پیدا کر دیا ہے اور جس مسئلہ پر ملک کا ہر سیاست داں اظہار رائے کر چکا ہے اور کر رہا ہے۔ اگر وہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نہ ہوتے تو مجھے ان سے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن ان کی حیثیت اس پورے تنازعہ میں فریق اول کی ہے، وہ آج کل اس علمی کنبہ کے سربراہ ہیں جو اپنوں اور پرایوں سب کی نظر میں ایک بڑا سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ اس لیے پروفیسر علیم کا خاموش رہنا اس سوال کی پیچیدگیوں میں اضافہ تو کر سکتا ہے مگر اسے حل کرنے میں معاون نہیں ہو سکتا۔

جب میں پروفیسر علیم سے اپنی مختصر ملاقات کے بعد ان کے ایرکنڈیشنڈ کمرے سے باہر نکلا اس وقت شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، تاریکی پھیل رہی تھی، اندھیرا بڑھ رہا تھا کہ کہیں اس اندھیرے میں مسلم یونیورسٹی ہمیشہ کیلئے ڈوب نہ جائے، کہیں یہ تاریکی پھیل کر رہ نمایانِ ملت کے دلوں میں نہ بس جائے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس شام کی سحر نہ آئے ــــ ان وسوسوں اور شکوک وشبہات کو لے کر میں گیسٹ ہاؤس کی طرف چل دیا۔ جہاں میرا قیام تھا ــــ اور گیسٹ ہاؤس کی یہ رات میرے لیے ہزار راتوں کے برابر بن گئی۔ ★

علی گڑھ کے چند سرپھرے

ڈاکٹر اشرف مرحوم کے ایک مضمون سے اقتباس

سرسید کے دور کی سب سے محترم یادگار راجہ مہندر پرتاپ ہیں۔ راجہ صاحب نے اس دور میں برطانیہ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ جب وطن کے روساء اور زمیندار دستوری احتجاج کے نام سے بھی لرزتے تھے۔ بالآخر راجہ صاحب نے وطن کو خیرباد کہہ کر رقیب طاقتوں کی مدد سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی جدوجہد کی اور اس سلسلہ میں کابل کی پہلی آزاد ہندوستان حکومت کی بنیاد ڈالی۔ راجہ صاحب ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی اس طویل جلاوطنی سے واپس آسکے۔

سرسید کے عہد کی دوسری نشانی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں تھے جنہیں ہماری ملکی سیاست سے بظاہر کوئی علاقہ نہ تھا مگر اپنی جوانی میں وہ بڑے سرگرم کارکن تھے۔ آفتاب احمد خاں کے وطن پرور اور حیرت انگیز افکار سے اگر آپ آشنا ہونا چاہیں تو حبیب اللہ خاں صاحب کی "حیات آفتاب" کا مطالعہ کیجئے۔

۱۹۱۱ء میں جب "وفاداران" علی گڑھ کا دور ختم ہوا تو علیگڑھ کے نوجوانوں کی ایک فوج سیاست کے میدان میں اتری۔ ان میں حسرت موہانی، کچلو اور ظفر علی خاں اپنی اپنی بے لاگ

مرحوم جگر مرادآبادی ترقی پسند شاعر سردار جعفری اور ان کی بیگم کے ساتھ

صداقت اور بے لاگ جرأت کے اعتبار سے بے مثل تھے حسرت نے تلک کا ساتھ دیا۔ مسلمان نوجوانوں میں سب سے پہلے جیل گئے۔ اور معمولی درجے کی سودیشی کپڑے کی رسل گنج (علی گڑھ) میں دکان کھولی۔ حسرت کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے مزدور تنظیم میں حصہ لیا۔ سوویٹ کے نظام کو اپنایا۔ کانگریس میں کامل آزادی کی تجویز پیش کی۔

کچلو جلیانوالا باغ اور پنجاب مارشل لا کے ہیرو کراچی کے مشہور مقدمہ کے سزا یافتہ، مسلم لیگ اور کانگریس کے خوشگوار عہد کے جنرل سکریٹری رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ انقلابی نوجوانوں کی حمایت کی۔ نوجوان بھارت سبھا، کمیونسٹ پارٹی، غدر پارٹی ہر انقلاب پرست جماعت کی مدد کی ہے۔

ظفر علی خاں در اصل شاعر اور ادیب اور پیدائشی اخبار نویس تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی تھی اور دوران جنگ عظیم، خلافت تحریک میں شریک ہوئے مگر نہ وہ خلافت تحریک میں کھپ سکے نہ کانگریس میں۔

ان بزرگوں کے بعد سب سے نمایاں گروپ مولانا محمد علیؒ کا ہے۔ جس میں آپ خلیق الزماں، شعیب قریشی، عبدالرحمٰن، سندھی، خواجہ عبدالمجید، تصدق شروانی، عبدالرحمٰن بجنوری قاضی عبدالغفار اور ڈاکٹر سید محمود کو منجملہ دوسروں کے شمار کر سکتے ہیں۔ محمد علی کے گول میز کانفرنس کی آخری تقریر ہماری سیاست کی بہترین ترجمان ہے۔ محمد علی غالب کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے

بے دستگاہ نیم کہ ہنوز از ہوائے وصل
شوریست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

گول میز کانفرنس کے بعد جو دور آیا اس کے سرخیل جناح

عصمت چغتائی

جنہوں نے جدید طرز کی مختصر اردو کہانیوں میں خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں مسلم گرلز کالج علی گڑھ سے گریجویشن کیا

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشہور شاعر
مجاز لکھنوی مرحوم

عبدالرحمٰن بجنوری
جنہوں نے ایم اے او کالج سے ڈگری حاصل کرکے ادبی کارنامے انجام دیئے
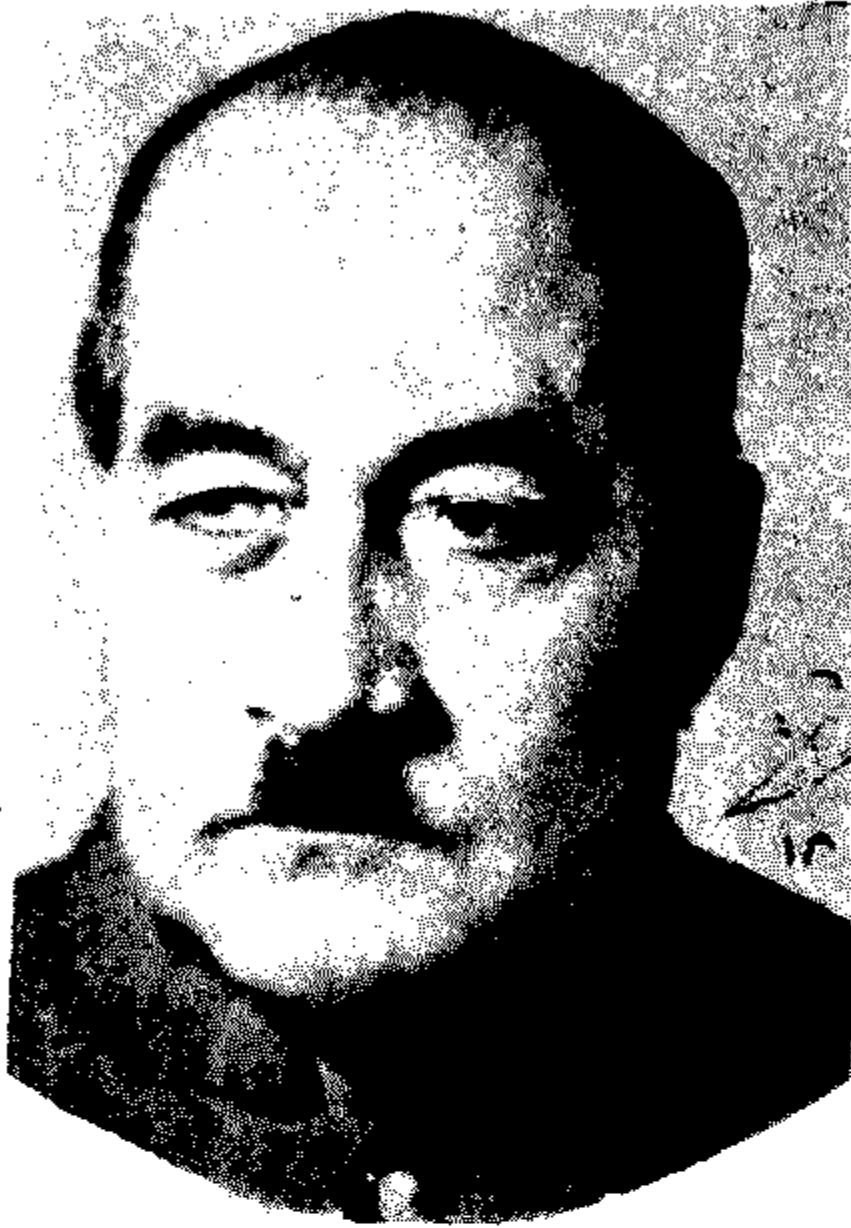
تھے اور علی گڑھ والوں کی حیثیت "نذر گزر" کی تھی۔ البتہ مسلم لیگ کے قدم بہ قدم بعض تحریکیں اٹھیں۔ ان میں خاکسار شروع میں اور حیدرآباد کے رضاکار تقسیم کے زمانہ میں نظر آتے ہیں۔۔۔ خاکساروں کے وقار کی بڑی وجہ اولڈ بوائے میاں احمد شاہ تھے اور رضاکاروں میں قاسم رضوی مشہور ہیں۔

یہ فہرست ابھی ختم نہیں ہوئی اس لئے کہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ صفوں کا شمار ابھی باقی ہے اور پھر ان میں طرح طرح کے سوشلسٹ ہیں۔ کوئی احمد عباس کی طرح ترقی پسند ہے جو ترقی کر کے فلم ڈائرکٹر بن گیا۔ کوئی انصار ہروانی کی طرح کانگریس سوشلسٹ بن گیا۔ کوئی جوش کی طرح شاعر ہے اور صرف اپنے آپ میں اسیر ہے۔ شاعروں میں آپ مجاز کو، افسانہ نگاروں میں عصمت کو، مصنفین میں رشید جہاں کو یقینی سوشلسٹوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ کمیونسٹوں میں آپ ڈاکٹر احمد کے علاوہ ثروت اطہر علی، علی سردار، سبط حسن، سید محمد ٹونکی، جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر عظیم اور علی گڑھ کی نئی نسل کو آپ شامل کر سکتے ہیں۔

شبیر حسین جوش ملیح آبادی

چودھری خلیق الزماں مرحوم عبدالرحمٰن صدیقی اور شعیب قریشی مرحوم ترکی کے رؤف بے اور قومی رہنما ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ساتھ

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری حاجی عبدالرحمٰن خاں شیروانی کے ساتھ چند لمحے

(خالد مہدی)

شیروانی صاحب اس بڑھاپے میں بھی جوانوں کا جذبہ رکھتے ہیں، اور آج بھی اُن کے دل میں مسلم یونیورسٹی کی خدمت کا وہی جذبہ ہے جو جوانی کے دنوں میں تھا لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، حالات بدل گئے ہیں اور اُن لوگوں کو جاگیردارانہ نظام کی علامتوں سے تعبیر کیا جانے لگا ہے جنھوں نے اپنا خون جگر دے کر مسلم یونیورسٹی کے پودے کو شجر سایہ دار بنایا تھا اس لئے اب انھوں نے گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا ہے۔

شیروانی صاحب سے میری ملاقات اُنکی کوٹھی پر ۱۳ جولائی ۱۹۷۲ء کو دن میں تقریباً ۲ بجے ہوئی۔ علی گڈھ جا کر اگر کوئی شیروانی صاحب سے نہ ملے تو سمجھئے کہ اُس نے علی گڈھ کو دیکھا ہی نہیں، اُن کی

مرحوم نواب
صدر یار جنگ بہادر
ڈاکٹر مولانا الحاج
محمد حبیب الرحمٰن خاں
شیروانی
جن کا
کروڑوں روپے
کی
مالیت کا
کتب خانہ
ان کے صاحبزادے
حاجی عبیدالرحمٰن
شیروانی
نے
مسلم یونیورسٹی کو منتقل کر دیا

زندگی علی گڈھ تحریک کی ایک مکمل کتاب ہے انھیں علی گڈھ کی ہر اینٹ کے ساتھ اور اس سرزمین کی خاک کے ہر ذرّہ سے ایک خاص نسبت ہے۔ جب بھی مسلم یونیورسٹی پر کوئی آفت آئی وہ سینہ سپر ہو گئے، ہر نازک مرحلہ پر انھوں نے اس دارالعلوم کی رہنمائی کی۔ وہ چار بار مسلم یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر رہے، خاص طور پر تقسیم ملک کے وقت انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے جو خدمت انجام دی اُسے فراموش نہ کیا جا سکے گا۔

چاروں طرف سے مسلم یونیورسٹی مخالفین کے نرغے میں تھی، اور شیروانی صاحب اس کی
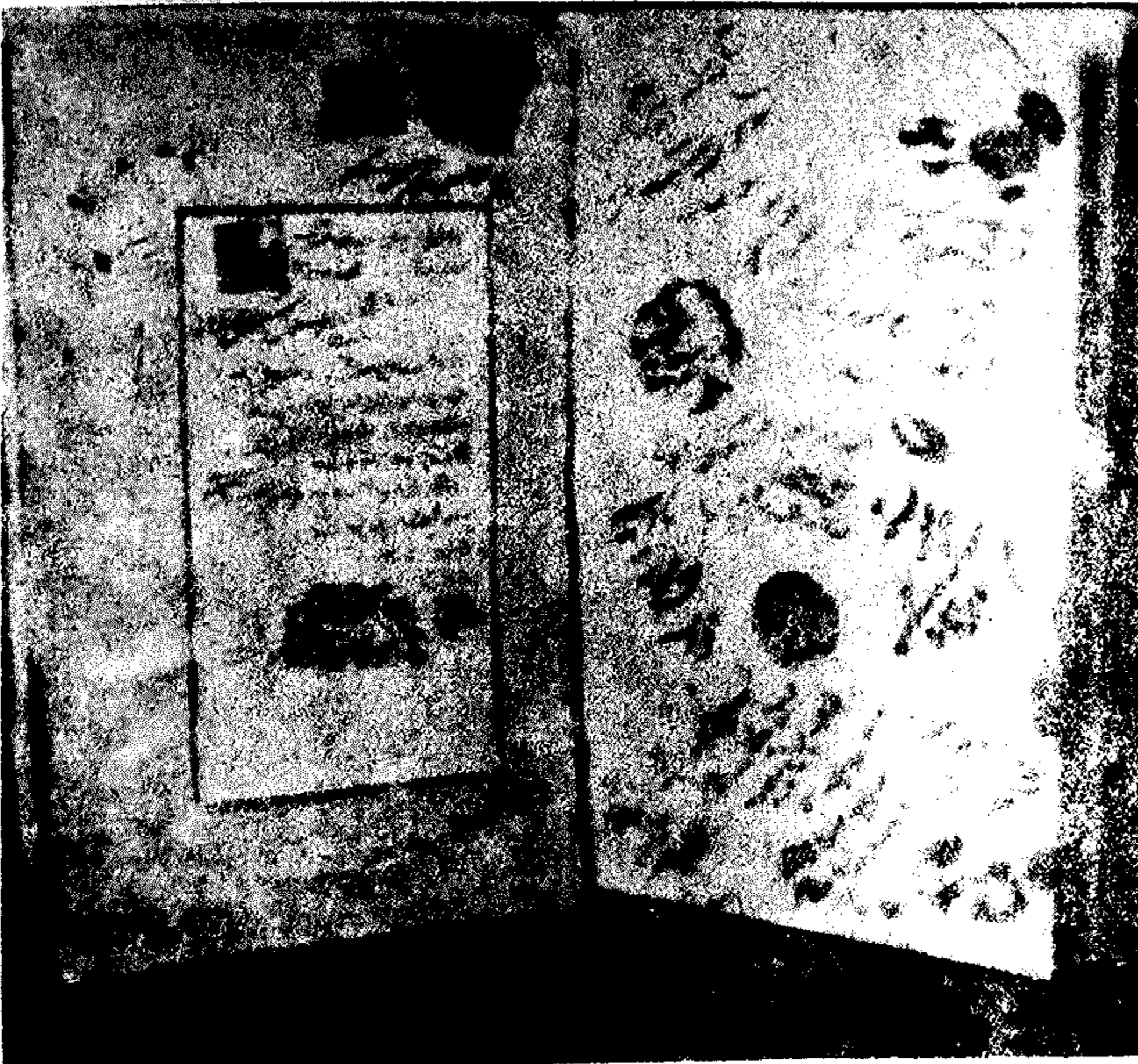
کتب خانہ حبیب گنج مولانا آزاد لائبریری میں مثنوی گوئے چوگاں طلا عارفی

حفاظت اس طرح کر رہے تھے جیسے طوفان میں پھنسا ہوا کوئی پرندہ اپنے نشیمن کی حفاظت کرے۔ خود ان کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں وہ ۲ ½ گھنٹے سے زیادہ نہ سو سکتے تھے۔ اور حکام ضلع کے ساتھ یونیورسٹی کو اشرار کے حملوں سے محفوظ رکھنے میں مصروف رہتے تھے۔

یوں تو یونیورسٹی کے لئے ان کی خدمات کی ایک طویل فہرست ہے لیکن کروڑوں روپے کی مالیت کا کتب خانہ حبیب گنج انھوں نے یونیورسٹی کو دے کر جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اُسے رہتی دنیا

تک یاد رکھا جائے گا۔

۱۹۴۷ء میں مسلم یونیورسٹی کا کیا حال تھا؟

میں نے شیروانی صاحب سے پوچھا۔ شیروانی صاحب فرمانے لگے — "رات کو اٹھ کر ایک ایک ہوسٹل میں جانا۔ طلبہ کے درمیان بیٹھ کر اُن کی تشفی کا سامان پیدا کرنا۔ ہر طرف خلفشار تھا۔ ہر طالب علم گھر جانا چاہتا تھا لیکن راستے بند تھے۔ حضور نظام حیدرآباد مرحوم اپنی ریاست کے بچوں کو بلانا چاہتے تھے اور میں روکتا تھا کہ اگر حیدرآباد کے بچے چلے گئے تو دوسرے بچے گھبرائیں گے۔ آسام اور پشاور کے بچوں کو کیسے پہنچایا جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ اعلیٰ حضرت نے میری بات رکھ لی، وقت گزر گیا اور کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔"

شیروانی صاحب نے دوران گفتگو بتایا کہ "اس نازک وقت میں رفیع احمد قدوائی مرحوم سے بڑی مدد ملی جو ان دنوں یوپی کے وزیر داخلہ تھے۔"

اس سلسلے میں وہ مسٹر گووند نرائن (موجودہ مرکزی ہوم سکریٹری) کی بھی بڑی تعریف کرتے ہیں جو اُن دنوں علی گڈھ کے کلکٹر تھے۔

مولوی حاجی محمد عبید الرحمٰن خاں صاحب شیروانی ربیع الاوّل ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۹۷ء میں بمقام

تلوار اورنگ زیب بھی کتب خانہ حبیب گنج کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کو منتقل ہو گئی

مولانا عبید الرحمٰن شیروانی اور سابق وائس چانسلر کتب خانہ کو منتقل کرنے کی رسم ادا کرتے ہوئے

مرحوم نواب زادہ لیاقت علی خاں نے بھی علی گڑھ میں پڑھا تھا

جلیب گنج ضلع علی گڑھ پیدا ہوئے۔ شروع میں عربی فارسی کی تعلیم مکان پر حاصل کی۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۷ء تک مدرستہ العلوم علی گڑھ کے اسکول میں داخل رہے اور ۱۹۱۷ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی سے میٹرک کرنے کے بعد دوبارہ مدرستہ العلوم علی گڑھ میں ایف اے میں داخل ہوئے۔ مگر ۱۹۱۸ء میں والد بزرگوار نواب صدر یار جنگ بہادر کے صدر الصدور امور مذہبی مقرر ہوکر حیدرآباد تشریف لے جانے کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور اپنی ریاست کا کام سنبھالا۔ امورِ ریاست بڑی تن دہی اور قابلیت سے انجام دیئے اور جائداد میں قابلِ لحاظ اضافہ کیا۔

سیاسی، تعلیمی اور سماجی کاموں میں بھی برابر دلچسپی لیتے رہے۔ کئی سال تک آنریری اسپیشل مجسٹریٹ رہے اور آخر میں اختیارات میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۵۲ء تک مسلسل صوبے کی آئین ساز مجلس کے ممبر رہے۔ اور سوائے ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے ہمیشہ بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ آئین ساز مجلس کی متعدد ذیلی کمیٹیوں پر کام کیا اور اپنی محنت اور حسن کارکردگی کا سکہ بٹھایا۔ ۱۹۲۳ء ہی میں مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر جلد ہی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر بھی ہوگئے۔ ۱۹۲۸ء میں حکومت وقت نے "خان بہادر" کا خطاب عطا کیا لیکن ۱۹۴۶ء میں آپ نے یہ خطاب واپس کردیا۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے ٹریژرر منتخب ہوئے اور مسلسل ۱۹۴۶ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ یہ خدمت ہمیشہ اعزازی انجام دی اور کبھی تنخواہ یا الاؤنس نہیں لیا۔ اس دوران میں کئی بار قائم مقام وائس چانسلر کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۱۹۴۷ء کے پرآشوب اور طوفانی دور میں بھی آپ ہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۲ء تک ٹریژرر کے عہدے پر فائز رہے۔ فرض شناسی جانفشانی اور یونیورسٹی کے ساتھ تعلق خاطر میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس عمر میں بھی ۱۰-۱۲ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ یونیورسٹی میں اپنی اعلیٰ پوزیشن سے کبھی اپنے کسی عزیز یا ملاقاتی کو فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ نہ کبھی کسی اخلاقی مسئلہ میں الجھے۔ مسلم یونیورسٹی سے ملحق تینوں اسکولوں کے آنریری منیجر بھی رہے۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیانی عرصہ میں کئی سال تک فنانس کمیٹی کے ممبر رہے۔ ■ ■

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے چانسلر

۱۹۲۰ء سے ۱۹۷۲ء تک

۱۔ سلطان جہاں بیگم صاحبہ بیگم بھوپال یکم دسمبر ۱۹۲۰ء سے ۱۴ مئی ۱۹۳۰ء تک دس سال چانسلر رہیں

۲۔ محمد حمید اللہ خاں نواب بھوپال ۳۰ ستمبر ۱۹۳۰ء سے ۷ اپریل ۱۹۳۵ء تک پانچ سال چانسلر رہے

۳۔ میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد ۲۶ اگست ۱۹۳۵ء سے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء تک بارہ سال چانسلر رہے

۴۔ سید رضا علی خاں نواب رامپور ۳۰ نومبر ۱۹۴۷ء سے ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء تک پانچ سال چانسلر رہے

۵۔ ایچ، ایچ ملا طاہر سیف الدین ۱۲ اپریل ۱۹۵۳ء سے ۲۸ اپریل ۱۹۶۵ء تک بارہ سال چانسلر رہے

۶۔ حافظ احمد سعید خاں نواب چھتاری ۱۹۶۵ء سے تادم تحریر یونیورسٹی کے چانسلر ہیں

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے پرو چانسلر

۱۹۲۵ء سے ۱۹۶۵ء تک

۱۔ ایس، ایم شاہ آغا خاں ۱۹۲۵ء سے ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء تک پرو چانسلر رہے

۲۔ سید ایم رضا علی خاں نواب رامپور ۱۶ اپریل ۱۹۳۶ء سے ۱۹ اپریل ۱۹۴۷ء تک پرو چانسلر رہے

۳۔ حافظ احمد سعید خاں نواب چھتاری یکم مئی ۱۹۵۰ء سے دسمبر ۱۹۶۵ء تک پرو چانسلر رہے

نوٹ۔ ۱۹۶۵ء کے بعد سے آج تک اس عہدے پر کسی کا تقرر نہیں ہوا۔

(ادارہ)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر

۱۹۲۰ء سے ۱۹۷۲ء تک

نام	از		تا	
۱۔ محمد علی محمد خاں (نواب محمود آباد)	دسمبر ۱۹۲۰ء	سے	فروری ۱۹۲۳ء تک	وائس چانسلر رہے
۲۔ محمد مزمل اللہ خاں (ایکٹنگ)	مارچ ۱۹۲۳ء	سے	۳۱ دسمبر ۱۹۲۳ء تک	" " "
۳۔ آفتاب احمد خاں	یکم جنوری ۱۹۲۴ء	سے	۳۱ دسمبر ۱۹۲۶ء تک	" " "
۴۔ ایم مزمل اللہ خاں (ایکٹنگ)	یکم جنوری ۱۹۲۷ء	سے	۸ فروری ۱۹۲۹ء تک	" " "
۵۔ راس مسعود (جنہوں نے صحیح معنی میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو چارج لیا)	۹ فروری ۱۹۲۹ء	سے	یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء تک	" " "
۶۔ شاہ محمد سلیمان	۹ فروری ۱۹۲۹ء	سے	۱۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء تک	" " "
	یکم جولائی ۱۹۳۰ء	سے	۲۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء تک	" " "
۷۔ محمد اسماعیل خاں	یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء	سے	۱۹ اپریل ۱۹۳۵ء تک	" " "
۸۔ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد	۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء	سے	۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء تک	" " "
۹۔ شاہ محمد سلیمان (اعزازی)	۳۰ اپریل ۱۹۳۸ء	سے	۲۳ اپریل ۱۹۳۹ء تک	" " "
۱۰۔ ایم عبیدالرحمان خاں (ایکٹنگ)	جون ۱۹۳۹ء	سے	جولائی ۱۹۳۹ء تک	" " "
	مارچ ۱۹۴۱ء	سے	اپریل ۱۹۴۱ء تک	" " "
۱۱۔ ضیاءالدین احمد	۲۴ اپریل ۱۹۴۱ء	سے	۲۲ اپریل ۱۹۴۷ء تک	" " "
۱۲۔ زاہد حسین	۲۳ اپریل ۱۹۴۷ء	سے	۷ اگست ۱۹۴۷ء تک	" " "
۱۳۔ ایم عبیدالرحمان خاں (ایمرجنسی تقرری)	۸ اگست ۱۹۴۷ء	سے	۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء تک	" " "
۱۴۔ محمد اسماعیل خاں	۱۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء	سے	۲۹ نومبر ۱۹۴۸ء تک	" " "
(جو ۲۰ اکتوبر ۴۷ء سے ۲۹ نومبر ۴۸ء تک اعزازی خزانچی بھی رہے)				" " "
۱۵۔ ذاکر حسین خاں	۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء	سے	۱۵ ستمبر ۱۹۵۶ء تک	" " "
(آپ اعزازی خزانچی کے عہدے پر بھی ۳۰ نومبر ۴۸ء سے ۱۲ جولائی ۴۹ء تک مامور رہے۔)				
۱۶۔ قاضی عزیزالدین بلگرامی (OFFG)	نومبر ۱۹۴۹ء			" " "
۱۷۔ کرنل بی، ایچ۔ زیدی	۷ اکتوبر ۱۹۵۶ء	سے	۶ نومبر ۱۹۶۲ء تک	" " "
۱۸۔ بدرالدین طیب جی	۷ نومبر ۱۹۶۲ء	سے	۲۸ فروری ۱۹۶۵ء تک	" " "
۱۹۔ علی یاور جنگ	یکم مارچ ۱۹۶۵ء	سے	۵ جنوری ۱۹۶۸ء تک	" " "
۲۰۔ پروفیسر عبدالعلیم	۶ جنوری ۱۹۶۸ء	سے	تادم تحریر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں	

یادوں کے جھروکوں سے

(جواہر خواجہ)

ایم اے او کالج کی زندگی
افواہوں سے ہڑتال تک

"شاید لوگ میری باتوں کو شیخ چلی کا خواب سمجھتے ہوں لیکن ہمیں یقین ہے کہ ایک دن آئے گا جب ہم ایم۔ اے او کالج کو آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی عظیم یونیورسٹیوں کی صف میں لا کھڑا کریں گے ——— یہ تھا وہ خواب جو آج سے سو سال پہلے ایک دیوانے نے دیکھا تھا۔ اور واقعی اسوقت اس خواب کی حیثیت شیخ چلی کی بڑسے زیادہ نہیں تھی۔

لیکن آج جب دنیا کے چند عظیم ترین تعلیمی مرکزوں کا نام لیا جاتا ہے تو مسلم یونیورسٹی کا نام سر فہرست ہوتا ہے۔ برطانیہ کی آکسفورڈ اور کیمبرج، امریکا کی واشنگٹن اور ہارورڈ، روس کی ماسکو انٹرنیشنل، مصر کا جامعہ ازہر، بیروت کی امریکن یونیورسٹی اور ہندوستان کی علیگڈھ مسلم یونیورسٹی دنیا کی وہ چند عظیم ترین تعلیمی مرکز ہیں جہاں علم حاصل کرنے کیلئے دنیا بھر سے علم کے پیاسے جوق در جوق چلے آتے ہیں جہاں سے علم کی کرنیں پھوٹ کر پوری دنیا کو روشن کر چکی ہیں۔ جہاں کے طالب علم اپنے نام کے ساتھ ان یونیورسٹیوں کا نام شامل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اگر آج دنیا کے ہزاروں عظیم سائنس دان، شاعر، مصنف، لیڈر اور سیاست داں اپنے نام کے آگے "آکسن" اور "ازہری" لگانے میں فخر محسوس کرتے ہیں تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے درجنوں ملکوں میں ہزاروں لیڈروں، سیاست دانوں، شاعروں اور مصنفوں کو اپنے نام کیساتھ "علیگ" لگانے کا فخر حاصل ہے۔

سرسید کا خواب حقیقت کس طرح بنا، یہ جاننے کیلئے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کیسا ماحول تھا، وہ کیا خوبیاں تھیں جنہوں نے ایم۔ اے۔ او کالج کو بین الاقوامی شہرت یافتہ مسلم یونیورسٹی بنا دیا۔ آیئے ہم آج سے سو سال پہلے کے مسلم اورینٹل کالج میں واپس چلیں اور وہاں کی دلچسپ اور سبق آموز زندگی کا مطالعہ کریں۔

"آکسفورڈ اور کیمبرج کے چرچوں کی طرح ہر کالج

کی اپنی ایک مسجد ہوگی، بورڈنگ ہاؤس ہوں گے جس میں ہر طالب علم کو ایک سونے کا کمرہ، ایک پڑھنے کا کمرہ، غسل خانہ وغیرہ دیا جائے گا۔ ہر طالب علم کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پانچوں وقت کی نماز با جماعت ادا کرے۔ غیر مسلم طلباء پر یہ پابندی عائد نہیں ہوگی۔ مسلم طلباء کا لباس سفید پائجامہ، کالی شیروانی اور لال فیض کیپ ہوگی۔ ہر طالب علم کو مغربی انداز کے جوتے اور موزے پہننے ہونگے، کالج میں دھوتی پہننے کی اجازت نہیں ہوگی۔ لفظ "جھوٹ" کا استعمال بھی گالی کے برابر سمجھا جائیگا اور اس کے استعمال کرنیوالے کو سزا دیجائیگی۔ کوئی بڑی سزا یا ایسی سزا جس سے طالب علم کی خودی پر آنچ آئے نہ دی جائیگی۔ غلطی کرنیوالے طلباء کو بنچ پر کھڑے ہونے یا گھر سے زیادہ کام کر کے لانے کی سزا دی جائیگی۔ چھوٹے لڑکوں کو بنچ پر کھڑا کر کے کاغذ کی ٹوپی پہنا دی جائیگی جس پر الّو بنا ہوا ہوگا۔ شیعہ اور سنّی لڑکوں کو ہاسٹل یا کالج میں اپنے مذہبی اختلافات پر بحث کرنیکی قطعی اجازت نہیں ہوگی!

جب کالج شروع ہوا تب اس میں صرف ایک ہی بورڈنگ تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے گریجویٹ ایچ، آئی، سڈن کو ہیڈ ماسٹر بنایا گیا اور جناب بیج ناتھ پرساد کو سیکنڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔

بورڈنگ طلباء کی معاشی حالت کے مطابق تین حصوں میں بٹا ہوا تھا، اول درجے کی کل فیس بارہ روپے ماہوار تھی۔ دوسرے درجے کی سات روپے اور تیسرے درجے کی صرف ۳ روپے ۸ آنے ماہوار تھی۔

کالج کی انتظامی کمیٹی میں ۲۲ ممبر تھے جن میں سے ۶ ہندو تھے۔ فرسٹ ایر کی کلاسیں ۱۸۷۷ء میں شروع کی گئیں ـــــ کالج کے پہلے گریجویٹ تحصیل کیر کے فری ایشوری پرساد تھے اور کالج کے پہلے ایم اے شری امبا پرساد

تھے۔ کالج شروع میں صرف یہ مضامین پڑھاتا تھا۔
(۱) انگلش، عربی، فارسی، اور سنسکرت۔
(۲) منطق، فن خطابت، فلاسفی اور ہسٹری۔
(۳) قدرتی فلاسفی، حساب اور قدرتی سائنس۔
(۴) اسلامی قانون اور شیعہ سنی اسلامی تعلیمات۔

کالج کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک تھا۔ شروع میں طلبار کو امتحان دینے آگرہ جانا پڑتا تھا جو کلکتہ یونیورسٹی کا قریب ترین مرکز تھا۔ لیکن آگرے کے مقامی طلبار کے بُرے برتاؤ کی وجہ سے سرسید نے بی۔ اے کے طلبار کو کلکتے اور انٹرنس کے طلبار کو الٰہ آباد بھیجنا شروع کر دیا۔

دن میں تین مرتبہ حاضری لی جاتی تھی۔ صبح ۶ بجے کمروں میں، شام کو ۶ بجے مسجد میں اور گرمیوں میں رات کو ۸ بجے، سردیوں میں رات کو ۱ بجے کمروں میں۔ کالج کے اوقات میں طلبار کو اپنے کمروں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

۱۸۸۰ء میں فرسٹ کلاس بورڈنگ کی فیس بڑھا کر ۱۳ روپے کر دی گئی۔ میس (Mess) میں صبح ناشتے میں چائے اور بسکٹ، دوپہر کے کھانے میں تین چھٹانک گوشت اور روٹی۔ شام کو چائے اور بسکٹ، رات کو گوشت اور روٹی اور اس کے علاوہ ہفتے میں تین بار پلاؤ دیا جاتا تھا دوسرے درجے کے طلبار کو پلاؤ ہفتے میں صرف دو بار اور گوشت صرف دو چھٹانک دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں ہر مہینے مٹی کے تیل کی آدھی بوتل بھی دیجاتی تھی۔ اسکے لیے انہیں آٹھ روپے دینے پڑتے تھے۔ تیسرے درجے کے ہوسٹل میں صرف دال اور سبزی دیجاتی تھی۔ اور انہیں صرف ۵ روپے ادا کرنے پڑتے تھے۔

مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں محمد فدا حسین (مشہور آرٹسٹ) کی بنائی ہوئی چند تصویریں

(مرتبہ افرخ جلالی)

نسب نامہ سرسید احمد خاں مرحوم

سید دوست محمد

|

سید برہان

|

سید محمد عماد

جواد الدولہ میر محمد جواد علی خاں ہادی
وفات ۱۸ شعبان ۱۲۴۵ھ

سید محمد قباد علی خاں مہدی
حیدرآباد چلے گئے تھے

میر متقی (وفات ۱۸۳۸ء)

سید محمد
|
سید محمد احمد

جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ
پیدائش ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء
وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء

بیگم صفیہ

سید محمود
پیدائش ۲۷ مئی ۱۸۵۰ء
وفات ۱۹۰۴ء

امۃ العزیز

سید حامد

احمدی بیگم

محمدی — بیگما — جیا

انکی شادی مرزا محمد سعید سے ہوئی

|

عطیہ

ان کی شادی ممتاز کھلاڑی اور سفیر ایم، این مسعود سے ہوئی

سید راس مسعود

سید انور مسعود — سید اکبر مسعود — نادرہ بیگم زوجہ احسان رشید

شہزاد مسعود — شیرناز مسعود (سید انور مسعود)

سید احمد مسعود — سید محمود مسعود (سید اکبر مسعود)

کالج اور افواہیں:۔ کالج اور سرسید کے مخالفین ذرا دیر بھی تو خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ ۱۸۷۹ء میں یہ افواہ اڑائی گئی کہ سرسید نے کالج اپنے رشتہ داروں کو نوکری دلانے کیلئے کھولا ہے اور وہ خود یہاں سے بہت زبردست تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں یہ افواہ اڑائی گئی کہ سرسید نے نماز کے لیے اذان دینا بند کرادی ہے۔ اور نماز کے وقت کی اطلاع گھنٹہ بجا کر دی جاتی ہے۔ ۱۸۸۱ء میں طلبار کے والدین کو سیکڑوں خطوط بھیجے گئے جن میں لکھا گیا کہ زلزلوں کی وجہ سے کالج کی عمارت گر گئی ہے اور طلبار کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۸۱ء میں یہ افواہ پھیلائی گئی کہ کالج فنڈ کمیٹی نے فتویٰ دیا ہے کہ طلبار کو نماز پڑھتے وقت ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت ہے اور نماز پانچ وقت کی بجائے اب صرف دو وقت پڑھنی ضروری ہوگی۔ اسکے علاوہ یہ بھی افواہ اڑائی گئی کہ نماز میں رکوع اور سجدے کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور طلبار کو بغیر اس کے ہی نماز پڑھنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ کٹر مذہبی لوگوں کی اس مخالفت کی وجہ سے کئی سال تک کالج کے طلبار کی تعداد میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔

کالج کی پہلی ہڑتال:۔ کالج میں طلبار کی پہلی ہڑتال فروری ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ کچھ طلبار اور ڈائننگ ہال کے بیروں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ سرسید نے تحقیقات کے بعد کچھ طلبا کو کالج سے نکال دیا۔ طلبار نے سرسید سے یہ آرڈر واپس لینے کی درخواست کی جسے انہوں نے نامنظور کر دیا۔ اسپر طلبار نے ہاسٹل خالی کر دیا اور رسل گنج میں کمرے کرائے پر لیکر رہنے لگے۔ جناب ولایت حسین اور پروفیسر ریلے نے بات چیت کرانے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ اگلے دن پرنسپل بیک طلبار سے ملے اور انہیں پولیس ایکشن کی دھمکی دیکر ہاسٹل واپس لے آئے۔ مولوی سمیع اللہ کو تار دیکر مراد آباد سے بلایا گیا۔ طلبار نے سرسید اور دوسرے استادوں سے معافی مانگی اور معاملہ رفع دفع ہوا۔

ہر بدھ کی صبح کو کالج میں مباحثے ہوتے تھے۔ یہ مباحثے مہینے میں تین بار انگریزی میں اور ایک بار اردو میں رکھے جاتے تھے۔ پہلے مباحثے کا ٹاپک تھا۔ "تعلیم نسواں کی ضرورت ہے، لیکن گھر میں رہ کر نہ کہ کالج یا اسکول میں جاکر۔"

کالج میں کرکٹ ٹینس اور فٹ بال بہت زور شور سے ہوتا تھا۔ کالج کی پہلی کرکٹ ٹیم کے کپتان پروفیسر راما شنکر مشرا تھے۔ ہر جمعہ کو میچ رکھے جاتے تھے۔ ہر آدمی سے پانچ پیسے لیے جاتے تھے۔ اور سب کو کھانے کے لیے تلے ہوئے خشک میوے اور بسکٹ دئے جاتے تھے۔

ٹینس کی شروعات ۱۹۰۷ء میں ڈاکٹر ضیاء الدین نے کی تھی۔ ٹینس کلب کا نام چارپائی کلب تھا کیونکہ یہاں ٹینس کے جال کی جگہ پر چارپائیوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔

کالج کی زندگی کا ہنگامہ خیز دور:۔ ۱۹۲۰ء میں خلافت تحریک اور تحریک عدم تعاون کا دور کالج کی زندگی کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور تھا۔ ابتک کالج کے طلبار انگریزوں کی اندھی تقلید کرتے تھے اور یونین جیک کے پورے پورے وفادار ہوتے تھے لیکن اب اس اندھی وفاداری کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ۱۱ اکتوبر کو گاندھی جی اور علی برادران (مولانا محمد علی شوکت علی) علیگڈھ آئے۔ ۱۲ اکتوبر کو گاندھی جی نے ۴ گھنٹے تک مسلم اسٹوڈنٹ کلب میں تقریر کی۔ انہوں نے طلبا سے کالج کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی۔ ۱۳ اکتوبر کو زیادہ تر طلبار نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا اور یونین کلب میں

جمع ہو گئے۔ اس کے بعد مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی آتش بار تقریروں نے طلباء میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی ایک آگ بھڑکا دی۔ ۲۳ر اکتوبر کو مولانا آزاد، علی برادران، حکیم اجمل خاں، عبدالمجید خواجہ اور دوسرے لیڈروں کی ایک میٹنگ کالج کی مسجد میں ہوئی جہاں فیصلہ کیا گیا کہ ۲۹ر اکتوبر سے ایک قومی کالج جو برطانوی اثر سے آزاد ہوگا شروع کیا جائے گا۔

۲۹ر اکتوبر کو کالج کی مسجد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ

کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۱۱۰ طلباء نے نئے کالج میں شامل ہونا منظور کیا۔ بدر بلڈنگ میں کچھ خیمے لگا کر کالج کی شروعات کی گئی۔

کالج مکمل تباہی سے اسلیے بچ گیا کہ زیادہ تر طلباء کو امتحان دینے تھے اس لیے ان کے واسطے نئے کالج میں شامل ہونا ممکن نہ تھا۔

۹ر ستمبر ۱۹۲۰ء کو یونیورسٹی بل پاس کیا گیا اور اسطرح اینگلو اورینٹل کالج مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ راجہ سر محمد علی محمد خاں آف محمود آباد کو پہلا وائس چانسلر منتخب کیا گیا۔

اور اسطرح ایک شیخ چلی کا خواب جیتی جاگتی حقیقت بن گیا۔

★★

سید کی لوحِ تربت

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر

اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اُجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ

فکر رہتی ہے مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سُن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا

عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و رجا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

اقبال

(ماخوذ)
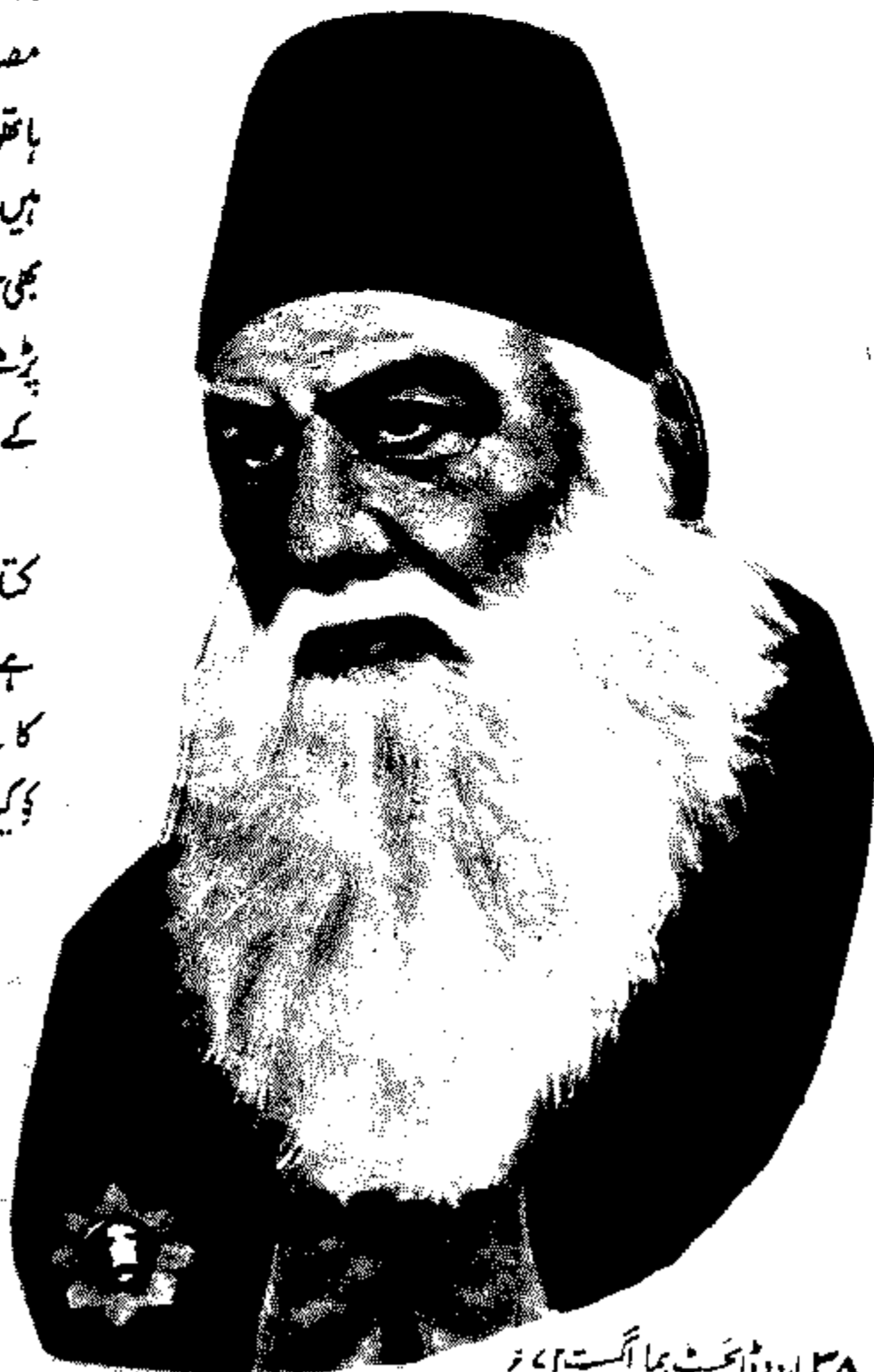
بورڈرس سے خطاب عزیز طالب علمو! مجھ کو اور تم کو اور تمہارے استادوں، تمہارے ماں باپ، تمہاری قوم کو اس بات سے نہایت خوشی ہوگی کہ تم دور دراز فاصلہ اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیل علوم کے لئے جمع ہو مختلف علوم کو پڑھتے ہو اور مختلف مصنفوں کے عمدہ خیالات، عمدہ مسائل علمی، عمدہ معقولات اخلاق سے لطف اٹھاتے ہو۔ تمہارے استاد تمہارے ساتھ پدرانہ محبت اور شفقت رکھتے ہیں اور ہر طرح تمہاری بہتری و ترقی کے خواہاں ہیں۔ وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے جو بڑے بڑے عالموں اور مصنفوں نے تصنیف کی ہیں سبق دیتے ہیں مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے۔ اس کے حروف بہت پُرکار اور مجسم ہیں مگر ان کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے۔ اس کے معانی بھی بہت آشکارا ہیں مگر ان کا سمجھنا کچھ آسان نہیں۔ اس کے پڑھنے کے لئے اس کے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔

اس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے۔ خود تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ پس تم کو سمجھنا ہے کہ اس کتاب کو کیونکر پڑھو اور اس کے معنی کیونکر سمجھو۔

اے عزیزو! اس کتاب کا نام ہے "کالج لائف" یانی
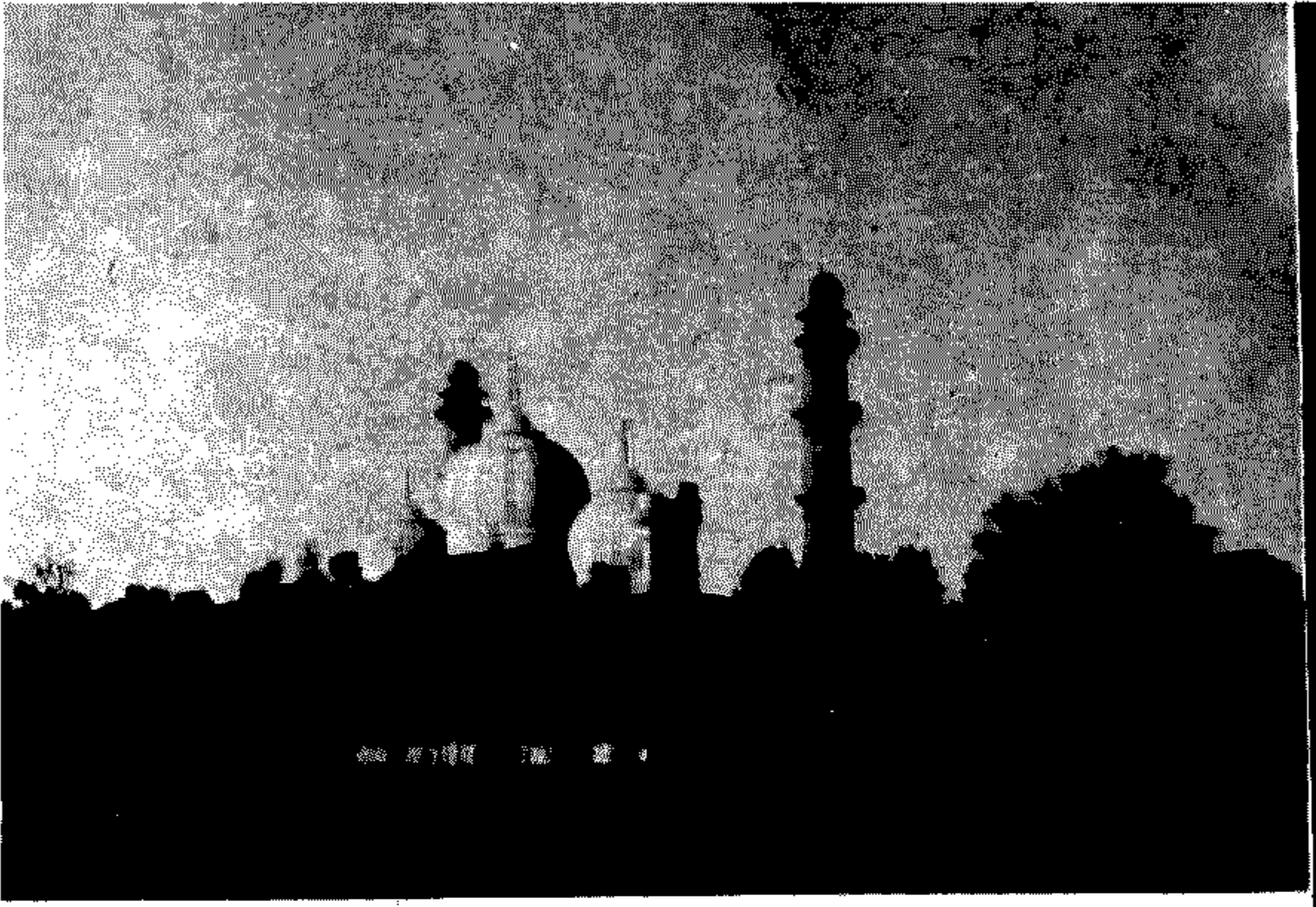
مسلم یونیورسٹی کی مسجد کا ایک ایمان افروز منظر۔ یہ تصویر مسجد کی پشت سے لی گئی ہے جس سے ملحقہ کرکٹ گراؤنڈ ہے

زندگی"! یہی اصلی کتاب ہے اور اسی کا پڑھنا اور اسی کا سمجھنا اصلی فائدہ اور اصلی مقصد زندگی کا اور اس کالج کا ہے اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح رکھا اور داغدار نہ کیا تو تمہاری آئندہ زندگی وہ ہوگی جس کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہئے۔ ورنہ اسکی زندگی اور موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔ اب مجھ کو یہ بتانا ہے کہ تم کو کالج لائف سے کیونکر فائدہ اٹھانا اور اس کو کیونکر گزارنا چاہیے!

سب سے اوّل اور تمام برکتوں کی جڑ تمہارا آپس میں سلوک اور محبت سے رہنا ہے۔ تمام طالب علم ہندوستان کے ہوں یا پنجاب کے یا پورب کے ہوں یا پچھم کے اتر کے ہوں یا دکھن کے جب وہ سب تمہاری عاقل ماں (کالج) کی گود میں پڑے ہیں تو وہ سب تمہارے بھائی ہیں۔ اگر تم نے ان کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبت ایک دوسرے کے ساتھ نہ برتی تو تم نے اس پہلے اصول کو کہ تم سب ایک عاقل ماں کے بچے ہو توڑ دیا۔

بورڈنگ ہاؤس ایک کل ہے قوم کو قوم بنانے کی۔ اگر اس کے پرزے درستی سے چلتے ہیں تو وہ اپنا کام کرے گی ورنہ کسی کام کی نہیں۔ تم اس کل کے پرزے ہو اور اس لئے اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے تمہارا درست اور کام کے قابل رہنا سب سے مقدم ہے۔

تمہارا کھانا، پینا، رہنا، سہنا آپس میں ہر وقت ملنا سوسائٹی میں شریک رہنا، کھیلوں کو آپس میں مل کر کھیلنا، تعریری جلسوں میں شریک رہنا یہ سب باتیں اس لئے ہیں کہ آپس میں محبت اور دوستی، ایک دوسرے کی ہمدردی ہو جو بنیاد قوم کے قوم بننے کی ہے پھر اگر تم نے اس میں قصور کیا تو تمام قوم کا مظلمہ تمہارے سر ہو گا اور تم پر افسوس ہوگا کہ جس عمارت کی تم خود ایک اینٹ ہو، اسی عمارت کو تم برباد کرنا چاہتے ہو۔ (مقالات سرسیدؒ ص ۷۸-۷۵)

میں نے یہ درس گاہ کیوں قائم کی ؟

"میرے دوستو! آپ نے اپنے ایڈریس میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا ذکر کیا ہے۔ مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قائم کرنے کا ہوا یہ تھا جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں آپ بھی واقف ہیں کہ مسلمان روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے تھے ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہیا کی گئی تھی اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جائے۔ اس کی مثال اس طرح پر دی جا سکتی ہے۔ فرض کرو کہ دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک بالکل طاقت ور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی زوال پر ہے پس اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کو مدد دیں۔ یہی خیال تھا جس نے مجھ کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق جو اس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کی نسبت بطور بورڈر کے یکساں طور پر سلوک کیا جاتا ہے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں" تقریر بمقام لاہور، ۳ فروری ۱۸۸۴ء

(لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۹۸)

تقریر امرتسر "مدرستہ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ مدرستہ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لئے اور جو افسوسناک محرومی ان کو یورپین سائنس (SCIENCE) اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی اس کو رفع کرنے کو قائم کیا گیا مگر اس میں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے دونوں کو دی جاتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹیو ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پاویں ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پاویں ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لئے موجود نہ کئے جاویں ہماری عزت نہیں ہو سکتی۔ مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں میرا یہی مطلب تھا مگر میرا کیا مقدور تھا کہ میں اس کو انجام دے سکتا میں ان لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس میں مدد کی۔ اس مد میں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں ہوں جس قدر ہندوؤں کا ہوں جنہوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی۔ مدرسہ کی عمارت کی دیواروں اور محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں جس سے ہمیشہ کو یہ یادگار قائم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے درماندہ مسلمان بھائیوں کی کس فیاضی سے مدد کی تھی"

تقریر امرتسر ۲۶ جنوری ۱۸۸۹ء (لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۶۷)

علی گڑھ کی اقامتی زندگی کے متعلق میرا خواب

ہم سے لوگ باصرار پوچھتے ہیں کہ مدرستہ العلوم مجوزہ میں جو لڑکے رہیں گے وہ کیونکر تربیت پائیں گے۔ ہم اس مدرستہ العلوم کو ایک طرز یونیورسٹی یعنی دار العلوم مسلمانی بنانا اور بالکل آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹی کی (جس کو ہم دیکھ آئے ہیں) نقل اتارنا چاہتے ہیں۔ جو لڑکے ان مکانات (ہوسٹلوں) میں سکونت اختیار کریں

گے ان پر اسی طرح جس طرح کہ کیمبرج اور آکسفورڈ کے کالجوں پر گرجا میں جانا اور نماز میں شریک ہونا ضروری ہے اپنی اپنی مسجدوں میں جانا اور نماز میں شریک ہونا فرض ہوگا یعنی لڑکوں کو پانچ وقت کی نمازوں میں حاضر ہونا اور نماز جماعت سے پڑھنا واجب ہوگا اور شیعہ لڑکوں کو صرف تین وقت اس لئے کہ وہ ظہر و عصر، مغرب و عشا ساتھ پڑھ لیں گے۔

جس قدر طالب علم آکسفورڈ، کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں ان کو ایک قسم کا کوٹ اور ایک قسم کی ٹوپی ملتی ہے تاکہ ایک قسم کا لباس سب کا ہو جائے۔ اس سے نہایت عمدہ فائدے ہیں جن کا بیان اس مقام پر ضروری نہیں۔ مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو بجائے کوٹ کالے الپکہ کا نیمہ آستین چغہ لال ترکی ٹوپی دی جائے گی۔ تمام طالب علم جب مدرسے میں یا کتب خانے میں یا عجائب خانے میں یا اخباروں کے کمرے میں آئیں گے تو بغیر اس چغہ اور ٹوپی کے آنے کے مجاز نہ ہوں گے۔

لڑکوں کے پڑھنے اور کھیلنے اور کھانے اور سونے اور نہانے اور کپڑا بدلنے کے سب وقت معین ہوں گے اور ہر ایک لڑکے کو اس وقت وہی کام کرنا ہوگا جو اس وقت کے لئے مقرر ہے۔ یہاں تک کہ جو وقت سونے کا ہے اگر طالب علم چاہے کہ میں اس وقت پڑھوں اور تھوڑی دیر کے بعد سوؤں تو وہ ایسا نہیں کر سکے گا بلکہ اس کو ضرور ہوگا کہ سونے کے وقت پر سو رہے۔ اگرچہ بالفرض نیند نہ آئے تو پلنگ پر آنکھیں بند کئے پڑا رہے۔

کھیلنے کے لئے متعدد قسم کے کھیل کے سامان موجود ہونگے اور جو کھیل جس کو پسند ہوگا وہ اختیار کرے گا۔ گھوڑے پر چڑھنا بندوق چلانا، تیرنا یہ سب کام بھی مناسب طور پر اور اندازہ پر سکھایا جائے گا۔

الفاظ بد جو لڑکوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں ان کو بولنے کا سخت امتناع ہوگا یہاں تک کہ اگر کوئی لڑکا کسی کو جھوٹا کہہ بیٹھے گا تو وہ بہ منزلہ دشنام سخت کے سمجھا جائے گا۔

تمام طالب علم ایک کمرہ میں ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ تمام چیزیں کھانے کی وقتاً فوقتاً پکائی جائیں گی اور ہر موسم کا میوہ بھی لڑکوں کو مناسب طور سے دیا جائے گا اور ہر ہفتہ میں ایک خاص کھانا خود لڑکوں کی فرمائش سے پکایا جائے گا جس کو وہ خود اپنی کثرت رائے سے قرار دیں گے بشرطیکہ بہ لحاظ موسم کے وہ صحت کو مضر نہ ہو۔

لڑکوں کو صفائی سے رہنے کی نہایت تاکید ہوگی۔ کسی لڑکے کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ گوٹے اور کناری لگا ہوا یا بازار کا رنگا ہوا رنگین ڈیم رنگ یا ایسا باریک جس میں سے بدن دکھائی دے یا ایسا رنگ جس سے چوچی اور پیٹ نظر آئے کپڑا پہنے۔

کسی لڑکے کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ بہت بڑے بڑے بال جو کان کی لو سے زیادہ نیچے ہوں سر پر رکھے یا کاکلیں بنائے یا پٹیاں جمائے یا مسی لگائے یا انگوٹھی و چھلے پہنے یا کسی انگلی پر مہندی لگائے۔

لڑکے جو تقصیر کریں گے ان کو کسی قسم کی سزائے بدنی یا ایسی سزا جس سے رفتہ رفتہ غیرت جاتی رہے نہیں دی جائے گی۔

جھوٹ بولنا گو وہ کیسی ہی خفیف بات میں کیوں نہ ہو ایک بہت بڑا جرم سوسائٹی کا سمجھا جائے گا۔ اسی طرح کسی کو جھوٹا کہہ بیٹھنا جرم سوسائٹی متصور ہوگا گو کہ اس شخص نے جھوٹ ہی کیوں نہ بولا ہو۔

خود لڑکے بھی باہم مل کر ایک کلب جس کا نام انشاء اللہ تعالیٰ مثل کیمبرج کی کلب کے یونین کلب کہلائے گا علمی باتوں اور دنیاوی علوم میں مباحثہ ہوا کرے گا اور قواعد اس کے بعینہٖ وہی ہونگے جو کیمبرج یونین کلب میں ہیں۔

مدرسہ کی بنیاد جس دن رکھی جائے گی وہ دن ہمیشہ مدرسہ کی سالگرہ کا ہوگا۔ اس دن ہمیشہ مدرسہ کی یادگاری کے لئے مجلس اور خوشیاں کی جایا کریں گی۔

یہ سب باتیں ابھی تو مثل ایک خواب کے ہیں یا تو خدانخواستہ وہی مثل ہوگی کہ جاگتے میں آنکھ کھل گئی یا انشاء اللہ تعالیٰ بعینہٖ اس کا ظہور ہوا اور ٹھیک تعبیر ہوئی۔ ہم کو خدا سے امید ہے کہ ٹھیک تعبیر ہی ہوگی۔ (تہذیب الاخلاق بابت یکم رجب ۱۲۸۹ھ)

میرے خواب کی تعبیر "آؤ ہمارے ساتھ علی گڑھ چلو اور ہمارے کالج کے ان پیارے عزیز بچوں کو دیکھو جو بطور بورڈر کے وہاں رہتے ہیں جن کی صورت دیکھ ہمارے دل میں پیار آتا ہے جن کے خیال سے ہماری روح خوش ہوتی ہے۔ ان کو جو محبت ہمارے ساتھ ہے اس کا تماشہ دیکھو۔ باپ سے زیادہ ہم سے محبت رکھتے ہیں۔ ہماری خفگی سے کوئی چیز ان کو زیادہ رنج دینے والی نہیں ہوتی۔ ہماری جھڑکی، ہمارا طمانچہ، ہمارے ہاتھ کی سختی سے ان کو عبرت اور نصیحت ہوتی ہے مگر وہ اس کو ایسی ہی عزت سے قبول کرتے ہیں جیسے بیٹا اپنے باپ کی تادیب و تنبیہ کو۔ چلو ہمارے عزیز مگر ہمارے باعث افتخار مولوی سمیع اللہ خاں کا حال دیکھو کہ بورڈروں کے پیچھے کس طرح اپنی جان لگائے ہوئے ہے کسی بورڈر کی بیماری میں ان کی بے قراری کو دیکھو اور اندازہ کرو کہ آیا باپ کو اس سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ خود اپنی آنکھ سے چل کر دیکھو کہ جو محبت اور مربیّی مولوی سمیع اللہ خاں بورڈروں کی کرتے ہیں۔ آیا کوئی باپ اپنے بیٹے کی بھی کرتا ہے۔ یادش بخیر، مولوی مشتاق حسین کا جو حال بورڈروں سے تھا وہ تو عجائبات دنیا سے کچھ کم نہ تھا۔ گو کچھ دنیاوی ترقی اور دنیاوی عزت بہت کچھ ہے، خدا اور زیادہ کرے مگر میری آنکھ میں جو عزت دین و دنیا میں ان کو بورڈروں کی خدمت سے نصیب تھی۔ اس کے مقابلہ میں حیدرآباد کی عزت کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ چلو اور مولوی محمد کریم صاحب اور مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب اور مولوی محمد اکبر صاحب کا حال دیکھو کہ بورڈروں کے ساتھ کس طرح پیش آتے ہیں۔ ایسا بورڈنگ

مسلم یونیورسٹی کی پہلی عمارت "اسٹریچی ہال" کے سامنے کا منظر
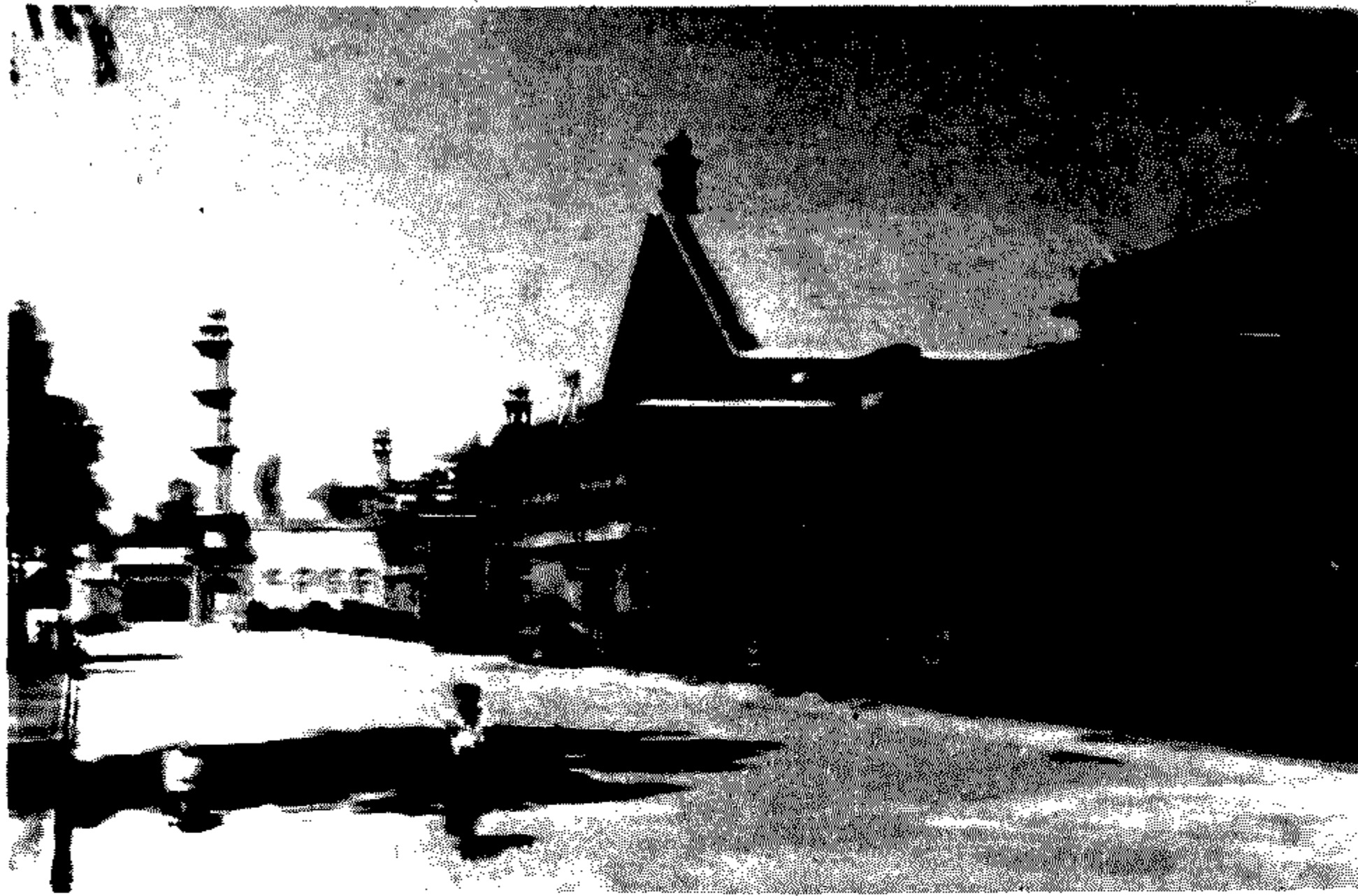
اسٹریچی ہال کا ایک اور دلکش منظر جس کے پس منظر میں یونیورسٹی کی مسجد کے گنبد اور مینارے نظر آ رہے ہیں

ہاؤس البتہ ہماری قوم کے بچوں کو تربیت دینے کے قابل ہوسکتا ہے مگر افسوس اے ہماری قوم کے بزرگو کہ تم کو ان کی قدر نہیں۔ خدا تم کو ایسا دل دے کہ اس کی قدر کرو اور ایسی بصیرت دے کہ تم اس کو پہچانو۔" لیکچر بمقام پٹنہ ۲۷ر جنوری ۱۸۸۳ء
(لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۴۲، ۱۴۱)

سرپرستوں سے میری گذارش "اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیز اور پیارے بچوں کو غارت نہ کرو۔ ان کی پرورش کرو۔ ان کی آئندہ کی زندگی اچھی طرح بسر ہونے کا سامان کرو مجھ کو تم کچھ ہی کہو۔ میری بات سنو یا نہ سنو، مگر یاد رکھو کہ اگر تم ایک قومی تعلیم کے طور پر ان کو تعلیم نہ دوگے تو وہ آوارہ اور خراب ہوں گے تم ان کی ابتر حالت کو دیکھوگے اور بے چین ہوگے۔ روؤ گے اور کچھ نہ کرسکوگے۔ تم اگر مر جاؤگے تو اپنی اولاد کی خراب زندگی دیکھ کر تمہاری روحیں قبروں میں تڑپیں گی اور تم سے کچھ نہ ہوسکے گا۔ ابھی وقت ہے اور تم سب کچھ کرسکتے ہو مگر یاد رکھو کہ میں یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اگر اور چند روز تم اسی طرح غافل رہے تو ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ تم چاہوگے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دو، ان کی تربیت کرو مگر تم سے کچھ نہ ہوسکے گا۔ مجھ کو کچھ کہو، کافر، ملحد نیچری۔ میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لئے کہتا ہوں۔ تم انہیں پر رحم کرو اور ایسا کچھ کرو کہ آئندہ کو پچھتانا نہ پڑے۔"
لیکچر بمقام لدھیانہ ۲۳ر جنوری ۱۸۸۴ء (لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۵۹)

ہندوستانی ایک قوم ہیں ۔ پرانی تاریخوں میں اور پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو ان میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آکر بس جاتے ہیں۔ مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ گو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندوؤ اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو۔ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے۔ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو، تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔

لیکچر بمقام گورداسپور ۲۷ر جنوری ۱۸۸۴ء

(لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۷۶)

ہندوستان کی رہنے والی ایک قوم ۔ لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے ہیں لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں۔ ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ ہندو یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔

"جس زمانہ میں میں قانونی کونسل کا ممبر تھا تو مجھ کو خاص اسی قوم کی بہبودی کی دل سے فکر تھی۔"

تقریر بمقام لاہور ۳ر فروری ۱۸۸۴ء

(لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۹۹)

سیکولرازم کے بغیر ملک کی ترقی ممکن نہیں ۔ جو لوگ کہ ملک کی بھلائی چاہتے ہیں ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم و مذہب کے کل باشندگان ملک کی بھلائی پر کوشش کریں کیونکہ جس طرح ایک انسان کی اس کے تمام قویٰ اور تمام اعضا کے صحیح و سالم رہے بغیر زندگی یا پوری تندرستی محال ہے اسی طرح ملک کے تمام باشندوں کی خوشحالی اور بہبودی بغیر ملک کی زندگی یا پوری ترقی ناممکن ہے۔

اے میرے دوستو! اعتبار سے ملک ہندوستان میں دو مشہور قومیں آباد ہیں جو ہندو اور مسلمان کے نام سے مشہور ہیں جس طرح کہ انسان میں بعض اعضائے رئیسہ ہیں اسی طرح ہندوستان کے لئے وہی دونوں قومیں بمنزلہ اعضائے رئیسہ کے ہیں۔ ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ کیا خوب کہا ہے جس نے کہا ہے کہ انسان کے دو حصہ ہیں اس کے دل کا خیال یا عقیدہ خدا کا حصہ ہے اور اس کا اخلاق اور میل جول اور ایک دوسرے کی ہمدردی اس کے ابنائے جنس کا حصہ ہیں۔ پس خدا کے حصہ کو خدا پر چھوڑ دو اور جو تمہارا حصہ ہے اس سے مطلب رکھو۔

اے عزیزو! ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا۔ دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں

عادتیں لے لیں یہاں تک ہم دونوں آپس میں مل کر ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی۔ جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی۔ پس اگر ہم اس حصے سے جو کہ ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے قطع نظر کریں اور بحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے۔ اور آپس کے نفاق اور ضد و عداوت اور ایک دوسرے کی بدخواہی سے ہم دونوں برباد ہونے والے ہیں۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جو اس نکتہ کو نہیں سمجھتے۔

لیکچر بمقام پٹنہ ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء

(لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۴۳-۱۴۴)

میرا سیکولر طریقۂ کار۔ آپ نے اپنے ایڈریس میں میری ان خدمتوں کا بھی ذکر کیا ہے جو میں نے اس زمانہ میں انجام دی تھیں جبکہ مجھ کو قانونی کونسل کے ممبر ہونے کی عزت حاصل تھی۔ میں اس بات کے کہنے سے باز نہیں رہ سکتا ہوں کہ مجھ کو پورا یقین ہے کہ مجھ سا شخص ہندوستان کی قانونی کونسل کی ممبری اور جو بڑی جوابدہی اس ممبری سے متعلق ہے اس کو اپنے ذمہ لینے کے لائق نہ تھا۔ میں خود ان مشکلات سے واقف تھا۔ جو میرے راستہ میں حاصل تھیں مگر باوجود اس کے میری یہ دلی تمنا تھی کہ میں اپنے ملک اور اپنی قوم کی وفاداری کے ساتھ خدمت کروں۔ لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے ہیں لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں۔ ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ "ہندو" یعنی ہندوستان میں رہنے والی قوم۔ جس زمانہ میں میں قانونی کونسل کا ممبر تھا تو مجھ کو خاص اسی قوم کی بہبودی کی دل سے فکر تھی۔ مجھ کو اس بات سے نہایت مسرت ہوتی ہے کہ آپ میری ناچیز خدمتوں کی اس قدر وقعت کرتے ہیں اور اب میں آخر میں خدا تعالیٰ سے یہ دعا مانگتا ہوں کہ وہ ہماری قوم کو جس کی تعریف میں نے ابھی بیان کی ہے علمی ترقی عطا فرمائے جس کے ذریعہ سے ہماری قوم اور ہمارے ملک میں روشنی پھیلے اور آپ کی ایسوسی ایشن کی کوششوں کو کامیاب کرے اور نیز آپ کی تمام کوششوں اور کاموں میں آپ کا معاون ہو۔

تقریر بمقام لاہور۔ انڈین ایسوسی ایشن کے ایڈریس کے جواب میں۔ ۳ فروری ۱۸۸۴ء

(لیکچروں کا مجموعہ ص ۳-۴)

دینی اور دنیاوی امور ملائے نہیں جا سکتے۔

دنیا میں دو قسم کے امور ہیں۔ ایک روحانی اور دوسرے جسمانی یا یوں کہو کہ ایک دینی اور دوسرے دنیاوی۔ سچا مذہب امور دنیاوی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ ہاں چند معظم باتوں کو جن کا اثر اخلاق پر زیادہ تر ہے اور گو وہ دنیاوی ہوں، بیان کر دیتا ہے کوئی شبہ نہیں کہ اسلام بھی جو بیشک ایک سچا مذہب ہے اسی اصول پر مبنی ہے اور ہمارے رسول مقبول کا یہ قول کہ ما اتاکم من امر دینکم فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا اس پر دلیل کافی ہے اور قریب زمانہ نبوت میں اسی اصول پر عمل در آمد رہا۔

مقالات سرسید (ص ۶۹)

صحیح اتحاد کیا ہے۔ برادران من! اتفاق اور یکجہتی سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقائد کو چھوڑ کر ایک عقیدہ پر ہو جاویں۔ یہ امر تو قانون قدرت کے برخلاف ہے جو ہو نہیں سکتا۔ نہ پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ

کبھی ہوگا، مگر اس اتفاق کے قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے ایک اور عقلی اور نقلی راہ ہے جس کی پیروی کسی قومی اتحاد کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔ انسان جب اپنی ہستی پر نظر کرے گا تو اپنے میں دو حصّے پاوے گا۔ ایک حصّہ خدا کا اور ایک حصّہ ابنائے جنس کا۔ انسان کا دل اور اس کا اعتقاد یا مختصر طور سے یوں کہو کہ اس کا مذہب خدا کا حصّہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں۔ اس کے عقائد کی جو کچھ بھلائی یا برائی ہو اس کا معاملہ اس کے خدا کے ساتھ ہے۔ نہ بھائی اس میں شریک ہے نہ بیٹا نہ دوست نہ آشنا نہ قوم۔ پس ہم کو اس بات سے جس کا اثر ہر ایک کی ذات تک محدود ہے اور ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے کچھ تعلق رکھنا نہیں چاہیے۔

ہم کو یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطن بھائی ہیں۔ بہت سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں۔ اسی زمین پر ہندوستان کی ہو یا پنجاب کی۔ دکن کی ہو یا ہمالیہ کی ہم دونوں رہتے ہیں۔ اسی ملک کی ہوا سے، اسی ملک کے پانی سے، اسی ملک کی پیداوار سے دونوں کی زندگی ہے۔ ہزاروں امور تمدن ایسے ہیں کہ بغیر ہمارے ان کو اور بغیر ان کے ہم کو چارہ نہیں۔ ہمسایہ کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور یہی ہمسائیگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی و ہم وطنی کی وسعت تک پہنچ گئی ہے۔ ان ہم وطن بھائیوں میں بھی دو حصّے ہیں۔ ایک خدا کا دوسرا ابنائے جنس کا۔ خدا کا حصّہ خدا کے لئے چھوڑ دو اور جو حصّہ ان میں ابنائے جنس کا ہے اس سے غرض رکھو تمام امور انسانیت میں جو تمدن و معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں ایک دوسرے کے مددگار رہو۔ آپس میں سچی محبت، سچی دوستی، دوستانہ بردباری رکھو کہ دونوں قوموں کو ترقی کرنے کا یہی

یونیورسٹی لائبریری بلڈنگ۔ جو جدید طرز تعمیر کا ایک حسین مرقع ہے
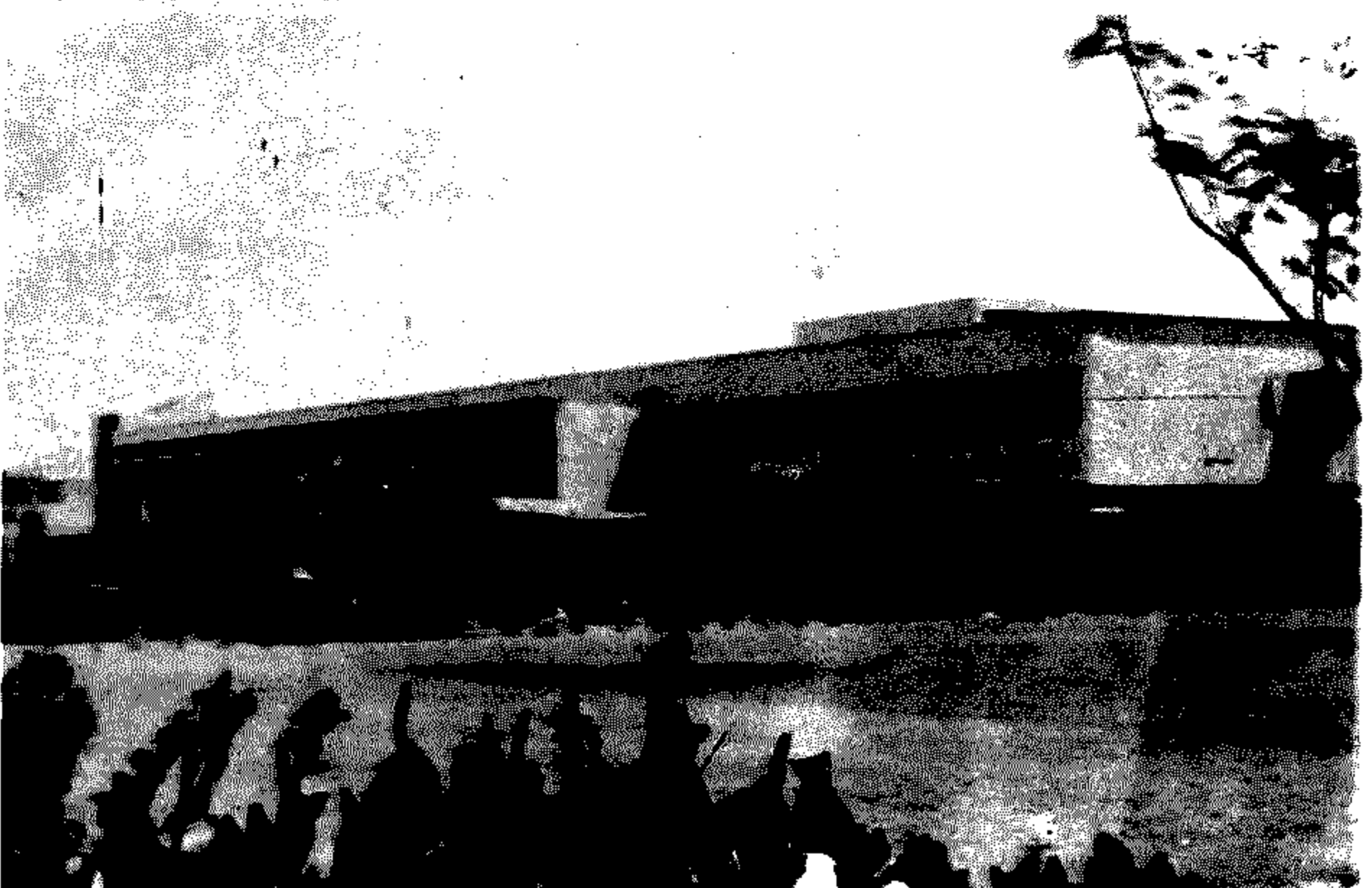
وکٹوریہ گیٹ ۔ اس دو منزلہ عمارت میں مسلم یونیورسٹی کے مختلف دفاتر ہیں، یہ عمارت انگریزی اور ہندوستانی طرز تعمیر کا دلکش سنگم ہے

وابستہ ہے۔ لیکچر بمقام لدھیانہ ۲۳ر جنوری ۱۸۸۳ء
(لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۵۱-۱۵۰)

تہذیب کیا ہے ۔ جب کہ ہم کسی قوم کو تہذیب کی طرف مائل کرتے ہیں تو ہم کو ضروری ہے کہ ہم یہ بھی بتا دیں کہ اس قوم کو کن کن چیزوں میں تہذیب کرنی چاہیے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے ہمارے خیال

ہیں آتا ہے کہ مفصلہ ذیل چیزیں ہیں جن کی تہذیب پر ان کو متوجہ ہونا چاہئے:-

آزادئ رائے:- مسلمانوں کی رائے اور ان کے خیالات ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے اور رسومات کے پابند ہوتے رہتے ایسے پست اور پامال ہو گئے ہیں جن کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔ پس جب تک کہ رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہوگی۔ اس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آئے گی۔

عقائد مذہبی:- ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد مذہبی جو اُن کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں جو انکے دلوں میں ہیں اور جن کا ان کو یقین بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقائد شرکیہ ان کے دلوں میں ہیں۔ پس اپنے عقائد کو حیثیت اسلام کے مطابق کرنا تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔

خیالات و افعال مذہبی:- ہندوستان کے مسلمانوں میں صدہا خیال اور توہمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعال مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ پس ہم کو مہذب ہونے کے لئے ان کی تہذیب درکار ہے۔

ان تمام چیزوں کو جو مذہب سے متعلق ہیں۔ ہم نے تہذیب و شائستگی میں اس لئے داخل کیا ہے کہ قوم کے مہذب ہونے پر مذہب کا بڑا اثر ہوتا ہے پس جس قدر جس قوم کے مذہب میں نقص ہے اتنا ہی اس کی پوری تہذیب میں نقصان ہے۔

تعلیم اطفال:- مذہب کے بعد جو چیز سب سے ضروری ہے وہ تعلیم ہے ہم کو زمانہ گزشتہ اور حال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقہ تعلیم معین کرنا چاہئے جس سے علوم دینی اور دنیوی دونو قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجہ تک ہم کو قابو ملے۔

عورتوں کی تعلیم:- کچھ شبہ نہیں کہ قومی تہذیب و شائستگی کے لئے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ پس ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اور ان کو دستکاری سکھلانے کے لئے کوئی بندوبست کرنا چاہئے۔

سامان تعلیم:- ہمارے لئے صرف طریقہ تعلیم معین کرنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ آپس کی مدد اور مجموعی ہمت اور فیاضی سے اس کا سرو سامان بھی مہیا کر دینا ہوگا۔

ہنر و فن و حرفہ:- اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن و حرفہ کو پھیلانا اور ترقی دینا، قومی تہذیب کے لئے ایک بڑا جزو ہے۔

مندرجہ بالا باتیں وہ ہیں جو مجموعاً و منفرداً ہر شخص سے اور کل قوم سے علاقہ رکھتی ہیں۔

قومیں کس طرح ترقی کرتی ہیں:- آؤ اب ہم بالاجمال ان وسیلوں پر غور کریں جن سے قوموں کی دانائی اور علوم اور عقلمندی کے اقبال کو ترقی ہوتی ہے۔ اس امر عظیم الشان کے مطلب کے صحیح نتیجہ کے دریافت کرنے کے لئے ہم کو ان قوموں کے اگلے اور پچھلے حال پر نظر کرنی چاہئے جو آج کے دن فنون اور علوم کی کھیتی میں سب سے بڑھ کر درجہ رکھتی ہیں جبکہ ہم اگلے زمانے اور حال کے زمانے کی تاریخ پر متوجہ ہوتے ہیں تو ہم کو بطور قاعدہ کلیہ کے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس کی طبیعت میں دوسری قوم نے تخم ریزی نہ کی ہو اور اس نے علوم و فنون میں بزرگی اور عظمت حاصل کی ہو! ایسے شخصوں یا قوموں کی چند مثالیں ہیں جنہوں نے خود آپ ہی اپنی طبیعت سے کوئی فن یا علم ایجاد کیا یا اس کو تحقیق کیا اور پھر اس کو اس کے برتر درجوں میں پہنچا گئے اور آخر کار اس کو کاملیت کی بلندی پر پہنچا دیا مگر عموماً ہم کو یہ دریافت ہوتا ہے کہ ایک قوم تو کسی بات کو تحقیق کرتی ہے اور دوسری قوم اس کی تحقیقات کو اس سے لیتی ہے اور پھر اپنی محنت اور استقلال سے اس کو کاملیت کے درجہ تک پہنچا دیتی ہے۔ پہلے زمانہ میں ہم کو (مسلمانوں کو) فلسفہ

وحکمت کا کچھ علم نہ تھا۔ اوّل میں ہم نے ان کو یونانیوں سے لیا اور اپنی محنت اور استقلال سے ان کو اس اعلیٰ درجہ پر پہنچایا جس کی شہادت ہمارے مصنفوں کی کتابیں دے رہی ہیں۔ ہندو اگرچہ قدیم سے علم میں ایک بڑا درجہ رکھتے ہیں لیکن معتبر پرانی تاریخوں سے جو اَب بھی موجود ہیں اور اے کاش کہ ہنوز تک وہ ہمارے پاس رہیں، معلوم ہوتا کہ ان کو وہ درجہ افتخار صرف انہیں کی ذاتی قوئ عقلیہ سے حاصل نہیں ہوا تھا بلکہ اس سبب سے ہوا تھا کہ ان کو ایک ہمسایہ کی قوم سے جو اُن کے شمال مغرب کی سرحد پر تھی۔ بخوبی راہ ورسم حاصل تھی، اپنے ملک سے قطع نظر کر کے ہم کو صرف تاریخ انگلستان پر جو اس زمانہ میں تربیت کا ملجا وماوا ہے نظر کرنی چاہیے۔ اس غرض سے کہ ہم دریافت کر لیں کہ انگریزوں نے جو کچھ ان کو حاصل ہے اس کو انہوں نے خود آپ ہی آپ نہیں سیکھا ہے بلکہ علوم وفنون کا جو اُن کو علم ہے سو وہ بہت سی صورتوں میں ان کو دوسری قوم سے حاصل ہوا ہے اور انہوں نے اپنی تیز فہمی اور بڑی مستقل محنت سے کاملیت کے نہایت اعلیٰ درجہ پر جس میں وہ اب تک رہے ہیں پہنچا دیا ہے۔

غرض کہ قوموں کی دانائی کی ترقی کچھ تو خاص انہی کی اور کچھ اور قوموں کی محنتوں اور کوششوں سے ہوتی ہے قومیں بھی اسی طرح سے جیسے کہ کوئی شخص آپس کی معاونت سے عمدہ ترقی پاتے ہیں اس طرح کہ جو اُن کے پاس ہے اوروں کو دیں اور جو کچھ ان کے پاس نہیں ہے وہ اوروں سے لیں۔ اسی اصول پر دنیا کے انتظام اور علم کی ترقی اور تربیت کے پھیلنے کی بنیاد ہے۔ پس یہ بات بالکل صاف ہے کہ جب تک ہمارے ہم وطن اپنے علم کے موجودہ ذخیرہ میں اور کچھ نہ بڑھا دیں گے اور کاہلی اور سستی اور خود غرضی اور ہم وطنوں کی خیر خواہی سے بے پرواہی کی حالت میں جس میں وہ اب دکھائی دیتے ہیں اور جس میں بدبختی سے وہ آپڑے ہیں پڑے رہنے پر راضی رہیں گے اس وقت تک ان کو کسی طرح ترقی کرنے کی توقع نہیں ہو سکتی۔ پس آؤ ہم مستعد ہوں اور کوشش کریں اور قوموں کے مختلف فنون اور علوم کے اور ان کو بخوبی حاصل کرنے سے اپنے علم کو بڑھائیں اس مُردے پنے کی کاہلی کی حالت میں سے نکلیں کہ جس کی روز بروز ہم میں ترقی معلوم ہوتی ہے ہر برس جو گزرتا ہے ایک نئی شکل پیدا کرتا ہے اور ہر برس دقت کو زیادہ کرتا ہے۔ اے مسلمانو! تم ہمیشہ سے مستعدی اور چالاکی اور ذہانت اور علم و فضل میں نامی ہو۔ اے ہندوؤ! تم قدیم الایام سے مشکل مشکل علوم کے ایجاد میں مشہور ہو۔ اب تم دونوں کو کس بدبختی نے گھیرا ہے جس سے تم اپنے بزرگوں کے ناموں کو بھی ڈبوتے ہو۔ ایک نہایت خجالت کا دھبہ اپنے اوپر لیتے ہو۔ جاگو اور ہوشیار ہو اور اس پُرامن وقت کو غنیمت سمجھو اور اپنے بزرگوں کی طرح علوم وفنون کے حاصل کرنے میں مستعد ہو کر اپنے بزرگوں کے ناموں کو آفتاب کی مانند روشن کر دو۔

(التماس بخدمت ساکنان ہندوستان ۱۸۶۳ء غازی پور ص ۲۸)

نیا موڑ اور اس کے تقاضے

ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ مسجدوں اور خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی کو عقلی براہین سے توڑتے پھوڑتے رہیں اور ان کو تسلیم نہ کریں۔ مگر اس زمانہ میں نئی صورت پیدا ہوئی ہے جو اس زمانہ کے فلسفہ وحکمت کی تحقیقات سے بالکل علیحدہ ہے۔ اب مسائل طبعی تجربے سے ثابت کئے جاتے ہیں اور وہ ہم کو دکھا دیئے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں جو قیاسی دلائل سے اٹھا دیئے جاویں۔"

لیکچر بمقام لاہور یکم فروری ۱۸۸۴ء

(لیکچروں کا مجموعہ ص ۸-۲)

ملک کی اقتصادی ترقی کیسے ہو سکتی ہے

ملک کی تجارت اور دولت مندی کا اصول کیا ہے؟ وہ ملک
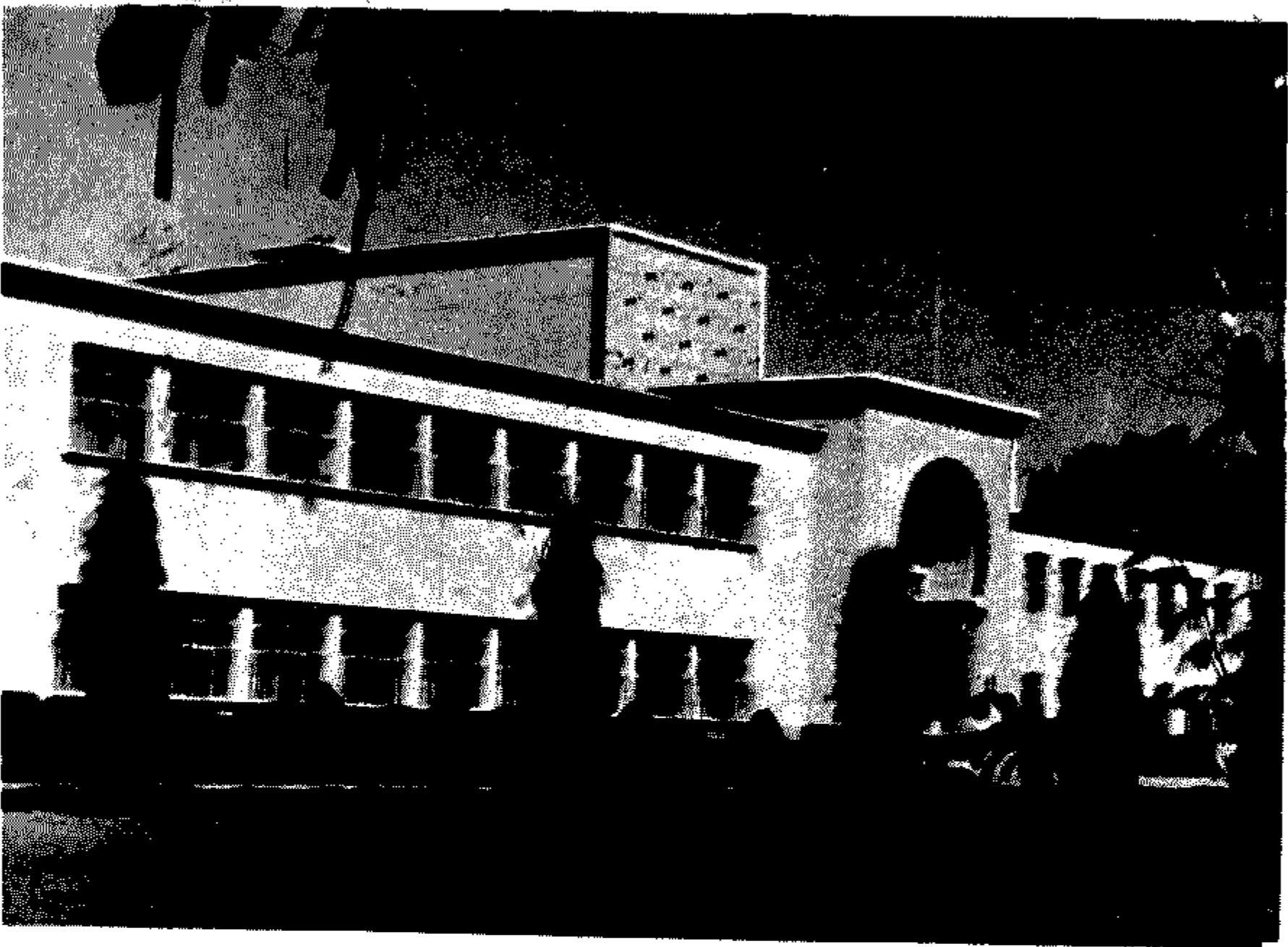
مولانا آزاد لائبریری جس میں قدیم و جدید علوم پر لاکھوں کتابوں کا خزانہ محفوظ ہے۔

دولت مند نہیں ہوتا جس میں دوسرے ملک کی چیزوں کی تجارت ہوتی ہے بلکہ وہ ملک دولت مند ہوتا ہے جس کی چیزوں کی تجارت کو دوسرے ملکوں میں ترقی ہوتی ہے۔ آج کل وہی ملک دولت مند ہو رہا ہے جس کی چیزوں کی تجارت دوسرے ملکوں میں ہوتی ہے۔ ہندوستان کی چیزیں اگرچہ دوسرے ملک میں جاتی ہیں مگر محنت کی قیمت بڑھا کر پھر اسی ہندوستان میں آجاتی ہیں۔ ہمارے ملک کی چیزوں کی نسبت بھی ہم لوگوں کی تجارت ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک یا ایک شہر سے دوسرے شہر تک محدود ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کی گرہ کاٹتا ہے۔ ہم لوگ اپنی چیز دوسرے ملک میں نہیں لے جاتے نہ دوسرے ملک کی چیز اپنے ملک میں لاتے ہیں۔ ہم دریا کے کنارے پر بلکہ اس زمانہ میں اپنی دکان سے چند قدم فاصلے سے ریل کے اسٹیشن پر چار آنے کی چیز سوا چار آنہ پر بیچ ڈالتے ہیں یا وہیں پر اس طرح سے خرید کر اپنے ملک میں بیچتے ہیں۔ سمندر کے اندر ہمارا کچھ حصہ نہیں ہے۔ غیر ملکوں سے ہمارا رشتہ نہیں ہے۔ ہم کو چاہیے کہ دوسرے ملک میں آڑھت اور کمپنیاں قائم کریں جس سے اعلیٰ درجہ کے تاجر ہوں۔ ملک کی پیداوار، قدرتی چیزیں جو زمین میں گڑی پڑی ہیں ان سے فائدہ اٹھاویں۔ ملک میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ روپیہ کو کبھی اس تھیلی میں اور کبھی اس تھیلے میں ڈالنے سے روپیہ نہیں بڑھ

جاتا جب تک کہ باہر سے لاکر اس میں روپیہ ڈالا نہ جاوے جب تم ایسا کروگے اس وقت بے شک جسطرح ہمارے ملک کا روپیہ دوسرے ملک میں جاتا ہے ہم بھی دوسرے ملک کا روپیہ اپنے ملک میں کھینچ لائیں گے۔ (مقالات سرسید)

تعلیم کا مقصد۔ ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اس کی عقل اور ذہن میں ایک جدت پیدا ہو تاکہ جو امور پیش آئیں ان کے سمجھنے کی، برائی بھلائی جاننے کی اور عجائب قدرت الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو۔ اس کے اخلاق درست ہوں، معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امور معاد پر غور کرے۔ گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں، بلکہ ہم اس قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور معاش سے علاقہ رکھتی ہے اور جو منحصر ہے صرف جغرافیہ حساب اور ہندسہ پر، نہایت بے جا ہے۔"

(حیات جاوید) ج. ص ۸۵۔

تعلیم سیاسی حقوق کے حصول کا راستہ ہموار کریگی

"اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک ہم کو نہیں دیئے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہو تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ مخواہ طوعاً و کرہاً ہم کو دلادے گی۔"

(لیکچر بمقام امرتسر ۲۹ر جنوری ۱۸۸۴ء)

(لیکچر کا مجموعہ ص ۱۸۹)

عزت شخصی نہیں قومی چیز ہے

"دنیا میں عزت ایک بڑی چیز ہے مگر وہ ہر شخص کو فرداً فرداً کسی طرح نہیں مل

استاف کلب کی خوبصورت عمارت، جو سادگی اور دلکشی میں اپنا جواب آپ ہے

سکتی جب تک کہ اس قوم کو جس میں کا وہ شخص ہے عزت حاصل نہ ہو۔ اگر ایسی قوم میں سے جو ذلیل ہے کسی خاص شخص کو عزت حاصل ہو تو اس سے قوم کو تو کیا عزت ہوگی بلکہ خود اس وجہ سے کہ وہ اسی ذلیل قوم میں کا شخص ہے ہمیشہ ذلیل ہی رہے گا۔ پس جو لوگ اپنی عزت چاہتے ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ قوم کی عزت میں کوشش کریں۔ جب قوم ذلت سے نکل جاوے گی اور پھر اس میں سے کوئی شخص کسی قسم کی عزت حاصل کرے گا تو اسکی اصلی عزت ہوگی اور وہ بھی کل قوم کی عزت کا باعث ہوگا۔ امید ہے کہ میرے مسافر کی اس صدا کا آپ ہمیشہ خیال رکھیں گے۔"

(سفرنامہ پنجاب ص ۸)

میں نے فرار کی زندگی کو پسند نہیں کیا۔

"غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مسٹر شکسپیئر نے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپیہ سے زیادہ کی مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ بالکل سچی بات تھی میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھ کو بوڑھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔

"یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہئے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادہ ہجرت موقوف کیا اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔" (لیکچر ۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء) (مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)

میری مصروفیت: "میری فرصت اور کاموں کا حال وہی لوگ جانتے ہیں جو دیکھتے رہتے ہیں۔ وقت کم اور کام بہت نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں۔ اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہوتا ہوں تو دو بہت سے ضروری کام ملتوی ہو جاتے ہیں۔"

(تقریر جالندھر ۲ فروری ۱۸۸۴ء) (لیکچروں کا مجموعہ ص ۲۴۲)

زمانہ کا ساتھ دو: "خدا کا حکم کوئی تحریری نہیں آتا مگر زمانہ کے حالات سے پایا جاتا ہے۔" (امرتسر ۲۹ جنوری ۱۸۸۴ء)
(لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۸۱)

علم کے خزانوں کو اپنے قبضہ میں کرلو: "سب ترقی کی جڑ یہی ہے کہ سب سے پہلے علم کے خزانوں کو اپنے قابو کا کرلو۔" (بنارس ۲۰ دسمبر ۱۸۶۷ء)
(لیکچروں کا مجموعہ ص ۳۸)

اپنی خامیوں کا احساس پیدا کرو: "دنیا میں کسی قوم کی ترقی کے یہی دو نشان ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سمجھنے لگیں کہ وہ ذلت اور خرابی میں مبتلا ہیں اور دوسرا نشان یہ ہے کہ اس ذلت سے نکلنے کی کچھ کوشش شروع کریں۔"
(لیکچروں کا مجموعہ ص ۲۴۸)

کاہلی چھوڑ دو: "یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج، محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔"
(مقالات سرسید ص ۱۶۸)

سچائی اختیار کرو :- "انسان کو چاہیے کہ اپنے مخالف کے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راستبازی، نیکی اور نیک دلی کو کام میں لاوے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے۔ ورنہ بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ رسوا کرنا ہے۔"

(تہذیب الاخلاق جلد ۲ صفحہ ۱۹۱)

تاریخی ورثہ کی حفاظت کرو :- کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے غیرتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے۔

(لیکچروں کا مجموعہ صفحہ ۱۴۴)

اپنی مدد آپ کرو :- "یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی مدد آپ کرنے کا جوش اس کی ترقی کی سچی بنیاد ہے اور جب کہ یہ جوش بہت سے لوگوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور مضبوطی کی جڑ ہے۔"

(مقالات سرسید صفحہ ۱۲۱)

سب مذاہب کا احترام کرو :- "ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو سچے، پاکباز اور تقویٰ شعار ہیں گو وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں ویسے ہی تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں جیسے کہ خود اپنے یہاں کے بزرگ اور مقدس لوگ۔"

(خطبات احمدیہ)

فکر و عمل میں یکسانیت پیدا کرو :- "میری نصیحت تم سب کو یہ ہے کہ کرو اس کو جس پر تم کو دلی یقین ہے اور مت کرو اس کو جس پر تم کو دلی یقین نہیں۔ یہی اصلی سچائی ہے اور یہی ایک بات ہے جس پر دونوں جہان کی نیکی منحصر ہے۔"

(مراد آباد ۳۰ نومبر ۱۸۷۳ء۔ لیکچروں کا مجموعہ صفحہ ۷۷)

آزادیٔ رائے ضروری ہے :- "رایوں کا بند رہنا، خواہ بسبب کسی مذہبی خوف کے، اور خواہ بسبب اندیشہ برادری و قوم کے، اور خواہ بدنامی کے ڈر سے، اور یا گورنمنٹ

سرسید احمد خاں مرحوم کا ایک نادر اور نایاب فوٹو (بشکریہ پروفیسر خلیق نظامی)

کے ظلم سے، نہایت ہی بری چیز ہے۔ رایوں کے بند رہنے سے تمام انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور کل انسانوں کو نقصان پہنچتا ہے اور نہ صرف موجودہ انسانوں کو، بلکہ ان کو بھی جو آئندہ پیدا ہوں گے۔

(مقالات سرسید صفحہ ۱۵۱)

خوشامد ایک بیماری ہے :- دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔

(مقالات سرسید صفحہ ۱۶)

ہمارا قافلہ کیسے آگے بڑھا :- "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔"

(مقالات)

(بشکریہ پروفیسر خلیق نظامی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو

ماخوذ

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ تقریباً ختم ہو چکا ہے برطانوی سامراج نے سارے ملک کو انتقامی آگ کے شعلوں میں ڈال دیا ہے۔ ہزاروں معصوم اور بے گناہ انسان ظلم اور بربریت کا شکار ہو رہے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے دیہاتوں میں جگہ جگہ درختوں سے نعشیں لٹکی ہوئی ہیں اور ان کے گرد کوّے اور چیلیں منڈلا رہی ہیں۔ دہلی کے بے شمار کنوئیں نعشوں سے پٹ گئے ہیں بازاروں کا عالم یہ ہے کہ ؎
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں

ایم اے او کالج میں ایک یادگار مشاعرہ کی نادر و نایاب تصویر۔ آپ بھی سر سید مرحوم کے دور کے چند ممتاز شعراء کو دیکھ سکتے ہیں

ایک یادگار فوٹو — بشکریہ پروفیسر خلیق نظامی) فرش پر بیٹھے ہوئے (بائیں سے دائیں) (۱) مولانا شوکت علی مرحوم (۲) پروفیسر اے۔ عزیز، انسپکٹر آف اسکول (۳) میاں احسان الحق (۵) مولانا ظفر علی خاںؒ (۶) خواجہ کمال الدین۔ (کرسی پر بیٹھے ہوئے) (۱) نواب حسین خاں خیال (۲) سید مسیح اللہ خاں "کور" (۳) راجہ محمود آباد (محمد علی محمد خاں) (۴) سر آغا خاں مرحوم (۵) نواب فتح علی خاں قزلباش (۷) خواجہ یوسف علی (کھڑے ہوئے پہلی قطار میں) (۱) عبدالقادر (۲) سید علی بلگرامی (۳) آفتاب احمد خاں (۴) سر محمد شفیع (۵) ہوتی خاں یا مولوی فیع الدین (۶) ڈاکٹر ضیاء الدین (۸) سر محمد اقبال (دوسری قطار میں (۲) عماد یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی (۵) مولوی عبداللہ (۶) مولوی عزیز مرزا

نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

غم اور مایوسی کی گھٹائیں ہر طرف سے امنڈی چلی آرہی ہیں۔ زندگی ایک بوجھ بن چکی ہے۔ تار نفس سینوں میں کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔ جو سے کافور و کفن کی تمنا میں لگا ہے اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہہ رہا ہے ؎

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو

اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

اللہ کا ایک بندہ جب اس موج خوں کو سر سے گزرتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ مصلحت خاموش اشارہ کرتی ہے کہ گھر میں بیٹھو اور ہونٹوں کو سی لو۔ سہولت پسندی چپکے سے کان میں کہتی ہے کہ یہاں سے ہجرت کر جاؤ اور ان مصیبتوں سے نجات پاؤ۔ لیکن وہ اولوالعزم انسان نامساعد حالات کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کر دیتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے کہ اپنی قوم کو ذلت اور نکبت سے نکالنے میں اپنی زندگی کے آخری لمحات صرف کر دے گا۔

"غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا، نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا۔ آپ یقین

کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور نامروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ میں نے ہجرت کا ارادہ ترک کیا اور قوم کی بھلائی کے لئے جد و جہد کی راہ اختیار کی۔ میرے غم خوار مجھ کو اس سے منع کرتے تھے لیکن میرا دل ان سے یہ کہتا تھا ؎

حریفِ کاوشِ مژگانِ خوں ریزم نہ، ناصح
بدست آور رگِ جانی و نشتر را تماشا کن

پھر میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ قوم کو اس زمانہ کی ضرورت کے موافق تعلیم دینا اور یورپ کے علوم کا ان میں جاری کرنا کیا اسلام کے برخلاف ہے! مجھے جواب ملا کہ نہیں۔"

دل کے اس جواب نے سید احمد خاں کی زندگی کا رخ متعین کر دیا۔ انہوں نے مغربی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے لئے تدبیریں سوچنی شروع کیں کہ اسی میں قومی زوال اور انتشار و ابتری کا علاج نظر آتا تھا لیکن یہ کام کسی طرح جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مسلمان قدیم تہذیب کا خستہ لبادہ اوڑھے بیٹھے تھے اور افسانوی شتر مرغ کی طرح اپنی گردنوں کو عظمت گزشتہ کے ریگ زار میں چھپا رکھا تھا۔ اس طلسمی دنیا سے نکالنے کے لئے "نوائے تلخ" اور "عزم کوہکن" دونوں کی ضرورت تھی۔

نئے حالات میں پرانے نظام تعلیم کی بے مائیگی اور بے بسی سب پر ظاہر ہو چکی ہے لیکن اس میں ترمیم کی جرأت کسی کو نہ تھی۔ سر سید احمد خاں نے اعلان کیا۔

"ایسے ایسے مدرسوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر مچھ کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ مرجھائے ہوئے درخت کی جڑ میں پانی دینے کے بجائے اس کے پتوں پر پانی چھڑکتے ہیں اور سوکھے ہوئے چشموں میں سے نہریں کھود کر پانی لانے کی توقع کرتے ہیں! پچھلا طریقہ تعلیم واقعی بہت اچھا تھا لیکن وہ تیلیاں جس ڈورے سے بندھی تھیں ٹوٹ گیا۔ اب دوسرا ڈورا ان کے باندھنے کو ہونا چاہیئے۔"

اس نئے ڈورے کی تلاش نے سید احمد خان کو سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام کا راستہ دکھایا اور انہوں نے اعلان کیا

"ہنر، فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیئے۔ ایک متعصب انسان ان تمام دل چسپ اور مفید باتوں سے جو نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اس کی عقل اور اس کی دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے اور تربیت و شائستگی، تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔"

انہوں نے بار بار بتایا کہ ذہنی آزادی کے بغیر کوئی سماج ترقی نہیں کر سکتا۔ جس قوم نے فکر پر بندشیں لگائیں

اس نے اپنی موت کے محضر پر دستخط کر دیئے سائنٹفک سوسائٹی نے ہراول کا کام کیا اور سید احمد خاں کی مہم کے لئے راستہ تیار کر دیا۔

اب ایک درس گاہ کے خطوط ان کے ذہن میں ابھرنے لگے ہیں۔ ان کو واضح شکل دینے کے لئے لندن کا سفر ضروری محسوس ہوا۔ وسائل کی تنگی نے دامن پکڑنا چاہا تو گھر بار بیچ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سفر میں جس راہ سے گزرے جس عمارت کو دیکھا، جس شخص سے ملے، جس جلسہ میں شرکت کی ان کے دل نے بے اختیار اپنے وطن کو پکارا۔

"میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو، دور دراز کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے۔ جب کبھی کھیل کود، عیش و آرام کے جلسے دیکھے یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔"

نہر سویز بنانے والا انجینئر LESSEPS جہاز میں ہم سفر تھا۔ اس سے لوگوں کا اصرار تھا کہ نہر کا نام اسی کے نام پر رکھا جائے۔ اس نے انکار کیا اور کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ اس نہر کو CANAL OF FRANCE کہا جائے۔ یہ جواب سید احمد کی روح کو تڑپا گیا اور وہ حسرت سے کہنے لگے۔

"کاش میرے وطن میں بھی ایسے لوگ ہوتے جو قومی خدمت کو ذاتی نام و نمود سے علیحدہ رکھتے اور وطن کی خدمت کا جذبہ ذاتی منفعت پر غالب آجاتا۔"

جب آکسفورڈ اور کیمبرج کی عالی شان عمارتوں سے گزرے، جب بیلی ال کے لیکچر روم دیکھے ــــ جب FENNER کے میدان میں طلبا کرکٹ کھیلتے نظر آئے جب CHERWELL کے پرسکون سایہ دار درختوں میں ٹہل کر ان کو فکر و نظر کی دنیا بساتے دیکھا اور جب یونین کلب میں ان ہی کو سرگرم گفتگو پایا تو ان کا بے چین دل اور بے چین ہو گیا۔ ان کے ذہن نے ایک بے صبر انقلابی کی طرح اپنے ملک میں تعلیم کا نیا خاکہ لندن ہی میں تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔

"وقت کم اور کام زیادہ۔ نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں۔ کوئی رات نہیں جاتی کہ اسی مدرسہ کے تقرر کی باتیں اور تجویزیں یہاں نہ ہوتی ہوں۔

اے بھائی مہدی! اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیونکر آتا ہے اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آن کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا مگر مجھ کا ذمہ دار اور گردن مروڑی ہوئی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا۔"

سرسید کا آخری سفرِ پنجاب - ایک نایاب فوٹو (بشکریہ خلیق نظامی)
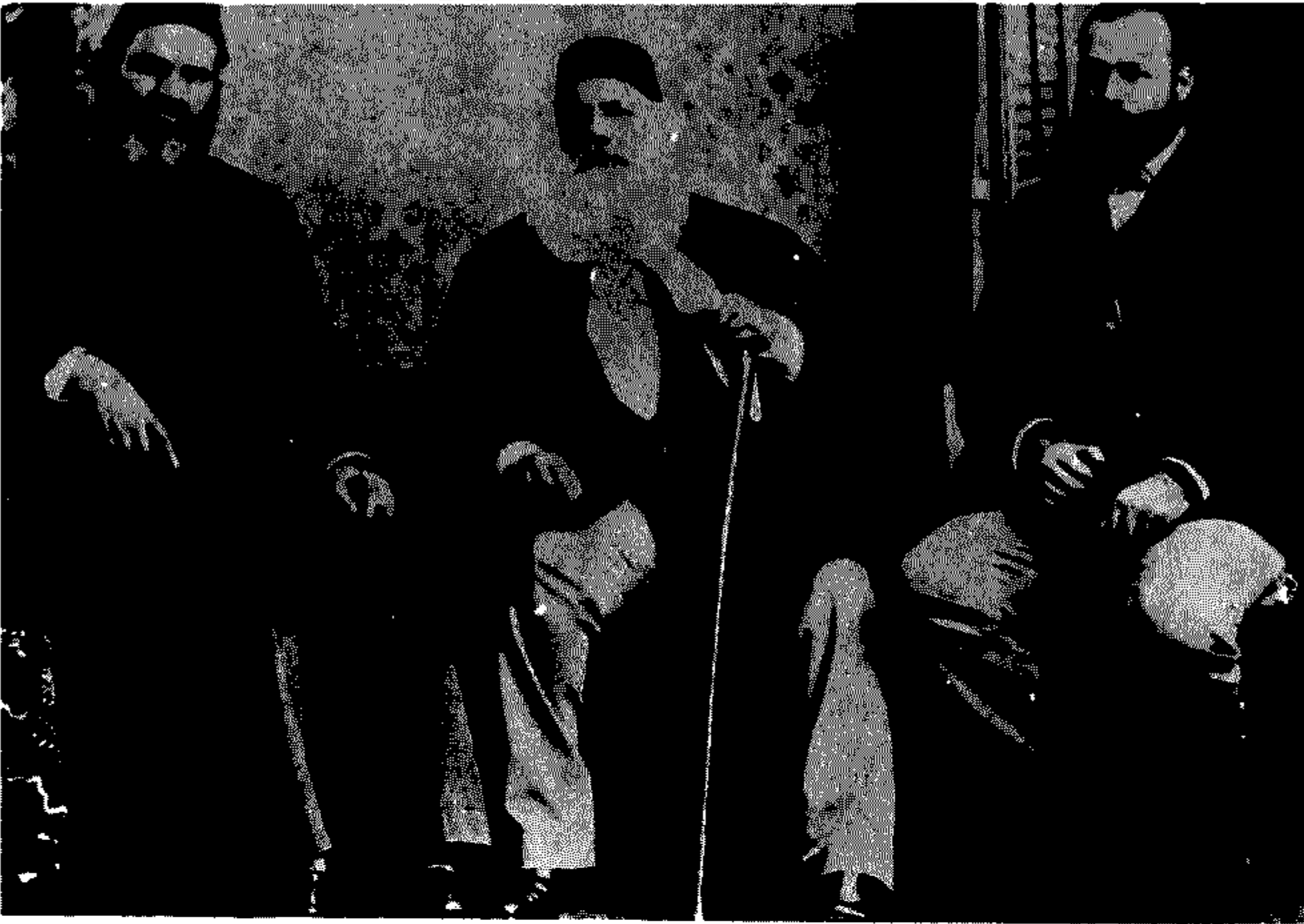
(۱) سرسید کے صاحبزادے جسٹس محمود مرحوم (۲) سرسید احمد مرحوم (۳) نواب محسن الملک مرحوم

وہی ہوا جس کا ڈر تھا مخالفین مضامین کی بوچھاڑ ہو گئی۔ اور تو اور مولانا جمال الدین افغانی بھی اس مخالف پروپیگنڈہ کا شکار ہو گئے۔ کچھ دوستوں نے تردید میں کچھ لکھنا چاہا تو سید احمد خاں نے یہ کہہ کر روک دیا۔

"مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے میں تو ہدف تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید میرے بعد کوئی زمانہ آوے جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں"

جب ان مضامین سے کام نہ چلا تو مخالفین نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا اور کفر کے فتووں سے یلغار شروع کر دی۔ مخالفوں کی اس مہم نے سید احمد خاں کے عزم کی بنیادوں میں سیسا پگھلا کر بھر دیا اور انہوں نے

کہا کہ اس مخالفت کے بعد تو مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میری قوم کو اس نئی تعلیم کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ مذہبی بنیاد پر مخالفت کرنیوالوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم، اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے آپ کے لئے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں اور آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں

چوہڑے، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ پس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی، چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجیے اور اس کی وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو نہ ڈھائیے کیا آپ مجھ ایک بدبخت، نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی قوم کو اور انکی اولاد کو ڈبونا اور خراب خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں۔"

جب ان کی یہ آواز تعصب اور تنگ نظری کے پردے چاک نہ کر سکی تو غم اور حسرت کے ساتھ عواقب سے اس طرح آگاہ کیا۔

"اے صاحبو! ہماری زندگی قریب اختتام ہے۔ چند سال ہی ہماری تمہاری عمر میں اور باقی ہیں۔ یہ سفید سفید داڑھیاں پوپلے پوپلے منہ زمین میں گڑ کر یا مرگھٹ پر جل کر خاک ہو جائیں گے۔ مگر یاد رکھو کہ یہ بچے جن کو تم نوجوان چھوڑ جاؤ گے ان کا یہ حال ہوگا کہ روز بروز مفلس اور ذلیل و خوار ہوں گے۔ جیل خانے ان سے بھرا کریں گے۔

"اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیز اور پیارے بچوں کو غارت نہ کرو۔ انکی پرورش کرو۔ ان کی آئندہ زندگی اچھی طرح بسر ہونے کا سامان کرو۔ مجھ کو تم کچھ ہی کہو میری سنو یا نہ سنو مگر یاد رکھو کہ اگر تم ایک قومی تعلیم کے طور پر ان کو تعلیم نہ دو گے تو وہ آوارہ اور خراب ہوں گے۔ تم ان کی ابتر حالت کو دیکھو گے اور بے چین ہو گے روؤ گے اور کچھ نہ کر سکو گے۔ تم اگر مر جاؤ گے تو اپنی اولاد کی زندگی دیکھ کر تمہاری روحیں قبروں میں تڑپیں گی اور تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ ابھی وقت ہے اور تم سب کچھ کر سکتے ہو مگر یاد رکھو کہ میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اگر چند روز تم اسی طرح غافل رہے تو ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ تم چاہو گے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دو، ان کی تربیت کرو مگر تم سے نہ ہو سکے گا مجھ کو کچھ کہو، کافر، ملحد، نیچری میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا ہوں میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لئے کہتا ہوں۔ تم انہیں پر رحم کرو اور ایسا کرو کہ آئندہ کو پچھتانا نہ پڑے۔"

بنارس میں "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" کا جلسہ ہونے والا ہے۔ سرسید نے اپنے دوست محسن الملک کو ایک دن پہلے بلا لیا ہے کہ مدرسۃ العلوم کی اسکیم پر گفتگو ہو جائے اس رات کی داستان خود محسن الملک کی زبانی سنیے۔

"رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق باتیں ہوتی رہیں

اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو اکیلے پلنگ پر نہ پایا۔ میں ان کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ خدا نخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جا رہے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔"

خون جگر کی اس آمیزش سے سرسید نے مدرسۃ العلوم کا خمیر تیار کیا! تعلیمی مہم روپیہ کے بغیر ہاتھ پر سرسوں جمانے کے مترادف تھی۔ روپیہ حاصل کرنا آسان کام نہ تھا جو لوگ نام و نمود پر ہزاروں لاکھوں روپیہ خرچ کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے ان سے تعلیم کے لئے چند روپیہ بھی حاصل کرنا دشوار تھا لیکن سرسید نے ہمت نہ ہاری۔ دوستوں اور ساتھیوں سے سب سے زیادہ مطالبے کئے۔ ان کے دوست چندہ دیتے دیتے تھک گئے لیکن وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے۔ لیکن صرف دوستوں کی مہم سے یہ مہم کب سر ہو سکتی تھی۔ مجبوراً اور بے بس ہو کر فقیروں کا لباس پہنا اور گلے میں جھولی ڈال کر در بدر بھیک مانگنے نکل کھڑے ہوئے۔ ہندوستان نے فقیروں اور گداگروں کی بے شمار قسمیں دیکھی تھیں لیکن یہ قومی گداگر جس نے صدا لگائی تھی ان سب سے مختلف تھا اس کی اس گداگری پر ہزاروں امارتیں قربان تھیں اور اس کے اس کاسۂ گدائی کے آگے جام جم بھی بے حقیقت تھا۔ ایکدن بڑے رنج سے کہا۔

"اب ہمارا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا، اس لکھے کی پر لاتا ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے۔"

پھر ایک تھیٹر ترتیب دیا اور چندہ حاصل کرنے کے لئے اسٹیج پر آکر آواز لگائی ؎

قوم ما اے قوم ما کز بہر تو
دادہ ام بر باد ننگ و نام را

اور کہا:۔

"اے رئیسو اور دولتمندو! تم اپنی دولت اور حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کی حالت بری ہو مگر ہمارے بچوں کے لئے سب کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب ان ہی کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لئے ہم آج اس اسٹیج پر کھڑے ہیں۔"

شبلی کا غمزدہ دل یہ منظر دیکھ کر رو دیا:۔

دوستو کیا تمہیں سچ مچ تھا تھیٹر کا یقیں
کیا یہ سمجھے تھے کہ پردہ کوئی ہوگا رنگیں
نظر آئے گی جو سوئی ہوئی ایک زہرہ جبیں
آئے گا پھول کے لینے کو ارم کا گلچیں
قوم کی بزم کو یوں کھیل تماشا سمجھے
ہائے گر آپ یہ سمجھے تو بے جا سمجھے

اسٹریچی ہال میں سرسید احمد اسکول کے اساتذہ اور طلباء کے ساتھ

نوحۂ غم ہے یہاں نغمۂ عشرت کیسا
ہے یہ حسرت کا سماں جوشِ مسرت کیسا
ہے جنوں خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیسا
قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا
ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے
قوم کے خوابِ پریشاں کی یہ تصویریں ہیں
ایکٹر یہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں

برسوں کی مسلسل جدوجہد نے بالآخر فضا ہموار کر دی۔ سید احمد خاں کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور علی گڑھ کے خاموش ویرانہ میں بہار کے آثار نظر آنے لگے۔ حالی نے اس طرح دعوت دی ؎

اگر رکھتے ہیں دل پہلو میں آکر یہ چمن دیکھیں
ریاضِ قوم کا فصلِ خزاں میں بانکپن دیکھیں
کلب میں آکے گر احباب رنگِ انجمن دیکھیں
توزیبِ کرسیٔ صدر ایک مجسّم یونین دیکھیں
نہ دیکھی ہوں جنہوں نے شفقت و طاعت کی تصویریں
وہ بک اور اس کے شاگردوں کو باہم ہم سخن دیکھیں
تاسّف کرتے ہیں جو ہند کی نااتفاقی پر
کلب میں ہندیوں کے آئیں اور یونین دیکھیں
اگر باور نہ ہو اخلاص سنّیؔ اور شیعہ کا
بہم شیر و شکر یاں چار یار و پنجتن دیکھیں
نہ دیکھا ہو جنہوں نے پیار ہندو اور مسلماں کا
وہ آکر مسلم و ہندو کو یکجان و دو تن دیکھیں

مسیحی پوششیں دیکھیں مسلمانوں کے بچوں کی
مسیحی کو مسلمانی قبا زیبِ بدن دیکھیں

مجسّم دیکھنی ہو شکل مہرِ مادری جن کو
وہ بچوں سے سلوکِ آرنلڈِ مسکین دیکھیں

اگر ہو دیکھنی تقریر میں تصویر معنی کی
تو ڈاکس کا بوقتِ درس اندازِ سخن دیکھیں

دمِ تدریس دیکھیں چکرورتی کو اگر برسوں
نہ پیشانی پہ بل دیکھیں نہ ابرو پر شکن دیکھیں

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں

اگر بو جعفرِ طوسی کو زندہ دیکھنا چاہیں
تو عباس ابن جعفر سا محیطِ علم و فن دیکھیں

پھر ان کے بعد وہ دیکھیں مربّی اپنے بچوں کا
تو اک بچوں سے بڑھ کر زندہ دل پیرِ کہن دیکھیں

خوشی میں رنج میں صحت میں بیماری میں دکھ سکھ میں
اسے جب آ کے دیکھیں قوم کی دھن میں مگن دیکھیں

نہ سمجھیں یہ کہ اسکو ہے ہماری مدح کی پروا
اگر سید کا استحقاق اہلِ انجمن دیکھیں

محبِ قوم سنتا ہے در و دیوار سے تحسیں
جنہیں باور نہ آئے وہ محبِ قوم بن دیکھیں

سرسید کا توی ہیکل جسے کبھی اسٹریچی ہال کے اندر آتے دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا جیسے کوئی جہاز بادبان پھیلائے طوفانی موجوں میں چل رہا ہے اب کمزور و ناتواں ہو چکے ہیں ذرا تکلّف سے داخل ہوتے ہیں ؎

ایم اے او کالج کی پہلی فٹ بال ٹیم۔ کھلاڑیوں کے نام معلوم نہ ہو سکے

صورت سے عیاں جلالِ شاہی
چہرہ پہ فروغِ صبح گاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی
چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم
توقیر کی صورتِ مجسم

سارا مجمع مجسم ادب بن جاتا اور ہزاروں نظریں اس "پیرِ زندہ دل" پر گڑ جاتی ہیں۔ حالی کا دل جذبات سے امنڈ آتا ہے۔ فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں اور سید کی طرف رخ کر کے پڑھتے ہیں ؎

عزیزو حق کی نعمت ہیں یہ پیر ناتواں ہم میں
پھر ایسا پیر ہے ہم میں نہ کوئی نوجواں ہم میں
ہزاروں ہم میں ہوں گے بیچلر اور ماسٹر پیدا
مگر اے قوم پھر یہ صورتیں پیدا کہاں ہم میں
عزیزوں کو خدا وہ نامبارک دن نہ دکھلائے
کہ سایہ تیری ہمدردی کا ان کے سر سے اٹھ جائے
تیرے احسان رہ رہ کے سدا یاد آئیں گے انکو
کریں گے ذکر ہر مجلس میں اور دہرائیں گے انکو
جنہوں نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے
انہوں نے پھل سدا محنت کا کم دنیا میں پایا ہے
یہ تیری خوش نصیبی تھی کہ ثمرہ تیری کوشش کا
خدا نے زندگانی میں تری تجھ کو دکھایا ہے
بہت جھکڑ چلے اور آئیں اکثر آندھیاں لیکن
رہا گلزار ہو کر باغ جو تو نے لگایا ہے
اسے [illegible] میں بہت وابستہ تیری زندگانی سے
دعا [illegible] کی سے کے عمر بڑھتا تا رہ

سر سید عصا کا سہارا لے کر مشکل سے کھڑے ہوتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں آواز بھرا گئی ہے۔ لیکن عزم اور خلوص کی دل گیری اب بھی باقی ہے۔

عزیزو! میرے بے چین دل کو آج کچھ قرار سا آگیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کو ہے۔ میں اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہوا چاہتا ہوں۔ میری ملت کو اس غم نے گھلا دیا تھا کہ وقت کا قافلہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جارہا ہے لیکن تم ہو کہ خوابِ گراں سے بیدار ہونے کا نام نہیں لیتے۔ میں نے برسوں لگاتار تمہیں جگانے کی جدوجہد کی۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بسترِ غم واندوہ پر بیقراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ آج مسجد کی محرابیں اور اسٹریچی ہال کے یہ بام و در دیکھتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کی بے قراریوں نے اس کالج کا پیکر اختیار کر لیا ہے۔ دیکھو میری ایک نصیحت یاد رکھنا۔

"خدا کا کوئی حکم تحریری نہیں آتا، مگر زمانہ کے حالات سے پایا جاتا ہے۔"

دیکھو زمانہ کی آواز اب بھی آرہی ہے ؎

وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو
میر بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو
خبر تم کو بھی ہے کچھ اے میری چالوں سے بیگانو
نصیحت میری مانو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ
پھری جس وقت دیکھو میری چتون تم بھی پھر جاؤ ■■

مسلم یونیورسٹی میری زندگی کا عظیم کارنامہ

هز هائی نس سر آغا خاں مرحوم

ترجمہ و تلخیص ــــ سہیل احمد

اسمٰعیلی شیعہ فرقہ کے روحانی پیشوا اور امام ہز ہائی نس سر آغا خاں مرحوم نے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کو مسلمانوں کا ایک عظیم تعلیمی ادارہ اور دنیا کی ایک مثالی درسگاہ بنانے میں سرسید مرحوم اور نواب محسن الملک مرحوم کے ساتھ مل کر اہم کردار ادا کیا تھا۔

موصوف نے اپنی کتاب MEMOIRS OF AGAKHAN (آغا خاں کی یادیں) میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک سے اپنی وابستگی کا بارہا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "اکتوبر ۱۸۹۰ء میں جب موسم گرما کی سخت تپش ختم ہوگئی اور موسم باراں گذر گیا تو میں نے پہلی بار شمالی ہند کا دورہ کیا۔ آگرہ۔ دہلی اور لاہور گیا جو مسلم ہندوستان کے مراکز تھے اسلامی تہذیب اور ثقافت کے عظیم آثاروں، تاج محل، لال قلعہ جامع مسجد۔ آگرہ اور دہلی کی خوبصورت موتی مسجد وغیرہ کی زیارت کرتا ہوا علیگڈھ میں اینگلو مسلم کالج پہنچا، جہاں سرسید احمد اور نواب محسن الملک سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات میری زندگی کے اس اہم مشن کا نقطۂ آغاز بنی جس کا تعلق مسلمانوں کی اعلیٰ تر تعلیم بالخصوص علیگڈھ میں کالج اور یونیورسٹی کے قیام سے میری عمر بھر کی دلچسپی سے تھا۔ میں نے جوانی کے جوش و خروش کے ساتھ اس اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ یوں تو ۱۸۹۰ء ہی میں علیگڈھ ایک قابلِ تعریف ادارہ تھا لیکن سرمایہ کی قلت اور سہولیات کے فقدان نے اس کی سرگرمیوں کو محدود بنا رکھا تھا۔ اس وقت میں نے یہ سوچا تک نہ تھا کہ ایک دن یہ ادارہ اسلامی روایات

ایم اے او کالج کے پہلے انگریز پرنسپل مسٹر ماریسن اور ان کی بیگم

اور تعلیمات کے مطابق مسلم افکار اور ثقافت کا منبع بنے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی کو بھی ان باتوں کا اندازہ نہ تھا لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کر لیا تھا کہ علیگڈھ کے حلقۂ اثر کو وسیع کرنے اور اسے سرچشمۂ ترقی بنانے کی سخت ضرورت ہے اس لئے میں ہر ممکن طریقہ پر جلد از جلد اس کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کا خواہاں تھا۔ میں نے سر سید اور محسن الملک سے جوانی کے جوش میں کہا کہ ہم کیوں نہ مسٹر راک فیلر یا مسٹر کارنیگی کی طرح کے امریکی مخیر حضرات سے مل کر اس کے لئے امداد طلب کریں۔ لیکن میرے دوست سن رسیدہ اور دور اندیش تھے اس لئے انہوں نے کہا کہ "یہ خود ہماری ذمہ داری ہے۔ ہندوستان کے ۱۰ یا ۲ کروڑ

(صحن مسجد سے ملحقہ عمارت "محمود منزل" میں سرسید کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھانے کے بعد واپسی۔ وائس چانسلر ڈاکٹر علیم کے ساتھ اساتذہ اور طلبا، "سرسید ڈے" پر لی گئی ایک تصویر)

مسلمان اس کام کو بخوبی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم بیرونی امداد حاصل کریں گے تو ہمیشہ کے لئے ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔"
میں نے ان کے اس معقول خیال سے اتفاق کیا اور برسوں کی محنت و جانفشانی، تقریروں، کمیٹیوں میں بحث و مباحثہ اور اعلیٰ مرتبت لوگوں سے طویل جھڑپوں کے بعد ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔
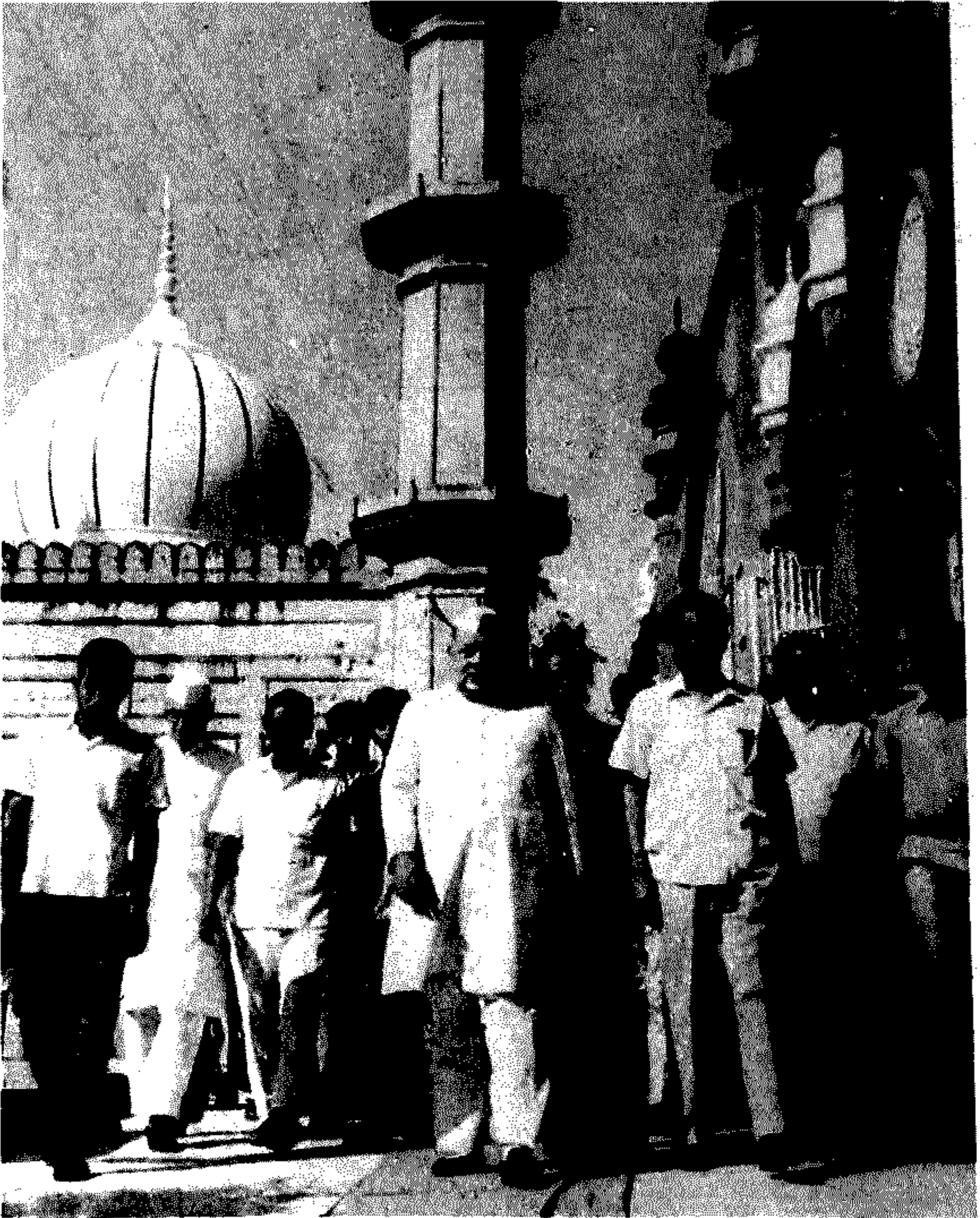
وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں میری رکنیت کے دوران ایک قابلِ ذکر واقعہ دہلی دربار کا تھا جس کے آخر میں کمانڈر انچیف لارڈ کچنر کی سرداری میں ۴۰ ہزار فوجوں کی پریڈ

ہوئی تھی۔

اس دربار میں ڈیوک آف کناٹ جس نے فوج سے سلامی لی تھی سلطنت برطانیہ کا نمائندہ تھا۔ وہ شہنشاہ برطانیہ کا بھائی اور میرا بچپن کا دوست تھا۔ دربار کے فوراً بعد دہلی میں ایک مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں میں نے بہت سے تعلیمی منصوبوں پر جن میں سب سے اہم منصوبہ علیگڈھ کا تھا تفصیلی تقریر کی۔ اپنی اس تقریر میں میں نے براہِ راست اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے کہا ــــ "میں آپ سے دردمندانہ گذارش کرتا ہوں کہ ایک مرکزی یونیورسٹی کے قیام پر پوری توجہ مبذول فرمایئے، ایک ایسی یونیورسٹی جو ایک دن آکسفورڈ لیپزگ اور پیرس کی ہم پلہ بنے۔ جو عظیم خیالات اور بلند نظریات کا مرکز ہو۔ ایک ایسی یونیورسٹی جہاں آپ کے نوجوانوں کو مغربی علوم کی اعلیٰ ترین تربیت دی جائے۔ ایک ایسی یونیورسٹی جہاں مشرقی تاریخ اور ادب کا علم مغربی افکار کے مطابق طوطوں کی طرح رٹایا نہ جائے بلکہ جہاں ہمارے نوجوانوں کو اسلامی ماحول بھی حاصل ہو۔ ایک بار پھر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایسی یونیورسٹی کے قیام کا مقصد بازاری شور وغل میں جو ہمارے درمیان روانہ بلند ہوتا ہے دب کر نہ رہ جائے۔"

پچاس سال قبل میری زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ علیگڈھ کے سلسلہ میں میرے دلی جذبات کی عکاسی کرتے تھے اور میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میرے ان جذبات نے میری زندگی ہی میں عمل کی شکل اختیار کرلی۔

بنگال میں نواب علی چودھری اور نواب آف ڈھاکہ اور پنجاب میں سر محمد شفیع اور سر ذوالفقار علی خاں کی قیادت میں مسلمانوں میں سیاسی بیداری کافی مستحکم ہوچلی تھی اور میں اپنا کافی وقت، توانائیاں اور دلچسپیاں علیگڈھ پر مرکوز کئے ہوئے تھا۔ میں خود کو ایک "رکنی تیزابی گروپ" سمجھتا تھا جس کا مقصد علیگڈھ کو ایک عظیم مسلم یونیورسٹی میں تبدیل کرنا تھا۔ اس زمانہ میں ہم نے اس منصوبہ کے لئے لوگوں میں کافی جوش اور ولولہ پیدا کردیا لیکن ہماری اس تحریک کو ان طاقتور برطانوی عناصر کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا جن کی دلیل یہ تھی کہ مسلمانوں کی یونیورسٹی کا قیام نامناسب ہوگا کیونکہ اس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ اور مفادات خصوصی کی ذہنیت اور تعلیمات کو فروغ حاصل ہوگا۔ میں نے اپنی تمام تقریروں، اپنے تمام مضامین اور مالی امداد کے لئے اپنی تمام اپیلوں میں اس اندازِ فکر کی تردید کی اور اس بات پر زور دیا کہ "فرزندانِ علیگڈھ ملک کے طول وعرض میں، آزاد خیالی، وسیع القلبی اور رواداری اور اخلاقیات کا پیغام پھیلائیں گے۔" مجھے اپنے اس مقصد میں کچھ بلند مرتبہ لوگوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ لارڈ منٹو کی جگہ پر لارڈ ہارڈنگ وائسرائے مقرر ہوئے جو ایک آزمودہ کار سیاست داں اور مدبّر تھے۔ وہ ایران اور مشرق وسطیٰ کے بہت سے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ زندگی گزار چکے تھے۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں محکمہ تعلیم کے انچارج سر ہرکورٹ بٹلر تھے جو ایک لائق منتظم اور ذہین افسر تھے۔ لارڈ ہارڈنگ اور سر ہرکورٹ دونوں نے مسلمانوں کی پوزیشن کو محسوس کیا اور وہ دونوں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف سماجی، ثقافتی اور روحانی پس منظروں سے بھی آگاہ تھے۔ جہاں تک میرا تعلق تھا میں نے بار بار یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کو ان کی ترقی کا آخری ذریعہ نہیں سمجھتا میں اس خیال کا تھا کہ مسلمانوں کو قعرِ مذلت سے نکالنے کا ایک ذریعہ اعلیٰ تعلیم بھی ہے۔ میرے ذہن میں کوئی بھی تنگ دلانہ یا فرقہ وارانہ مقصد نہیں تھا۔ میں نے شروع ہی سے یہ بات کہی تھی کہ یونیورسٹی میں سنسکرت کی تعلیم ہونی چاہئے اور اس کے ساتھ ہی ہندو تہذیب، مذہب اور فلسفہ کی بھی تعلیم ہونی چاہئے تاکہ ہمارے عوام اپنے ہم وطنوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی کی ضرورت کے سلسلہ میں میری دلیل یہ تھی کہ یہ

یونیورسٹی اسلام کے روحانی اتحاد کو فروغ دینے کا ایک مفید اور پائدار ذریعہ ہوگی۔

دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے اور سرمایہ فراہم کرنے کا کام جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ میں نے پورے ہندوستان کی خاک چھانی اور عظیم مسلم لیڈروں، غریبوں اور امیروں راجاؤں اور کسانوں کے سامنے دستِ طلب بڑھایا۔ خود میں نے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ یہ رقم اُس زمانہ میں بہت بڑی تھی۔ اور میں نے کُل تیس لاکھ روپے جمع کئے۔ یہ کام میں نے برسوں کی جانفشانی اور محنت سے کیا۔ میں ہفتوں سفر میں رہتا، اور ٹرینوں ہی میں کھانا پیتا اور سوتا۔ جس جگہ بھی ٹرین رُکتی میں پلیٹ فارم پر جمع ہونے والے مسلمانوں کو خطاب کرتا، ہر مناسب موقع پر میں علیگڑھ کے کاز کا تذکرہ کرتا۔ اس پورے سفر میں میرے اعزازی پرائیویٹ سکریٹری اور دست راست مولانا شوکت علی مرحوم تھے ان کی لگن اور جان توڑ کوششوں کے بغیر میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ بالآخر ۱۹۱۰ء میں ناگپور میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں ہماری تحریک اپنی انتہا کو پہنچ گئی، جہاں ایجنڈہ کا خاص آئیٹم علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا پروجیکٹ تھا۔ کانفرنس کے چیرمین مسٹر یوسف علی نے ہمارے مقاصد کی وضاحت بڑے اچھے انداز میں کی۔ انہوں نے کہا "اس میں افکار کی آزادی اور پاکیزگی کی ہمت افزائی کی جائے گی۔ ایس معنی میں مسلم یونیورسٹی ہوگی کہ ان نظریات کو فروغ دے گی جو ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی دو نسلوں کے تعلیمی تجربات سے تشکیل دیئے تھے۔"

اب، جب میں علیگڑھ کی مسلم یونیورسٹی کے مقاصد اور گزشتہ چالیس برسوں میں اس کی کامیابیوں پر نظر ڈالتا ہوں تو بے ساختہ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ بلاشبہ یہ میری زندگی کا ایک کارنامہ ہے جس پر میں فخر کرسکتا ہوں۔ میں صرف اس کے سیاسی نتائج پر زور نہیں دینا چاہتا کہ یہ وقتی تھے بلکہ میں یہ

کہنا چاہتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ اور کہاں یہ بات ممکن تھی کہ ہم اپنی دنیا اور اپنے زمانہ کی کل معلومات حاصل کرنے کے لئے لائبریریوں کے ساتھ ہر قسم کے سامان سے آراستہ لیباریٹریاں قائم کرتے۔ جسے ہم اسلامی عقائد اور تہذیب کا حقیقی مرکز بناتے اور جہاں ہم اپنے مذہب کے اصولوں، اس کی آفاقیت اور حقیقی جدیدیت۔ اس کی بنیادی شائستگی اور رواداری کے جذبہ پر عمل کرتے ہوئے دیگر عقائد کا احترام کرسکتے۔ یہ بات میرے لئے انتہائی خوشی، سکون اور اعتماد کی ہے کہ میں نے اس قسم کے مرکز کے قیام میں اپنا کردار ادا کیا۔

۱۹۱۲ء کے اوائل میں دہلی میں دربار ہوا جس میں شہنشاہ برطانیہ اور ملکہ نے شرکت کی۔ دربار کے موقع پر ہندوستان کی راجدھانی کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا اعلان ہوا۔ اور راجدھانی کے شایان شان ایک نیا شہر (نئی دہلی) تعمیر کیا گیا۔ بنگال کی تقسیم کو کالعدم قرار دیا گیا اور علیگڑھ کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا اور مجھے شہنشاہ برطانیہ نے سب سے بڑا اعزاز "جی، سی ایس، آئی" دیا۔

سیاہی! ہر سمت سیاہی، کہیں بھی تو ایک ننھا منا ستارہ روشن نہیں۔ دنیا کے مسلمانوں کی قسمت کی طرح اتھاہ سیاسی اخیالات بھٹک رہے ہیں مگر ان کی کوئی منزل نہیں کتنی باتیں، کتنی یادیں ایک زنجیر کی طرح ذہن کو بوجھل کر رہی ہیں۔ ہندوستان کے تمام مسلمان بیگم اندرا گاندھی کے جھنڈے تلے جمع ہیں۔ حکمراں پارٹی زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے زمین لرز رہی ہے۔ حکمراں پارٹی بھاری اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوگئی۔ علی گڑھ کے مسلمانوں نے اپنے لہو سے حکمراں پارٹی کی مانگ میں سرخی بھری۔ وزیر اعظم کے لبوں پر مسلمانوں کے بھرپور تعاون کے لئے شکریہ کے پھول کھل اٹھے۔

مسلم یونیورسٹی! جہاں ایک دن بیگم اندرا گاندھی زندہ باد کے نعروں سے بام و در دہل اٹھے تھے۔ آج بند ہو چکی ہے۔ طلبا زبردستی گھروں کو بھیج دیئے گئے ہیں (کیونکہ ان کے پُرامن مظاہرہ سے ملک و قوم کو خطرہ تھا۔) چاروں طرف ہولناک اداسی بکھری ہوئی ہے۔ یہ مسجد ہے! جہاں دن میں پانچ وقت اذان کی آواز گونجا کرتی تھی۔ جہاں طلبا، پاک پروردگار کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے۔ جہاں وہ پیدا کرنے والے سے ایمان کی بھیک مانگنے کے لئے دامن پھیلایا کرتے تھے۔ آج یہاں چمگادڑ چہچہاتے پھر رہے ہیں۔ سیاہ ماحول میں اس کے سفید سرخی مائل مینار آنکھیں پھاڑے نمازیوں کو تلاش کر رہے ہیں مگر دُور دُور تک کوئی نظر

ایک ملاقات

نواب محسن الملک سے

(عبدالبصیر نعیمی)

جنہیں آرہا ہے۔ یہ وکٹوریہ گیٹ کا عظیم پھاٹک ہے جہاں سے کبھی ہزاروں طلبا سیاہ شیروانی پہنے سرسید ہال میں داخل ہوا کرتے تھے۔ آج خود سیاہی کا ایک حصہ بنا خاموش نظروں سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ یہ آرٹس فیکلٹی ہے جو کبھی ایک رومان پرور گہما گہمی تھی آج ویران ہے۔ انجینئرنگ کالج! پالی ٹیکنک! ٹریننگ کالج (ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ)! سائنس فیکلٹی کے ڈپارٹمنٹس! جنرل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ! لائبریری! سب پہ ویرانی کی دبیز چادر مسلط ہے۔ عبداللہ اور عزیزی ناگٹو ہال کے دروبام کی دھڑکنیں بند ہو چکی ہیں۔ سرسید ہال! آفتاب ہال! سر شاہ سلیمان ہال! وقار الملک ہال! محسن الملک ہال! سر راس مسعود ہال! پروفیسر حبیب ہال! کبھی طلبا کے قہقہوں سے معمور رہتے تھے جو آغوش مادر بنے طلبا کو پیار کے نغمات سنا کرتے تھے۔ آج کھوئی کھوئی نظروں سے نہ جانے خلا میں کیا تلاش کر رہے ہیں۔

اور یہ سرسید ہاؤس ہے۔ جس کے سبزہ زار طلبا کو دیکھ کر سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ آج خزاں رسیدہ ہو چکے ہیں۔ کبھی اسی مکان میں سرسید اور ان کے رفقاء کالج کی فلاح و بہبود کے لئے سر جوڑ کر بیٹھا کرتے تھے۔ آج بھوتوں کا مسکن معلوم ہو رہا ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ اس مرجھائی گھاس کے لان پر کچھ دیر بیٹھ کر تازہ دم ہو لوں۔ ورنہ یہ تھکن کہیں مجھے سیاہی کے اس عمیق غار میں نہ پھینک دے۔

ایں "یہ قدموں کی آوازیں کیسی؟ اتنی رات گئے یہ کون آرہا ہے بھلا؟ ارے! یہ تو میری طرف آرہا ہے اور یہ میرے نزدیک آکر رک گیا۔ سیاہ شیروانی، سر پہ ٹوپی، کشادہ پیشانی، چمکیلی آنکھیں، ستواں ناک اور مختصر مگر خوبصورت سی داڑھی میں اس سے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ کہاں؟ ہاں! میں نے کہاں دیکھا تھا؟ ذہن کام نہیں کر رہا ہے۔ خود انہیں سے کیوں نہ پوچھوں۔

"السلام علیکم"

ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم (بیگم بھوپال) جو کم دسمبر ۱۹۲۰ء سے ۱۴ مئی ۱۹۳۰ء تک دس سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی چانسلر رہیں

"وعلیکم السلام" مجھے جواب ملا اور وہ میرے نزدیک ہی گھاس پر بیٹھ گئے۔ "پہچانا" سوال کیا گیا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں سید مہدی علی خاں ہوں۔"

"سید مہدی علی خاں؟" میں پھر ذہن پر زور ڈالنے لگا۔ دفعتاً اچھل پڑا۔ مجھے یاد آگیا۔ "نواب محسن الملک!"

وہ مسکرا اٹھے۔ کتنا سکون تھا۔ کتنا پیار تھا، کتنی اپنائیت تھی اس مسکراہٹ میں۔

"مگر آپ کے انتقال کو تو عرصہ گزر چکا ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں! تم درست کہتے ہو صاحبزادے مگر آج میں

ہزہائی نس نواب حمیداللہ خاں علیگ (نواب بھوپال)
۲۰ ستمبر ۱۹۳۰ء سے ۱۷ اپریل ۱۹۳۵ء تک پانچ سال
مسلم یونیورسٹی کے چانسلر رہے

اپنے اس مدرستہ العلوم کو دیکھنے آیا ہوں جس کے ذرّہ ذرّہ کو سرسیّد اور ان کے رفقاء نے اپنے خون سے سینچا ہے"۔ انہوں نے کہا۔

"لیکن مدرستہ العلوم تو ــــــ" میں رک گیا۔ کیا کہوں ان سے، حقیقت جان کر کتنا دکھ ہوگا ان کو۔ "جناب!" میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو رات ہے۔ ہر سمت ویرانی ہے اس وقت آپ کیا دیکھیں گے۔ ذرا روشنی ہونے دیں۔ پھر میں خود آپ کو یہاں کی سیر کراؤں گا۔ جب تک میں آپ کے ماضی کے بارے میں چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میرے ماضی کے بارے میں؟ کیا تم میرے ماضی سے ناواقف ہو؟" انہوں نے حیرت سے کہا۔

"جی وہ" اپنی کم علمی پر میں شرما کر رہ گیا۔ "میرا مطلب ہے کہ آپ کی زندگی، یعنی کہ"

وہ شاید سمجھ گئے۔ ایک ٹک مجھے دیکھتے رہے اور پھر بولے:

"میرا نام سید مہدی علی خاں ہے۔ میں ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوہ میں پیدا ہوا تھا۔ تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرنے کے بعد دس روپے ماہانہ پر محرر ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسٹر ہیوم کا پیشکار ہوگیا۔ میں اپنا کام جس محنت اور لگن سے کرتا تھا اس کا انجام یہ ہوا کہ جلد ہی تحصیل دار اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک جا پہنچا۔ اسی دور میں میری ملاقات سر سید احمد خاں سے ہوئی اور انہوں نے میری سفارش سالار جنگ (حیدرآباد) سے کی۔ میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے کر حیدرآباد چلا گیا اور وہاں "معتمد کارروائی" کے عہدے پر فائز ہوا۔ ۱۳۰۱ھ کو اعلیٰ حضرت فرمانروائے حیدرآباد نے مجھے نواب محسن الدولہ محسن الملک کے خطاب سے نوازا۔ ۱۸۹۳ء میں حیدرآباد سے وظیفہ لے کر علی گڑھ چلا آیا۔ سر سید کا آخری دور تھا۔ بقول مولانا حالی "کشتی تعلیم اپنے بانی کے بدوقوف کے باعث طوفانی موجوں میں گھر گئی تھی۔ ایک لاکھ کا غبن سخت تھپیڑا ثابت ہوا۔ مجھے سر سید کے طریق کارروائی سے اختلاف ہوا۔ سر سید نے میری ایک نہ مانی اس سے مجھے سخت تکلیف ہوئی اور میں بمبئی چلا گیا۔ میرے دل میں درسگاہ سے محبت پیدا ہو چکی تھی اور میں نے اس درسگاہ کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے ہندوستان بھر کا دورہ کرنا شروع کر دیا۔" محسن الملک سانس لینے کیلئے رکے۔ دفعتہً کچھ سوچ کر مسکرا اٹھے بولے "جب میں دہلی پہنچا تو وہاں کے مولوی صاحبان نے کہا کہ اس کمرے میں لیکچر سننے کے لئے جانا سیدھا جہنّم میں جانا ہے۔ لیکچر سننے والوں پر ان کی منکوحہ عورتیں حرام ہو جائیں گی۔ کسی نے کہا کہ وہاں نہ جاؤ وہاں تو دجّال آیا ہے۔ ان تمام باتوں کا میں نے صرف یہ جواب دیا کہ مولوی صاحبان کا یہ کہنا کہ دجّال آیا ہے ایسا غلط واقع

ہز اکزالٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں مرحوم (نظام حیدرآباد) ۲۶ اگست ۱۹۳۵ء سے ۹ نومبر ۱۹۴۷ء تک بارہ سال مسلم یونیورسٹی کے چانسلر رہے

امر ہے کہ کوئی شخص اس کا یقین نہیں کرے گا۔ ایک بچے سے بھی پوچھو گے تو وہ یہی کہے گا کہ مہدی آیا ہے۔

"اس کے بعد میں نے انگلینڈ کا دورہ کیا اور ادھر ایک عظیم انقلاب آگیا۔ سر سید احمد خاں جنہوں نے اپنی تمام عمر قوم کی بھلائی کے لئے وقف کر دی تھی۔ جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ سید محمود سر سید کے جانشین مقرر ہوئے مگر ان کی حالت دن بدن خراب ہو رہی تھی۔ وہ اس قابل بھی نہ رہے تھے کہ کالج کے سکریٹری کے بطور کام کر سکتے۔ دوسری طرف چند بدخواہ ان کو میرے خلاف مسلسل بھڑکاتے رہتے تھے کالج کے ٹرسٹیوں نے جب دیکھا کہ سید محمود کام کرنے کے اہل نہیں رہے تو حکومت کے ایماء پر سید محمود کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہ مجھے کالج کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ میں سکریٹری مقرر ہونے کے بعد ہمیشہ سید محمود کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا رہا۔"

"ابھی آپ نے فرمایا کہ آپ نے انگلینڈ کا بھی دورہ کیا۔" میں نے کہا "آپ کو پسند آیا؟"

"میں خیال کرتا ہوں۔" محسن الملک نے جواب دیا۔ "انگلینڈ میں دلچسپ چیز وہی ہے جس پر ہم مسلمان بہت کم غور کرتے ہیں۔ انگریز خواتین نہ صرف کتابوں میں بلکہ دنیا کے کاروبار میں مردوں کے برابر تعلیم یافتہ ہیں اور ہر علم اپنے بچوں کو سکھاتی ہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ انگلینڈ کے ماحول سے بہت متاثر ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"متاثر!" انہوں نے میری طرف دیکھا۔ "ہاں بہت متاثر ہوا۔ وہاں مفلسی سخت ہے۔ تکلیف شدید ہے اور ایک حصہ لندن میں ایسے مصیبت زدہ لوگ ہیں جو تمام ہندوستان میں نہ ملیں گے۔ ایسا بے غیرت، بے حمیت، ناپاک ملک دنیا میں نہ ہوگا۔ ایمان، غیرت اور انصاف کا نام نہیں ہے۔" محسن الملک کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"اچھا ایک بات بتایئے۔" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ابتدا میں آپ کو سر سید کے مذہبی عقائد سے سخت اختلافات تھے۔ پھر بھلا آپ ان کے ساتھ کیسے ہو گئے؟"

"اختلافات!" محسن الملک چند لمحے خلا میں دیکھتے رہے پھر بولے "مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب میں پہلے پہل سر سید سے علی گڑھ میں ملا تھا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی تعلیم کی نسبت ان کے خیالات اور ارادوں پر بحث ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں میں ان کا مخالف تھا اور تعلیم کے معاملہ میں انکی بلند پروازیاں سن سن کر بہت ہنستا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے معلوم تھا کہ جس قوم کی بہبودی اور ترقی کے

ہز ہائی نس نواب رضا علی خاں (رامپور) ۱۹ر اپریل ۱۹۳۶ء سے ۱۹ر اپریل ۱۹۴۷ء تک پرو چانسلر اور ۳ر نومبر ۴۷ء سے ۳۱ر جنوری ۱۹۵۳ء تک پانچ سال مسلم یونیورسٹی کے چانسلر رہے

لئے وہ فکر کر رہے ہیں وہ سستی اور لاپرواہی کی مہلک بیماری میں مبتلا ہے۔ اس وقت میرا دل یہ ہی کہتا تھا کہ ان کو ہرگز کامیابی حاصل نہ ہوگی خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان کے مذہبی عقائد کو ہندوستان کے اکثر مسلمان اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سمجھتے تھے مگر کچھ عرصہ میں میرے ان خیالات میں تغیر پیدا ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ سرسید کا دل سچے جوش اور ہمدردی سے بھرا ہے۔ رفتہ رفتہ میرے اعتراضات رفع ہوئے اور میرے دل نے قبول کر لیا کہ سرسید کے خیالات صحیح اور میرے غلط ہیں اس کے بعد میرا دل خود بخود ان کی طرف مائل ہو گیا اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں ان کی مدد کروں گا۔"

مگر اس کے باوجود ایک بار پھر آپ کے سرسید سے کچھ اختلافات ہو گئے تھے؟ میں نے کہا۔ "جس سے بددل ہو کر آپ بمبئی چلے گئے تھے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو صاحبزادے!" محسن الملک نے پرسکون آواز میں کہا۔ "میں کالج کے موجودہ ڈھانچے سے متفق نہ تھا۔ میری شکایات یہ تھی کہ کالج کے ٹرسٹی بالکل ناکارہ تھے۔ نکمے اور نالائق ٹرسٹیوں کی بھرتی سرسید نے کالج کی وسعت کو چلانے کے لئے اور نیز اس لئے کی کہ ان کے دور اندیشانہ منصوبے بغیر کسی اختلاف کے پورے ہوتے رہیں ایسے لوگوں کو کالج فنڈ کمیٹی کا ممبر بنایا جن سے مالی امداد کی توقع ہو یا جو قوم میں کسی وجہ سے شہرت رکھتے ہوں اور سکریٹری سے کسی معاملہ میں اختلاف کرنے کا نہ ان میں مادہ ہو نہ ارادہ۔ پھر جب ٹرسٹی بل پاس ہوا تو وہ ہی لوگ ٹرسٹی مقرر ہوئے۔"

علی گڑھ سے بمبئی چلے جانے کے بعد بھی آپ کالج کی خدمت کرتے رہے۔ آخر کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"کیونکہ مسلمانوں کی تعلیم کا یہ تنہا مرکز تھا اور قوم کی خدمت کرنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔"

"ملک میں تو اور بھی یونیورسٹیاں تھیں کیا ان میں مسلمان تعلیم نہیں حاصل کر سکتے تھے؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"موجودہ یونیورسٹیاں ہم مسلمانوں کی مختص الحالات حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی نہ تھیں۔ نہ کسی قسم کی اصلاح سے یہ امید ہو سکتی تھی کہ وہ تمام حاجتوں کے لئے کافی ہوں سرسید احمد خاں اور ان کے ہم خیال اس امر سے متفق الرائے تھے کہ ہماری ضرورتیں اسی وقت پوری ہو سکتی ہیں جبکہ ہم تعلیم و تربیت میں گورنمنٹ کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں سے آزاد ہوں اور اپنی ضرورت اور مرضی کے موافق اپنی قومی تعلیم کا خود انتظام کریں۔"

"تو گویا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج دوسری درسگاہوں سے مختلف تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ اور جو نمایاں فرق اس کالج کے اور دوسرے کالجوں کے طلباء میں ہے صرف نتیجہ بورڈنگ ہاؤس کے عمدہ انتظام اور عمدہ صحبت اور پروفیسروں و طلباء کے باہمی میل جول کا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"معاف فرمائیں" میں نے کہا۔ "آپ کا مقصد یہ ہے کہ اس درسگاہ کا اقامتی کردار ضروری ہے اور اسلامی کردار کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ یعنی کہ اسلام"

"اسلام!" وہ سخت لہجہ میں بولے۔ "اگر تمہارے ذہن میں اسلام کی سچائی کا یقین نہ رہے اور تم اپنے مذہب پر قائم نہ رہو اور جیسے کہ نام اور صورت کے مسلمان ہو تو تمہارے علم سے جہل اچھا۔ تمہاری تہذیب سے بے تہذیبی بہتر، بلکہ سچ پوچھو تو تمہاری زندگی سے قوم کے لئے تمہاری موت اچھی۔ کیا خوشی ہو سکتی ہے ہم کو اس سے کہ تم عالم بن گئے۔ حکیم اور فلسفی ہو گئے۔ دنیا کے سارے علوم سیکھ لئے، یورپ کی نئی تحقیقاتوں اور یونان کے پرانے علموں میں استاد ہو گئے مگر مسلمان نہ رہے اور مسلمانی چھوڑ بیٹھے۔ جبکہ تمہارے دل میں اسلام ہی نہ ہو تو قوم تم پر کیا فخر کرے گی۔ تمہارا نام علماء اور حکماء میں دیکھ کر تمہارے بزرگ کیا خوش ہوں گے۔ تمہارے گلے میں خطابی تمغوں کے ہار پڑے ہونے سے کیا۔ کیا کوئی باپ اپنے بیٹے کو گود میں بٹھاتا ہے جبکہ اس کی جان نکل گئی ہو۔ گو وہ کیسا ہی خوبصورت اور پیارا کیوں نہ ہو۔ بس اسلامی کردار اس درسگاہ کی اور اسلام تمہاری جان ہے۔ اس کے بغیر کوئی کیسا ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہو جائے۔ وہ ایک مٹی ہے دبانے کے قابل اور ایک نعش ہے زمین میں چھپانے کے لائق۔" محسن الملک غصے سے کانپ اٹھے اور میرا سر جھک گیا۔

ہز ہائی نس سلطان شاہ محمد (آغا خاں مرحوم) جو ۱۹۲۵ء سے ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء تک مسلم یونیورسٹی کے پرو چانسلر رہے

مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ میں نے اپنے سوال سے محسن الملک کے دل کو تکلیف پہنچائی ہے۔ میں خاموش سر جھکائے بیٹھا تھا کہ انہوں نے نرم لہجہ میں کہا: "اور کچھ پوچھنا چاہتے ہو صاحبزادے؟"

میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا وہاں پر محبت اور شفقت کا دریا موجزن تھا میری ہمت بندھی اور میں نے رک رک کر سوال کیا: "کیا آپ کو کبھی کالج کی طرف سے تکلیف پہنچی؟"

میرا سوال سن کر وہ خاموش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے اور کچھ دیر کے بعد بولے "ہاں ایک بار ۱۹۰۰ء

ہز ہولی نس ڈاکٹر سیدنا ملّا طاہر سیف الدین مرحوم جو ۱۲ر اپریل ۱۹۵۳ء سے ۲۸ر اپریل ۱۹۶۵ء تک بارہ سال مسلم یونیورسٹی کے چانسلر رہے

میں یوروپین اسٹاف اور طلباء میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے یوروپین اساتذہ نے جو رویّہ اختیار کر رکھا تھا اس میں نفرت وحقارت کے جذبات نمایاں تھے۔ کسی نے طلباء کے ایک مربّی کو جو کالج کے قریب ٹہل رہے تھے ٹھوکر ماری۔ کسی نے مؤذن کو اذان دینے سے روکا۔ ۱۹۰۶ء میں طلباء نے اپنا نمائندہ شکایات کے ساتھ پرنسپل کے پاس بھیجا مگر وہ نمائندہ بورڈنگ ہاؤس سے نکال دیا گیا۔ حالات دن بدن بگڑتے ہی جا رہے تھے۔ آخر ۹ر فروری ۱۹۰۷ء کو یہ لاوا پھٹ پڑا۔ طلباء نے ہڑتال کر دی اس شورش کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن مقرر ہوا۔ کالج جو اب تک ایک وقار حاصل کر چکا تھا وہ سب ہڑتال کی وجہ سے مٹی میں مل گیا۔ یہ دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا میں یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکا اور میں نے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۰۷ء کے مارچ کی کوئی تاریخ تھی۔ ہاں یاد آیا۔ ۲۱ر مارچ کو میں نے استعفیٰ دیا تھا۔ استعفیٰ دینا تھا کہ ہر

طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ لوگ ملنے آئے کہ ایسے وقت میں استعفیٰ دے کر کالج کس پر چھوڑے جاتے ہیں۔ اور جب ہر طرف سے مجھ پر زور پڑا تو میں نے مجبوراً استعفیٰ تو واپس لے لیا مگر میرا دل بری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ میں اس حادثہ کے بعد بری طرح بیمار پڑ گیا۔"

"اُف کتنے دکھ سہے آپ نے اس کالج کے لئے!" میں نے دردبھرے لہجہ میں کہا۔ "بیماری کی حالت میں تو آپ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے ہوں گے؟"

"میں نے تو پوری کوشش کی تھی" وہ بولے "مگر کسی کو میری حالت پر رحم نہ آیا۔ مولوی عبداللہ جان جو کالج کے ہمدرد ٹرسٹی تھے، انہوں نے میری خیریت کے بارے میں مجھے خط لکھا تو میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میری طبیعت کا حال کیا پوچھتے ہو، آپ سب صاحب میری جان کے دشمن ہو کہ جو مجھے نجات نہیں دیتے۔ آپ صاحبان سمجھ لیں کہ میرا رنج اور

جمہوریہ ہند کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں۔ پیچھے سابق وائس چانسلر بدرالدین طیب جی کو بھی دیکھا جاسکتا ہے

سعید الملک ڈاکٹر نواب احمد سعید خاں آف چھتاری جو یکم مئی ۱۹۵۰ء سے دسمبر ۱۹۶۵ء تک پرو چانسلر رہے اور اس کے بعد ۱۹۶۵ء سے تادم تحریر یونیورسٹی کے چانسلر ہیں۔ مدظلہ العالی

غم اب نہ جائے گا جب تک میں کالج کا سکریٹری رہوں گا بہت گالیاں کھائیں۔ بہت آفات سہے۔ مگر اب نہ گالیاں کھانے کی طاقت اور نہ معزز ٹرسٹیوں کی طرف سے باضابطہ ذلیل ہونے کی ہمت ہے اور نہ کالج کو جنگ و جدل کا اکھاڑا بنانا منظور ہے۔ ورنہ میں بھی سینہ میں دل، منہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم رکھتا ہوں۔ چپ چاپ گالیاں سننا اور اپنے آپ کو باضابطہ اور علانیہ ذلیل ہونا گوارا نہیں کر سکتا مگر کم بخت مسلمان کچھ ایسے بدنام ہیں کہ میں کچھ بولوں تو پھر وہی زمانہ آجائے جو سید محمود کے زمانہ میں مرزا عابد علی بیگ صاحب نے پمفلٹ شائع کئے تھے۔ اس لئے بابا میں نالائق ہوں۔ مجھے نہ قوم کا درد نہ اپنے عہدے کی عزت کی پرواہ نہ لڑکوں پر رحم۔ انگریزوں کا غلام اور بے ایمان۔ مگر کیوں ایسے شخص کو رکھتے ہو خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ایسی حالت میں پہنچ گیا ہے کہ برداشت نہیں کر سکتا۔“ محسن الملک خاموش ہو گئے۔

اس قوم نے صرف سرسید کو ہی نہیں بلکہ ان کے ہر رفیق کو جس نے بھی قوم کی خدمت کا بیڑا اٹھایا، خون کے آنسو رلائے ہیں۔ محسن الملک جنہوں نے اپنا سب کچھ کالج کے لئے وقف کر دیا کیسے کیسے امتحانات سے گزرے خود کالج کے ٹرسٹی ہی ان کی جان کے دشمن بن گئے۔ مگر اس اولوالعزم انسان نے نامساعد حالات کے سامنے سپر نہ ڈالی۔ وہ برابر حالات کا مقابلہ جوانمردی سے کرتے رہے کیونکہ ان کی منزل نام و نمود نہیں تھی بلکہ وہ تو قوم کی الجھی زلفت کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے اور قوم کو بام عروج پر پہنچانا ہی ان کا مقصد حیات تھا۔

اکثر کہا جاتا ہے“ میں نے پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا؟ ”کہ موجودہ تعلیم فرقہ پرستی کو جنم دے رہی ہے اور اس کی مثال اس طرح سے دی جاتی ہے کہ اکثر فرقہ وارانہ فسادات ان ہی جگہوں پر ہوتے ہیں جہاں تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت ہے۔ یعنی گاؤں کے معصوم اور جاہل عوام اس فرقہ پرستی کے زہر سے کسی حد تک دور ہیں لیکن شہروں میں فرقہ پرستی کے مظاہرے اکثر ہوتے ہیں جہاں تعلیم عام ہے۔ کیا تعلیم ہی ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟“

محسن الملک نے چند لمحوں تک کچھ سوچا، جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر کہنا شروع کیا ”غدر (جنگ آزادی) سے پہلے جبکہ انگریزی تعلیم (موجودہ تعلیم) کا نام و نشان نہ تھا۔ دونوں قوموں میں برادرانہ اتفاق تھا۔ ایک دوسرے کو دوست سمجھتے تھے۔ شادی اور غمی کی تقریبوں میں دونوں ایک

آیاتِ قرآنی سے مزین یونیورسٹی مسجد کی حسین و جمیل محراب اور منبر

دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنے وطن میں دیکھا تھا کہ کوئی تقریب خوشی کی اور غمی کی ہندوؤں میں نہ ہوتی تھی کہ ہم مسلمان نہ بلائے جاتے ہوں اور کوئی جلسہ یہاں تک کہ عید بقرعید اور محرم کا ہم مسلمانوں میں نہ ہوتا تھا کہ جس میں ہندو شریک نہ ہوتے ہوں۔ دونوں قومیں شیر و شکر تھیں اور ایک برادری معلوم ہوتی تھیں۔ مگر میں

دیکھتا ہوں کہ جب سے انگریزی تعلیم نے ترقی کی ہے اور ہندوستانی کچھ تعلیم پانے لگے ہیں تب سے دوستی گھٹتی اور دشمنی بڑھتی جاتی ہے۔ کیا تعلیم نے جس سے اتحاد پیدا ہونے اور نفاق و اختلاف دور ہونے کی امید ہو سکتی تھی۔ یہ جھگڑا پیدا کیا ہے؟ کیا علم سیکھ کر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے متنفر ہونے لگے ہیں؟ مگر یہ ایک ایسا حقیقی واقعہ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ روز بروز تعصب بڑھتا جاتا ہے ایک دوسرے کو برا سمجھتے ہیں اور علانیہ بُرا کہتے ہیں۔ بعض گروہ تعلیم یافتوں کا اور بعض اخبار اور رسالے ہندوؤں اور مسلمانوں کے نفاق کی آگ مشتعل کرنے کے لئے ہی گویا پیدا ہوئے ہیں اور بجائے پانی کے اس آگ پر تیل ڈال رہے ہیں۔ اس نااتفاقی کو دونوں قوموں کے سمجھدار اور نیک دل آدمی رنج سے دیکھتے ہیں اور نہایت افسوس کرتے ہیں کہ تعلیم کا تو نتیجہ یہ نہ ہونا چاہئے اور چونکہ نتیجہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس لئے سوائے اس کے اور کیا سمجھا جائے کہ یہ ناقص تعلیم کا ہی نتیجہ ہے۔ کامل تعلیم نے جن کے دلوں پر اثر کیا ہے وہ اس گناہ سے پاک ہیں مگر بہت سے مدعیان تعلیم ایسے ہیں کہ مسلمانوں کے بزرگوں، ان کے بادشاہوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کو ایسے بُرے الفاظ میں یاد کرتے ہیں کہ سننے والے کا خون جوش میں آجاتا ہے۔ مسلمان بھی کچھ کمی نہیں کرتے۔ یہ ایک نہایت بدنصیبی کی نشانی ہے اور دونوں قوموں کے لئے یہ باتیں شرم کے لائق ہیں۔"

"دونوں فرقوں کے سب ہی لوگ تو متعصب نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "فسادات تو غنڈوں میں ہوتے ہیں جو نہ

مہاراجہ علی محمد خاں آف محمود آباد، دسمبر ۱۹۲۰ء سے فروری ۱۹۲۳ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں یکم جنوری ۱۹۲۴ء سے ۱۲ دسمبر ۱۹۲۶ء تک یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے

ہندو ہوتے ہیں اور نہ مسلمان ایسے لوگوں کا تو کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ مگر یہ لوگ آئے دن کے فسادات سے دونوں فرقوں کے سمجھدار لوگوں کے دلوں میں بھی نفرت کا بیج بو دیتے ہیں اس طرح سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ایک غار بنتا جا رہا ہے حالانکہ کچھ لوگ اس غار کو بھرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اختلافات ہیں کہ بڑھتے ہی جاتے ہیں آخر کس طرح یہ غار بھرے گا؟"

میرے لہجہ کی حسرت کو سمجھتے ہوئے محسن الملک نے بتاتے ہوئے کہا " میں دیکھتا ہوں کہ جو غار ہندو اور مسلمانوں کے بیچ حائل ہے بعض نیک دل اور ملک دوست اس پر پل باندھنے اور اس کو ہموار کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں اور اس کے لئے نصیحت کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے روز بروز وہ غار زیادہ گہرا، زیادہ چوڑا ہوتا جاتا ہے۔ زبان سے کہا جاتا ہے کہ اینٹ لاؤ، چونا لاؤ اور اس غار کو برابر کرو۔ مگر ہاتھ میں پھاوڑے اور کدال ہیں اور بجائے بھرنے کے وہ غار اور گہرا و وسیع کیا جاتا ہے۔"

" تو پھر اس سلسلہ میں کیا کیا جائے؟" میرے لہجہ میں حسرت برقرار تھی۔

"ان لوگوں کو" محسن الملک نے کہا " جو درحقیقت اتحاد کے خواہاں ہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس مہلک بیماری کا علاج زبان سے نہیں ہو سکتا بلکہ ہاتھ سے۔ یہ اختلاف پلیٹ فارم پر فصیح و بلیغ لیکچر دینے سے دور نہیں ہو سکتا بلکہ وجوہ اختلاف پر غور کرنے اور اس کے دفع کرنے کی تدبیروں کے عمل میں لانے سے ہو سکتا ہے"

" دیکھئے دراصل ہندوؤں کی چند سیاسی پارٹیاں ہی اس قسم کا زہر پھیلاتی ہیں اور پھر جب ان نقصان اٹھاتے ہیں تو وہ بھی ...؟

نواب سر محمد مزمل اللہ خاں ۔ مارچ ۱۹۲۲ء سے ۱۲ر دسمبر تک اور اس کے بعد یکم جنوری ۱۹۲۳ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۶ء تک (ایکٹنگ) وائس چانسلر رہے

سر سید مرحوم کے پوتے سر سید راس مسعود جو ۹ر فروری ۱۹۲۹ء سے یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء تک یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے
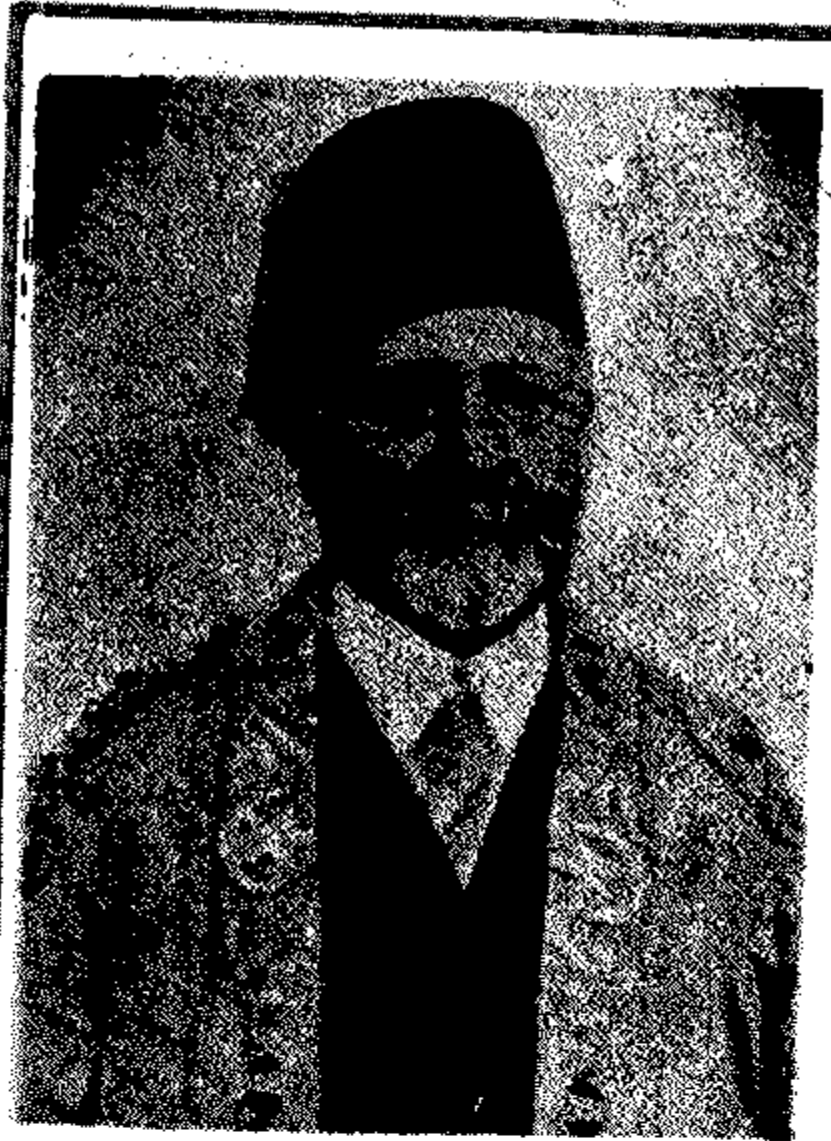
ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء سے ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء تک اس کے بعد ۲۴ اپریل ۱۹۴۷ء سے ۷ اگست ۱۹۴۷ء تک یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے

"میرے عزیز!" محسن الملک نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "دوسروں پہ الزام رکھ دینے سے کام نہیں چلتا ہے۔ یاد رکھو! تم ہرگز سر سید کے پیرو نہ سمجھے جاؤ گے اور نہ تم تعلیم یافتہ کہلائے جانے کے مستحق ہو گے اگر تم نے اس زہریلے مادے کو اپنے جسم میں سرایت ہونے دیا اور تم نے کبھی ہندو مسلم میں فرق کیا۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا نقصان نہ صرف تم کو ہوگا بلکہ تمہاری ساری قوم کو ہوگا۔ اور نہ صرف تم بدنام ہو گے بلکہ یہ کالج (مسلم یونیورسٹی) بھی بدنام ہوگا اور ہم پہ اس کا الزام آئے گا۔ مجھے نہایت روحانی تکلیف ہوتی ہے جب میں بعض اخباروں میں دیکھتا ہوں کہ علی گڑھ پارٹی متعصب ہے اور اس کے تعلیم یافتہ نوجوان ہندوؤں کے مخالف ہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہاں تک صحیح ہے مگر اس کا خیال یا عمل اس پہ ہو تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ سبق تم کو کس نے سکھایا؟ کیا مرحوم سر سید نے؟ اور کیا ہم نے؟ حاشا و کلا۔ نہ سر سید نہ ہم اس کے ملزم ہیں بلکہ برخلاف اس کے ہم نہایت حقارت و نفرت سے ایسی باتوں کو دیکھتے ہیں۔"

"دراصل ہم پہ الزام لگانے والے وہ ہیں مسلم یونیورسٹی کا وجود جن کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ ورنہ اس تعصب سے ہم لوگ بہت دور ہیں۔ مسلم یونیورسٹی تو محبت کدہ ہے جہاں نہ کوئی ہندو ہے نہ کوئی مسلمان بلکہ سب مادر درسگاہ کی آغوش کے پھول ہیں یہاں کے ہندو مسلم طلبا میں کوئی اختلاف نہیں ہم سب بھائی بھائی کی طرح مل جل کر رہتے ہیں اور یہ قومی یکجہتی فرقہ پرستوں کو کھٹکتی ہے اسی لئے وہ ہم پر فرقہ پرستی کا بے بنیاد الزام لگاتے ہیں" میں ایک ہی سانس میں کہہ گیا

"میرے عزیز!" محسن الملک نے کہا "میرا پیغام اپنے ساتھیوں

→ سر شاہ سلیمان ۹ فروری ۱۹۲۹ء سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء تک اور یکم مارچ سے ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء تک اس کے بعد ۱۴ اپریل ۱۹۴۶ء سے ۲۳ اپریل ۱۹۴۶ء تک یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے

تک پہنچا دو اور سنا کہ اے میرے عزیز بچو! کبھی ایسے (فرقہ پرستی کے) خیال کو تم دل میں نہ لانا کبھی ایسی بات کو جس سے جھگڑا پیدا ہو، سنو ہندوؤں کو اپنا بھائی سمجھو۔ ان کے بزرگوں کو عزت اور ادب سے یاد کرو۔ ان کے ساتھ محبت اور اخلاق سے پیش آؤ۔ ان کے ساتھ سچا دوستانہ برتاؤ کرو جس سے وہ خود شرمندہ ہوں وہ تمہارا تحمل اور تمہاری دوستی دیکھ کر تمہاری قدر کریں۔ وہ تمہارے بزرگوں کو نیکی سے یاد کرنے لگیں اور بجائے بدی کے نیکی کا برتاؤ دیکھ کر وہ خود اپنے طرز عمل کو بدلنے پر مجبور ہوں۔ یہ انصاف کی بات نہیں کہ تم اپنے آپ کو معصوم اور پاک سمجھو اور اختلاف کے سارے گناہ کا الزام ہندوؤں کو دو۔ تم اس کالج (مسلم یونیورسٹی) کے نیک نام طالب علم اور سرسید کے سچے مقلد اور ہمارے پیارے عزیز اسی وقت سمجھے جاؤ گے جبکہ تم اپنے ہموطنوں، اپنے بھائیوں کی ناگوار باتوں سے چشم پوشی کرو اور ان کی اچھی باتوں کو دل سے سنو۔ ان ناقص تعلیم یافتوں کو نہ دیکھو جو اختلاف پیدا کرنے کے خواہاں ہیں بلکہ ان عالی دماغ ہندوؤں کی باتیں سنو جو اتحاد اور اتفاق بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

محسن الملک نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "اے خدا! تو ہندو اور مسلمانوں پر رحم کر اور دونوں کے تعلیم یافتوں کو توفیق دے کہ وہ عناد کی اس آگ کو بجھا دیں نہ کہ اس کو تیز کریں۔" ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ان کے آنسوؤں میں میں نے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس کیا: "آئیے چلیں درسگاہ کی طرف" میں نے خود کو سنبھال کر جلدی سے کہا۔ وہ ایک ٹک بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے رہے

←

نواب محمد اسمٰعیل خاں یکم اکتوبر ۱۹۳۳ء سے ۱۹ اپریل ۱۹۳۵ء تک اور پھر ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے ۹ نومبر ۱۹۴۸ء تک وائس چانسلر رہے

مسٹر زاہد حسین ۲۴ اپریل ۱۹۴۷ء سے ۷ اگست ۱۹۴۷ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم
۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء سے
۱۵ر ستمبر ۱۹۵۶ء تک
مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے
(آپ اعزازی خزانچی کے عہدے پر بھی ۲۰ر نومبر ۱۹۴۸ء
سے ۱۲ر جولائی ۱۹۴۹ء تک مامور رہے

پھر دھیرے سے بولے "اب بہت دیر ہو چکی ہے مجھے واپس جانا ہے۔ وہاں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ میں پھر آؤں گا"

"کب۔؟" میں نے سوال کیا۔

"اس وقت جب تمہاری آنکھوں میں مایوسی کے بجائے خوشی کی چمک ہوگی" یہ کہہ کر محسن الملک غائب ہو گئے۔

پھر وہی خاموشی ہے وہی سیاہی ہے۔ وہ دور روشنی کی کرن کیسی ہے؟ اس ویرانے میں یہ ننھی سی کرن؟ ـــ تیز ہوا چلنے لگی ہے ـــ تیز ـــ اور تیز ـــ ہوا نے آندھی کی شکل اختیار کر لی ہے اور دور ایک بزرگ کے مزار پر ایک شمع آندھی کا مقابلہ کر رہی ہے۔ تیز ہواؤں میں شمع کی لو لرز رہی ہے۔ مگر آندھی کے بھیانک جھونکے اس شمع کو بجھا نہیں پا رہے ہیں۔ تیز ہواؤں نے شمع کو اپنے حلقہ میں لے لیا ہے۔ شمع کے گرد ہواؤں کا زور بڑھ رہا ہے۔ شمع کی لو بری طرح لرز رہی ہے مگر ہواؤں کا مقابلہ کئے جا رہی ہے ـــ لیکن کب تک؟

(محسن الملک کے خطوط مضامین اور لیکچروں سے) ●●

ایک یادگار فوٹو: مرحوم ملّا طاہر سیف الدین سابق چانسلر
نواب چھتاری (موجودہ چانسلر) کے ساتھ

علی گڑھ کی روایات

مرتبہ :- پروفیسر خلیق احمد نظامی
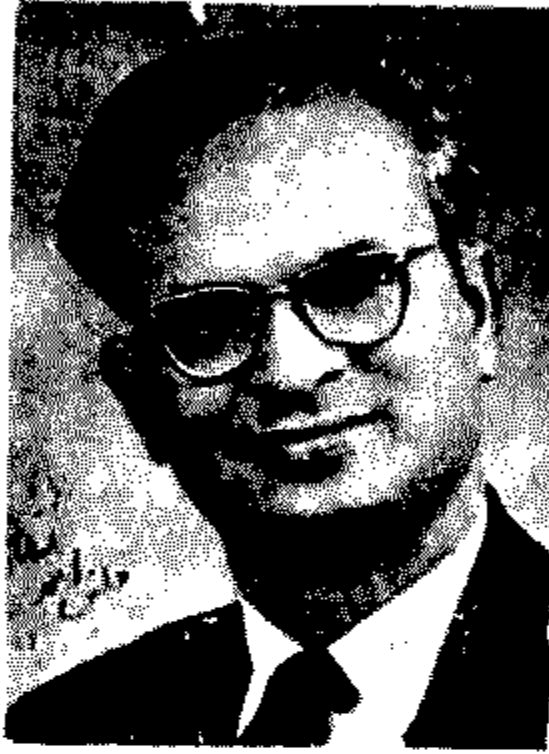
سنہ ۱۹۷۰ء میں یونیورسٹی کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک کتاب " علی گڑھ کی روایات " شائع کرنے کا ارادہ تھا۔ اور اس سلسلہ میں کافی مواد بھی جمع ہو گیا تھا۔ جوبلی ملتوی ہوئی تو کتاب کی طباعت کا خیال بھی ذہن سے اُتر گیا۔ یہ صفحات اسی کتاب کے ہیں اور مدیر ھما کے اصرار پر اس کتاب کا مسودہ ناظرین ھما کے لئے ان کے حوالے کر رہا ہوں (نظامی)

بانیٔ درس گاہ کی آرزوئیں اور قوم کی امیدیں ہماری روایات کی بنیاد ہیں

نواب محسن الملک نے ایک بار طلبار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔!

میرے عزیزو! تم درحقیقت دنیا میں ایک نئے مسلک اور نئے نظام کا نمونہ ہو۔ سارے ملک کی نگاہیں تم پر ہیں۔ اور تمام قوم کی امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔ اور تم اگرچہ اس دور میں شاگردی کے درجہ پر ہو مگر تم ہی آنے والی نسل کے استاد اور رہبر اور پیشوا ہونے والے ہو اور تم ہی کو آئندہ نسلوں کے اس سوال کا جواب دینا پڑے گا کہ کس طرح تم نے اپنے فرائض ادا کئے اور کس طرح تم نے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے راستہ صاف کیا۔ اور تم ہی کو اپنے طریق عمل سے یہ بتانا ہے کہ تم نے کہاں تک اپنے پیشوا اور اپنے بزرگ سرسید کی آرزوؤں کو پورا کیا۔ تم جانتے ہو کہ ان کی کیا آرزو تھی، اور تم کو معلوم ہے کہ وہ تم سے کیا امید رکھتے تھے۔ اگر تمہیں معلوم نہ ہو یا تمہیں یاد نہ رہا ہو تو میں تم کو یاد دلاتا ہوں۔ انہوں نے ایک موقع پر اسی مدرسہ کے بورڈروں کے خط کے جواب میں یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ

" اے میرے بچو اور میرے قومی پھولو! میری زندگی اور موت تمہارے لئے ہے۔ تم یقین جان لو کہ اگر تمہاری حالت دین و دنیا میں اچھی ہوگی تو میں اپنی قبر میں نہایت خوشی اور آرام سے دلہن کے سونے کی مانند سوؤں گا اور خدا کا فرشتہ مجھ کو کہے گا کہ نم کنومتہ العروس، اور اگر خدانخواستہ تمہاری حالت دین یا دنیا میں اچھی نہ

یونیورسٹی کانووکیشن کے چند مناظر دائیں سے بائیں مولانا قاضی مظہرالدین احمد بلگرامی (دینیات)، پروفیسر سید انوار الحق حقی (فیکلٹی آف سوشل سائنس) پروفیسر فخرالدین احمد (فیکلٹی آف سائنس) پروفیسر مطلوب احمد انصاری (فیکلٹی آف آرٹس) پروفیسر قمرالحسن فاروقی (فیکلٹی آف کامرس) اور دوسرے معلمین یوپی کے سابق گورنر مسٹر بی گوپالا ریڈی کانووکیشن ایڈریس پڑھ رہے ہیں۔ مسٹر محمد یونس آف چھتاری حافظ احمد سعید خاں کے ساتھ کانووکیشن میں شرکت کیلئے تشریف لا رہے ہیں

ہوگی تو قبر میں بھی مجھ کو چین نہ ہوگا۔"

(لکچر، سٹڈنس یونین کلب۔ ۱۵ جون ۱۹۰۰ء ص۱۵)

یہاں کے طلباء کو دو امتحان دینے پڑتے ہیں
ایک علمی دوسرا اخلاقی

نواب محسن الملک نے طلباء سے کہا۔

"تم کو یہاں دو قسم کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک علمی دوسری اخلاقی۔ اور دونوں چیزوں میں تم امتحان دینے کے لئے تیار کئے گئے ہو۔ پہلے قسم کے امتحان کا دارالامتحان یونیورسٹی ہے اور دوسری قسم کا امتحان جہاں لیا جاتا ہے وہ تمہارا گھر، اور تمہارا شہر اور تمہارا ملک ہے ــــ علمی امتحان کے نتیجے محدود ہیں اور اخلاقی امتحان کے نتیجے غیر محدود۔ تم میں سے ہر ایک پہلے امتحان کو مشکل سمجھتا ہے اور اسی کے لئے محنت کرتا ہے اور اسی کی کامیابی یا ناکامیابی پر خوش یا رنجیدہ ہوتا ہے مگر درحقیقت دوسرا امتحان نہایت مشکل ہے اور اصلی خوشی اسی امتحان کی کامیابی پر موقوف ہے۔"

(لکچر ۱۵ جون ۱۹۰۰ء سٹڈنس یونین کلب ص۲۰۳)

اتحادِ قومی کا نمونہ:۔ سید مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں سرسید نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"اے حضرات! گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے اسی لئے اسی کا گیت گایا جاتا ہے ورنہ ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ اس وقت اس کے علانیہ دو ثبوت موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمد محمود اور مسٹر راس سے نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے۔ جب سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر راس اور ان کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے، جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے اپنا نام اس کو دیا اور ہم نے نہایت خوشی سے ان کا نام اس کے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی سبب سے اس کا نام سید راس مسعود قرار پایا۔

* دوسرا نمونہ (راجہ جے کشن داس بہادر کی طرف نہایت جوشِ محبت کے ساتھ اشارہ کرکے کہا) ہمارا یہ ڈاڑھی

منڈا دوست یہاں موجود ہے اور سید راس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھاتے ہوتے ہے۔ ان کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں اور سید محمود ان کو "چچا" کہتے ہیں اور سید راس مسعود "دادا ماجد"۔ بس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھتے ہیں کچھ بھی فرق نہیں کرتے۔"

(حیات جاوید ج ۲ ص ۹۹-۲۹۸)

اعتراف جرم کا انداز:- ایم اے او کالج کے طلبا میں ایک شورش ہوئی۔ عزیز مرزا (والد ڈاکٹر بابر مرزا سابق صدر شعبہ حیوانیات) نے جو اس زمانہ میں طالب علم تھے اس میں خاص حصہ لیا اور کالج سے نکال دیئے گئے۔ علی گڑھ چھوڑ کر حیدرآباد چلے گئے اور وہاں ملازمت کرلی پہلی تنخواہ ملی تو سرسید کو خط لکھا

" عالی جناب آداب

زمانہ سابق کے حالات پر غور کرتا ہوں تو شرم سے گردن نہیں اٹھا سکتا مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی دامنگیر ہے کہ اگر خاموشی کے دامن میں پناہ لیتا ہوں تو خدا کو کیا جواب دوں گا کہ ــــ کیا رنج اپنے باپ سے زیادہ مربی کو پہنچایا ہے؟ میرا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ جس کالج کے آغوش میں تربیت پائی تھی اس کا ہوا خواہ اور معاون ہوتا لیکن افسوس ہے کہ کچھ عرصہ تک میں نے اس کے خلاف کوشش کی جس کی سزا یہ ہے کہ میں خود اپنے افعال پر گریاں ہوں۔ گو اس وقت ہزار کوس کے فاصلہ پر پڑا ہوں لیکن اے سید والا اپنے مبارک قدم اٹھا کر دیکھئے، کسی پشیمان کا سر آپ کے قدموں میں پڑا ہوگا! ہمارے ایشیائی شاعروں نے اپنے محبوں کو نامے خون جگر سے لکھے ہیں لیکن اس وقت یہ عریضہ آب خجالت سے لکھا ہوا ہے۔ اور قسم ہے اس نورانی ریش کی اور اس دل فریب رگ ہاشمی کی جس کو میں نے ہمیشہ شوق و تعظیم کی نگاہ سے دیکھا ہے کہ کبھی شاعروں کے دل پر ایسا اثر نہ تھا جیسا کہ اس وقت میرے دل پر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پشیمانی مجھ کو اس وقت تک مہلت نہ دے گی جب تک یہ سر جس نے سرکشی کی تھی آپ کے قدموں پر نہ جھکے میں اس وقت تک اپنے کو ننگ قوم سمجھوں گا جب تک اس صدمہ کی جو ہماری نادانی سے قومی کالج کی شاخ نونہال پر پہنچا ہے تلافی نہ کروں میں اس وقت تک انسانیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا جب تک کہ میں اپنے رہبر قوم سرسید کی یاد سے اس طوفان بے تمیزی کو محو نہ کردوں۔ مجھ کو یاد ہے کہ اس زمانہ میں میں کالج کے خلاف مضمون اخباروں میں لکھنے پر فخر کرتا تھا لیکن اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے وہ مضامین بری نفسیات پر مبنی تھے۔ میں خوب واقف ہوں کہ میں نے طلبا کو پوشیدہ جلسوں میں جمع کیا اور ان کی نوجوان طبیعتوں کو اپنی طاقت لسانی سے برانگیختہ کیا لیکن اس وقت میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے انصاف کا خون کیا۔ احسان کی گردن کاٹی اور حق کو پامال کیا۔ غرض کہ اس وقت اپنے جس فعل پر غور کرتا ہوں وہ ندامت سے خالی نہیں، ہر چند چاہتا ہوں کہ ان افعال کی تلافی کروں لیکن اب وہ میرے قبضۂ قدرت سے باہر ہیں میں اس وقت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آپ سے عفو تقصیر چاہوں اور آئندہ مدرسہ کی خیر خواہی اور امداد کو اپنا فرض نہیں تو واجب ضرور سمجھوں۔

اے سید والا! جو جوش ایک سال کی گمراہی کے بعد اس وقت پیدا ہوا ہے وہ اس قدر ہے کہ اگر کئی صفحے لکھوں تو تھوڑا ہے لیکن آپ کے عزیز وقت کا خیال کر کے بس کرتا ہوں، آپ کے کریمانہ اخلاق سے امید ہے کہ آپ میری ان حرکات کو جن کا میں نے خود اقرار کیا ہے معاف فرمائیں گے اور مجھ کو بار ندامت سے سبکدوش کریں گے۔

میری یہ تمنا تھی کہ اپنی پہلی تنخواہ اس کالج کی نذر کروں استدعا کرتا ہوں کہ میری عرض قبول فرمائی جائے۔"

آپ کا تابعدار — عزیز مرزا

علی گڑھ کیا سکھا سکتا ہے:- ڈاکٹر ذاکر حسین نے علیگڑھ

کے متعلق ایک خطبہ میں کہا تھا :-

"یہاں بہت کچھ سیکھا، اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پر دستگیر ہونا سیکھا، ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلافات کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے، بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا، اپنی قومی زندگی کے سارے عیب برملا دیکھے پر اسکے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں، اسکی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل پر اُبھرتا ہوا محسوس کیا، اپنی خام تند مزاجیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا، سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری سے بھڑک اٹھنے، مگر بجھے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا، صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشوونما دے سکنے کے لئے ان میں زندگی کی تند اور تیز ہواؤں سے بچانے کی حکمت، مگر سیرت کی تعمیر کے لئے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی ضرورت بھی یہیں پہچانی، خلوت وجلوت کی جدا جدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا، یہیں فرمانبرداری سیکھی، ادب سیکھا، بڑوں کا ادب، ہمچشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب اور خود اپنا ادب، سعادتمندی اور وفاشعاری کے ساتھ خود اختیارانہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی، باغی بنے، نکالے گئے، دوسری بستی بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی، مگر اس مادر علمی کی طرف سے دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی، بن باس میں بھی دل اس میں اٹکا رہا۔ حالات بدلے، ملک آزاد ہوا، یہاں کا نظام بھی بدلا، ذمہ دارانہ حیثیت سے اسکی خدمت کا موقع میسر آیا۔ بری بھلی جو بن پڑی خدمت کی اور امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سرِ شوریدہ کو یہیں بالیں آسائش نصیب ہو جائے گی مگر یہ مقدر نہ تھا، صحت کی خرابی فرائض کی انجام دہی میں مخل ہوتی رہی، بالآخر محبت پر فرض داری کے احساس نے غلبہ پایا اور میں آپ سے رخصت ہو گیا۔ آج کاسۂ دل کہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا بھی ہے۔ اس سب پر جو یہاں سے پایا شکر گزاری سے بھرا ہوا ہے اور ان تمام کوتاہیوں پر جو دانش گاہ عزیز کی خدمت میں رہ گئیں شرمساری سے بھی چھلک رہا ہے۔ میرے لئے تو اس دانش گاہ سے وابستگی کی یاد ہی زندگی کا بڑا انعام ہے، آپ اس پر اس اعزاز کا اضافہ کر رہے ہیں۔

من ہوئے مست وساقی پُر دہد پیمانہ را"

(مسلم یونیورسٹی گزٹ (ذاکر نمبر) ۲۴ فروری ۱۹۵۷ء)

استاد کا ادب:- مولوی عنایت اللہ (مولانا ذکاء اللہ دہلوی کے بیٹے) مدرسۃ العلوم میں پڑھتے تھے انکی فارسی کی کلاس مولانا شبلی پڑھاتے تھے۔۔۔۔ کلاس میں ان کا جی نہ لگتا تھا۔ مولانا شبلی انکو اکثر ڈانٹا کرتے تھے اور ان کے والد سے بھی شکایت کرتے رہتے تھے۔ مولوی عنایت اللہ کو بھی مولانا شبلی سے ضد ہو گئی تھی۔ ان کی نظموں کو مذاقیہ انداز سے ہوسٹل کے ہر کمرے کے پاس کھڑے ہو کر پڑھا کرتے تھے۔ مولانا شبلی کو جب خبر ہوئی اور زیادہ خفا رہنے لگے۔ لیکن یہ ساری آزردگی ایک معمولی سی بات پر جاتی رہی۔

"ایک روز وہ (مولانا شبلی) چاندنی چوک دہلی میں کسی دوکان سے جوتے خرید کرنے جا رہے تھے کہ میری نظر ان پر پڑی۔ میں نے ان کو سلام کیا اور بڑھ کر ان کے ہاتھ سے جوتے لے لئے کہ میں قیام گاہ تک پہنچا دوں بس بے حد خوش ہو گئے اور کہنے لگے کہ شریف خاندان کے بچوں سے اسی قسم کے اخلاق کی توقع ہوتی ہے؟"

(علی گڑھ میگزین، علی گڑھ نمبر ج ۲ ص...)

یہاں طلبار کیسی انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم کرتے تھے

سٹوڈنٹس کلب :۔ ۱۸۸۴ء میں اس لئے قائم ہوا تاکہ طلبا تقریر میں مہارت پیدا کریں اور اخبارات کے مطالعہ سے اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔

انجمن اخوان الصفا :۔ ۱۸۸۹ء میں اس لئے قائم کی گئی تاکہ طلبار کی زندگی میں پاکیزگی پیدا کی جائے۔ ان کی علمی

کا ایک فی صد کالج کی امداد کے لئے دینے کا وعدہ کرتے تھے۔

اسی جماعت نے قدیم طلبار کو باہر سے مدعو کر کے سالانہ ڈنر دینے کی ابتدا کی۔ گویا کہ کالج قائم ہونے کے سترہ سال بعد قدیم طلبار کو مادر درسگاہ میں دعوت دیکر ان کے ساتھ مستقل تعلقات قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

طلبار کی امداد کا صیغہ راز میں رہنا :۔ ۱۸۸۱ء میں

مسلم یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹس یونین ہال

قابلیت بڑھائی جائے اور آپس میں برادرانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

ڈیوٹی سوسائٹی :۔ ۱۸۹۰ء میں اس لئے قائم کی گئی تاکہ علی گڑھ کالج کی نسبت ملک میں غلط افواہوں کو دور کیا جائے اور اس کی اصلی خوبیوں کی اشاعت کی جائے۔ بعد کو اسی سوسائٹی نے طلبار کی مالی امداد کے لئے چندے جمع کئے۔

برادرہڈ :۔ ۱۸۹۲ء میں قائم ہوئی، اس کے ممبر اپنی آمدنی
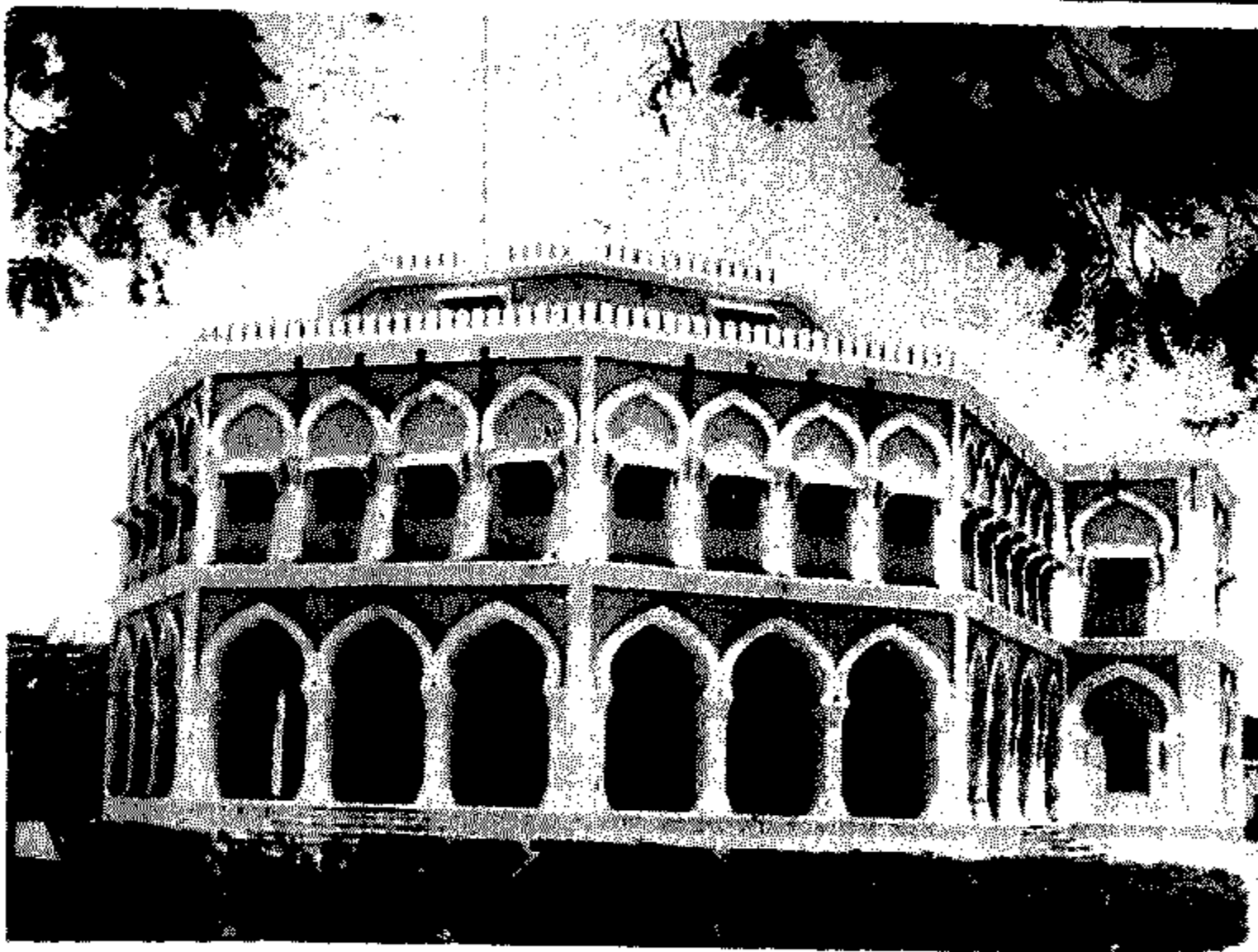
بورڈنگ ہاؤس مدرسۃ العلوم کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے سرسید نے فرمایا۔

"جو رازداری اس امداد کے صیغے میں کمیٹی نے ابتدا سے اختیار کی ہے وہ اب تک قائم ہے اور آئندہ بھی باحتیاط تمام قائم رکھی جاتی ہے۔ ان قابل رحم مسلمان طالب علموں میں جو بورڈر ہیں وہ عام بورڈروں کے ساتھ ساتھ

حقوق سے بسر کرتے ہیں، منیجر اور بعض خاص
متعلقین کے سوا کسی شخص کو یہ معلوم نہیں ہے
کہ امدادی طالب علم ان میں سے کون سے
ہیں، یہاں تک کہ ہر وقت پاس بیٹھنے والے
طالب علموں کو بھی اس کا کچھ علم نہیں ہے"
(رپورٹ سالانہ ص۱۵)

روشنی محلوں کے اندر ہی رہے جس کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھئے
ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سرخ رو دنیا میں وہ حاجت روا بندے ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

اپنی مدد آپ ، سرسید کہا کرتے تھے۔
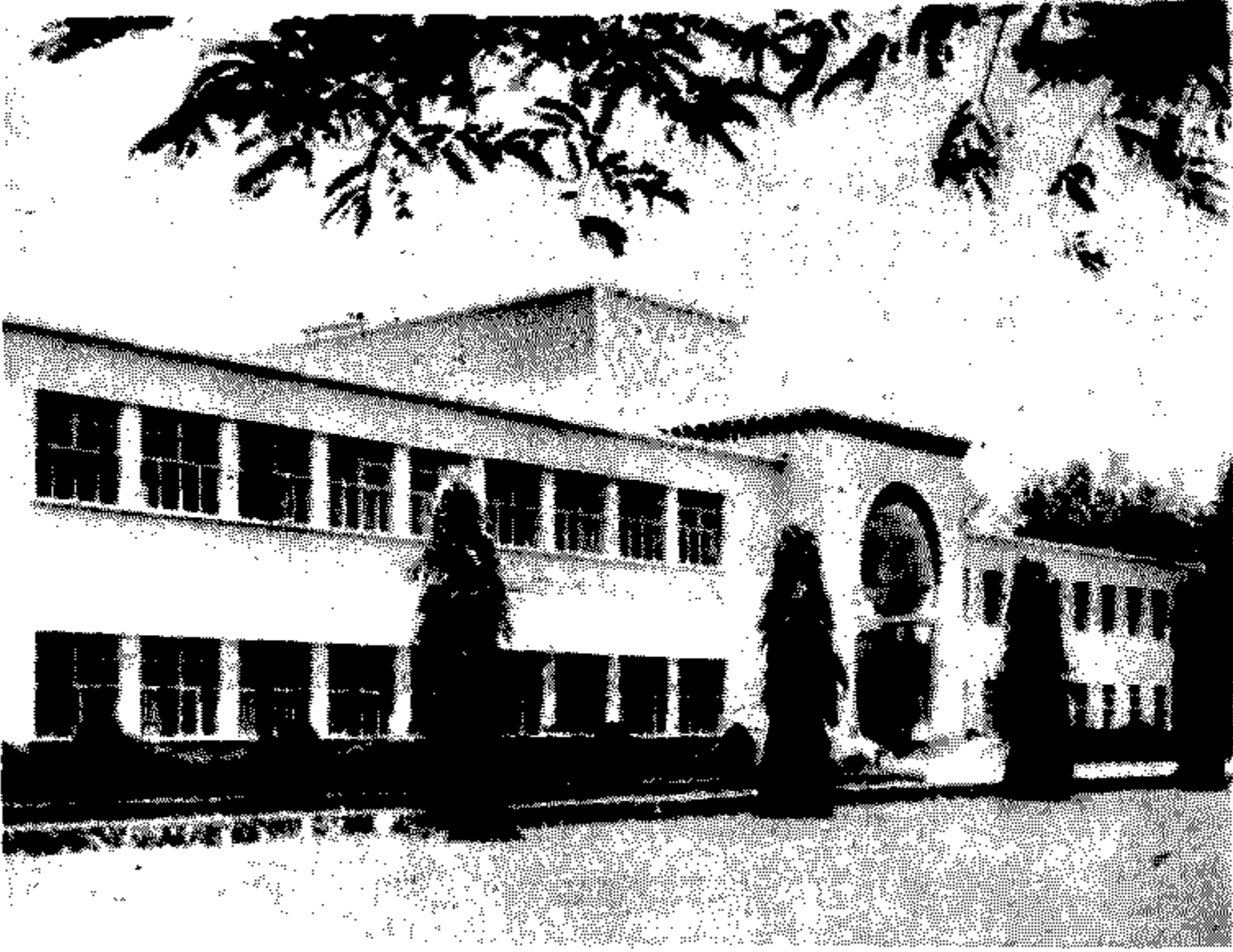
مولانا آزاد لائبریری کا ایک منظر

خدمتِ خلق کا جذبہ :- حالی نے علی گڑھ کو ایک بڑھیا
کے چراغ سے تشبیہ دی ہے اور لکھا ہے۔

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آسان گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لمپ سے

" انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں
کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے ، گورنمنٹ
فیاض ہو اور ہمارے سب کام کر دے۔
اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے
کی جاوے اور ہم خود نہ کریں "
ان کی اس تنبیہ سے متاثر ہو کر ایک مرتبہ پانی
کی کمی کو دور کرنے کے لئے طلبا نے خود ایک کنواں کھودا تھا

استادوں کی طلبا سے محبت ۔ مسٹر بیک پرنسپل
ایم اے او کالج اپنے طلبا سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان
کے ایک عزیز شاگرد احمد حسین خاں بی اے (مراد آبادی) کا
ستمبر ۱۸۸۹ء میں عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا۔ بیک
صاحب کو بے حد صدمہ ہوا۔ انہوں نے اپنے شاگرد کی مستقل
یادگار کے واسطے پانچ سو روپیہ دیا اور احمد حسین کا نام اسٹریچی
ہال میں کندہ کرایا۔

ڈپٹی حبیب اللہ خاں کا خیال تھا کہ ہندوستان کے
کسی کالج کے پرنسپل نے اپنے شاگرد کی کوئی یادگار اسطرح
قائم نہیں کرائی ہے۔

اختلاف رائے میں بھی احترام کا پہلو ۔ نواب
حبیب الرحمٰن خاں شیروانی لکھتے ہیں:۔

"میرا مشاہدہ ہے کہ (نواب وقار الملک) آخر وقت
تک تنہائی میں بھی سرسید کا ذکر اس ادب اور عقیدت سے
کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیلا اپنے گرو کا ذکر کرتا ہے
ایک واقعہ سنو ـــــ حیدر آباد سرسید ڈیپوٹیشن لیکر گئے ہیں
وہاں سے یہ مشورہ ہوتا ہے کہ ڈیپوٹیشن کی کامیابی کے لئے کیا
طریقہ اختیار کیا جائے۔ یہ ہز ہائینس میر محبوب علی خاں بہادر
کا عہد تھا۔ طریقہ کار میں محسن الملک اور وقار الملک کا اختلاف
ہوتا ہے۔ اور یہ اختلاف رائے ان دونوں ناموروں کے درمیان
عام تھا۔ سرسید محسن الملک کی رائے اختیار فرماتے ہیں، اسی
رائے پر عمل ہوتا ہے۔ باریابی ہوتی ہے۔ گرانٹ ایک ہزار
روپیہ ماہوار سے دو ہزار ہو جاتی ہے۔ سرسید واپس آکر اپنے
قیام گاہ کے کمرہ میں ہیں۔ عمائد حیدر آباد کا مجمع ہے کامیابی
پر مسرت و مبارکباد ہے۔ سرسید نے کہا کہ مشتاق حسین نے
مہدی علی کی رائے سے اختلاف کیا تھا۔ کامیابی انہی کی
رائے سے ہوئی۔ مولوی شبلی کی شہادت ہے کہ بھرے مجمع میں
وقار الملک اٹھے، گھٹنے ہوئے سر پر سے ترکی ٹوپی اتاری سرسید
کے سامنے سر جھکایا اور کہا کہ آپ بزرگ ہیں، اس چاند پر
جوتے ماریں، مگر عرض یہی کروں گا کہ وہ رائے غلط تھی۔ اگر
میری رائے اختیار فرمائی جاتی تو اس سے زیادہ کامیابی
ہوتی۔" "علی گڑھ کے مردکان کار"

علی گڑھ میگزین، جنوری ۱۹۲۹ء صفحہ ۲۲

درس گاہ کا پُر تاثیر ماحول ۔ حالی جب پہلی بار علیگڑھ
آئے تو ان کا دل اس درس گاہ سے جس قدر متاثر ہوا، اس
کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ہفتہ گذشتہ میں حسن اتفاق سے ہم کو علی گڑھ جانے
کا موقع ملا۔ ہم خوش قسمتی سے وہاں ایسی جگہ ٹھہرے تھے جہاں
سے مدرسۃ العلوم کا احاطہ بہت قریب تھا۔ یہ پہلا ہی موقع
مدرسۃ العلوم کے دیکھنے کا ہم کو ملا تھا۔ اگرچہ تعطیل کے سبب
مدرسہ بند تھا اور بیماری کی وجہ سے طلبا کی حاضری میں بھی کمی
تھی مگر جس قدر مدرسہ کی حالت ہماری آنکھوں کے سامنے
تھی اس سے بھی جو اثر ہمارے دل پر پیدا ہوا ہے اسکو ہم کبھی
فراموش نہیں کر سکتے۔ ہم بڑے بڑے مقدس واعظوں کی مجالس
وعظ میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہم نے اونچے اونچے منبروں پر نہایت
فصیح و بلیغ خطبے بھی سنے ہیں۔ ہم حالی وقال کی مجلسوں میں
بھی شریک ہوئے ہیں۔ ہم نے پیرانِ طریقت کے گرد مریدوں
اور طالب علموں کے حلقے بھی دیکھے ہیں اور ان کے دل
ہلا دینے والے نعرے بھی سنے ہیں، مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ جو قومی
مسرت اور اسلامی حمیت اس مدرسہ کو دیکھ کر خواہ مخواہ جوش
میں آتی ہے اور خاص کر ایک ایسے گنہگار مسلمان کے دل میں
جیسے کہ ہم ہیں وہ کسی دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی گئی۔ بلا
جو شعر نظیری نیشاپوری نے بیت اللہ کی زیارت کے وقت
پڑھا تھا وہ اس مدرسہ کو دیکھ کر ہمیں بھی یاد آیا اور بہت دیر
تک ہم اس کو اپنے دل میں پڑھ کر گنگناتے رہے۔

زیں کعبہ راہنانہ جبا طل نہادہ اند

صد معنی و جہاں ذوبی گل نہادہ اند

(علی گڑھ میگزین ۱۹۲۹ء صلا۲)

تحقیق کا جذبہ :- "آثار الصنادید" کی ترتیب میں جو دہلی کی تاریخی عمارتوں کا مستند تذکرہ ہے، سرسید نے جو زحمتیں کتبات کو پڑھنے کے سلسلہ میں اٹھائی تھیں، ان کے متعلق خود ان کا بیان ہے۔

"قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے
جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جاتے
تھے ان کے پڑھنے کو ــــ ایک چھینکا
دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی
بندھوالیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اُس
چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اتارتا تھا۔
جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا
صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے
تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر
ہو جاتا تھا۔" (حیات جاوید ج ۱ ص۵۵)

ہمدردیٔ خلق :- سنہ ۱۸۶۰ء میں سخت قحط پڑا۔ مراد آباد کے محتاج خانہ کا انتظام سرسید کے سپرد تھا۔ اس کا حال سنئے۔

" سرسید صبح شام دونوں وقت بلاناغہ محتاج خانہ میں خود جاتے تھے۔ ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے، جن کنگلوں کی صورت اور حالت آنکھ سے دیکھی نہ جاسکتی تھی، جن کے دست جاری ہوتے تھے، اور کپڑے بول و براز میں تھڑے ہوئے ہوتے تھے، انکو سرسید خود اپنی گود میں اٹھا کر دوسری جگہ احتیاط سے بیجا کر لٹا دیتے تھے۔ ان کے کپڑے بدلواتے تھے، سر منڈواتے تھے، ہاتھ منہ دھلواتے تھے، دوا پلواتے تھے اور نہایت شفقت سے ان کے ساتھ پیش آتے تھے۔ راجہ جے کشن داس کا بیان ہے کہ ــــ جس شفقت اور ہمدردی سے وہ اس وقت ہر مذہب اور ہر قوم کے محتاجوں کے ساتھ پیش آرہے تھے،

اس کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوگئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا آدمی ہے۔" (حیات جاوید ج ۱ ص۱۰۱)

قومی درد :- نواب محسن الملک کا بیان ہے :-

" جس تاریخ کمیٹی مذکور (خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان) کے انعقاد کے لئے جلسہ قرار پایا تھا، اس سے ایک روز پہلے میں بنارس میں پہنچ گیا۔ رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو ان کے پلنگ پر نہ پایا۔ میں ان کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ "اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہوسکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ پھر آپ ہی کہنے لگے کہ جو جلسہ کل ہونے والا ہے، مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات اسی اُدھیڑ بن میں گذر گئی ہے کہ دیکھئے کل کے جلسے کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔"

(بحوالہ حیات جاوید۔ ج ۱ ص۱۵۱)

حمیتِ دینی :- سر ولیم میور نے رسول مقبول صلعم کی سیرت پر کتاب لکھی اور اس میں تعصب اور تنگ نظری کے علاوہ غلط بیانی سے کام لیا۔ سرسید نے کتاب کو دیکھا تو تڑپ اٹھے۔ نواب محسن الملک کو خط لکھا۔

" ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا۔ اور مصمم

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی کی نئی عمارت

ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔"

انہوں نے نہ احتجاجی جلسے کئے، نہ شور مچایا، بلکہ علمی حیثیت سے ولیم میور کو وہ جواب دیئے کہ ان کے تعصب نے جو عمارت تعمیر کی تھی وہ منہدم ہو گئی۔ اس کام کیلئے سرسید نے جو اہتمام کئے تھے، ان کا اندازہ خود ان کے بیانات سے کیا جا سکتا ہے۔

"میں نے فرانس اور جرمن سے اور مصر سے کتب بیرٗ منگانی شروع کر دی ہیں، چٹھیات روانہ ہو گئیں۔ ایک آدمی مقرر کر لیا ہے جو لیٹن کا ترجمہ کر کر مضمون بتلا سکے۔

"خطبات احمدیہ لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔ آپ اس خط کے پہنچنے پر میر ظہور حسین کے پاس جائیے اور دونوں صاحب کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے۔ سود اور روپیہ میں ادا کر دوں گا —— ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دتی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسامان یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیجدو۔ کیا کہئے اس کتاب کے پیچھے خواب و
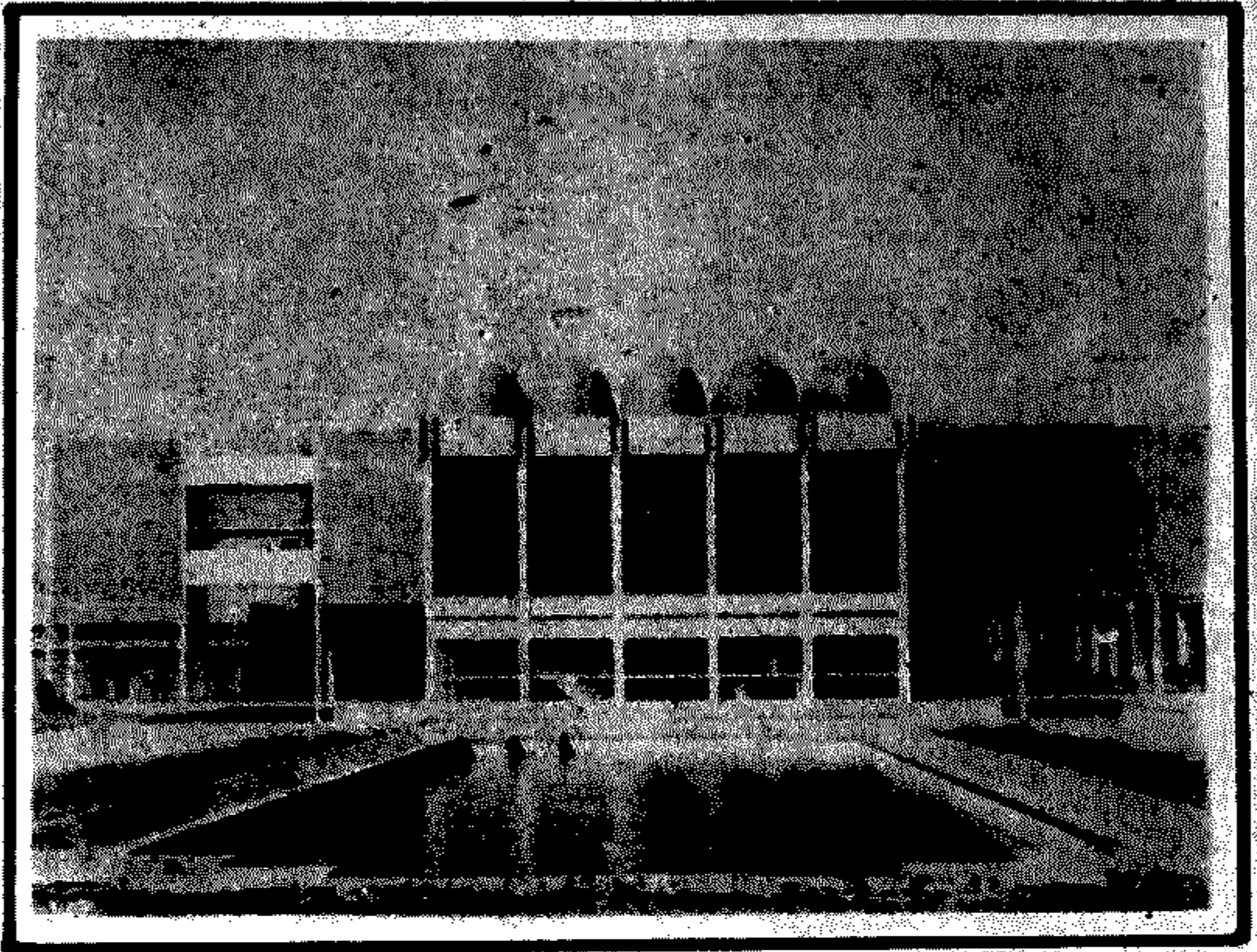
کینڈی ہال۔ میڈیکل کالج کی عمارت کے سامنے کا ایک دلفریب منظر

خود نزام ہو گیا ہے۔ خدا مدد کرے۔

"میں روز و شب تحریر کتاب سیر مصطفوی میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔

"میں اپنا حال آپ کو کیا لکھوں وہ سکتہ سا ہو گیا ہے دن رات کی تکلیف ہے۔ جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔

غیرتِ قومی:- فروری ۱۸۶۷ء میں جب کہ ڈرمنڈ صاحب اضلاع شمال مغرب میں لفٹیننٹ گورنر تھے، آگرہ میں ایک بہت بڑی نمائش ہوئی تھی اور سرسید بھی منتظم کمیٹی کے ایک ممبر تھے۔ دربار کا انتظام مسٹر پالک کلکٹر ضلع آگرہ کے سپرد تھا۔ صاحب موصوف نے نمائش گاہ کے قریب ایک میدان میں درباریوں کے لئے کرسیاں اس طرح بچھوائیں کہ جو مقام کسی قدر بلند تھا، کرسیوں کی ایک لائن تو اس مقام پر لگائی اور اس پر ایک شامیانہ بھی جس سے دھوپ لی روک ہو، کھچوا دیا، اور دوسری لائن اسی کے متوازی مگر اس سے ذرا نیچی جگہ پر لگوائی جس پر شامیانہ وغیرہ کچھ نہ تھا (اونچی جگہ پر انگریزوں اور نیچی جگہ پر ہندوستانیوں کو بٹھانا مقصود تھا) سرسید وہاں سے اپنے ڈیرے میں چلے آئے اور دربار میں شریک نہیں ہوئے۔" (حیات جاوید ج ۲ ص ۱۵۱)

عزتِ نفس اور خودداری:- وہ دلی میں دربار قیصری کے موقع پر جب کہ حضور نظام کو کالج کمیٹی کی طرف سے سپاسنامہ دیا گیا، سرسید اس کو خود صرف اس وجہ سے پیش نہ کر سکے کہ وہاں جوتا اتار کر جانا ضرور تھا۔ چنانچہ کمیٹی کے سامنے اور ممبروں نے سپاس نامہ پیش کیا اور سرسید ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔

بنارس کے کمشنر مسٹر پی کارمیکل سے وہ جوتا پہن کر آنے کی شرط پر ملے، حالانکہ کمشنر موصوف جوتا اتروائے بغیر کسی ہندستانی کو اپنے بنگلے میں نہ آنے دیتے تھے۔ مسٹر واٹسن جب تک علیگڈھ میں کلکٹر رہے، ہم نے سنا ہے کہ سرسید کبھی ان سے نہیں ملے، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ سید احمد خاں جوتا اتار کر ان کے کمرے میں جائیں، مگر انہوں نے اس کو منظور نہیں کیا ـــــ نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس رام پور کے یہاں صرف چندے کی غرض سے وہ اس وقت گئے تھے جبکہ مدرسہ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں تھا اور امداد کی نہایت اشد ضرورت تھی۔ نواب صاحب کے دربار کا قرینہ یہ تھا کہ وہ خود پلنگڑی پر بیٹھے رہتے تھے اور جو شخص ملنے جاتا تھا، اس کو فرش پر دوزانو بیٹھنا پڑتا تھا، ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے جب تک کرسی پر بیٹھنے اور جوتا پہنے رہنے کی اجازت حاصل نہیں کرلی، وہاں جانے کا ارادہ نہیں کیا۔" (حیات جاوید" ج ۲ ص ۴۸۲۰۸۴)

ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا احترام:- ایک سال بقرعید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک ہوکر ایک گائے قربانی کے لئے خرید لی۔ عین بقرعید کے دن نماز عید کے بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہے۔ یہ سن کر وہ از خود رفتہ ہوگئے۔ فوراً سوار ہونے کے لئے گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوٹھی سے کالج تک آدمیوں کی ڈاک لگادی۔ یہاں تک کہ وہ گائے طالبعلموں سے چھین کر اس کے مالک کو واپس دی گئی اور طالب علموں کو سخت ملامت کی اور آئندہ کے لئے قطعی ممانعت کردی کہ کالج کے احاطہ میں کبھی کوئی ایسا نہ کرے۔

(حیات جاوید ج ۲ ص ۵۴۹۔۵۵)

حاضر جوابی اور بذلہ سنجی:- سرسید آئے دن دوستوں سے قومی کاموں کے لئے چندہ طلب کرتے رہتے تھے۔ ایک دن ایک دوست سے چندہ لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کسی اور کام کے لئے چندہ کی ضرورت پیش آگئی، تو پھر ان سے چندہ کے طلب گار ہوئے۔ ان کا ذرا سا تامل دیکھا تو فوراً یہ شعر پڑھا ؎

گر مکرر ز لبت بوسہ گرفتیم مرنج
سُرخیِ لعل لبت بیں کہ چہ زیبا بود است

مولوی عبدالصمد خزانچی ریاست بھوپال راوی ہیں کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر (ضیاءالدین) صاحب کو کلاس لینے میں کسی قدر دیر ہوگئی۔ ہم سب انتظار کر رہے تھے مگر ایک شوخ طالب علم نے اسی حالت انتظار میں بورڈ پر یہ شعر لکھ دیا ؎

شہرہ بہت سنا ہے ریاضی میں آپ کا
طول شب فراق ذرا ناپ دیجئے

ڈاکٹر صاحب جب تشریف لائے اور یہ شعر لکھا ہوا دیکھا تو بورڈ پر ہی یہ جواب لکھ دیا۔

TO INFINITY (لامتناہی)

اور مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے اور کلاس کو بقیہ گھنٹہ کی چھٹی دے دی" (ضیائے حیات۔ محمد امین زبیری ص ۴۴)

برائی کا بدلہ بھلائی:- سرسید کو ان کی ماں نے ہدایت کی تھی کہ برائی کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی کرنا خود اپنے کو ویسا ہی بنانا ہے۔ اس تربیت کا اثر تھا کہ مراد آباد میں جب سرسید صدرالصدور تھے، ایک کلرک کو ان سے رنجش ہوگئی۔ وہ اکثر گمنام عرضیاں ان کی شکایت کی اعلیٰ افسروں کو لکھتا رہتا تھا۔ ایک بار جب کہ پولیس کا نیا انتظام ہوا تھا۔ اس نے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ایک عرضی لکھ بھیجی کہ صدر اعلیٰ کے بھتیجے نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے اور ان کے گھر میں اس کی لاش موجود ہے، فوراً تلاشی لی جائے اسی وقت پولیس کا عملہ ان کے مکان پر چڑھ آیا۔ سرسید نے

مکان میں پردہ کرا دیا اور تلاشی لی گئی، مگر چونکہ وہ شخص اتہام تھا کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ سرسید کو اس کا نہایت رنج ہوا مراد آباد کا کوتوال اس جرم میں کہ بغیر موجودگی مدعی کے تلاشی لی گئی، برخاست کیا گیا۔ سرسید اور ان کے اکثر دوستوں کو خوب معلوم ہو گیا تھا کہ فلاں کلرک نے یہ عرضی لکھی تھی مگر سرسید نے اس کی کچھ پروا نہیں کی۔ جب وہ غازی پور بدل گئے اور کسی وجہ سے وہ کلرک نوکری سے علیحدہ ہو گیا تو ایک موقع پر، جبکہ سرسید کے ایک معزز یوروپین دوست کسی اعلیٰ عہدہ پر ترقی پا کر غالباً سنٹرل انڈیا کو جاتے تھے اور جاتے ہوئے غازی پور میں ٹھہرے تھے، ان کو ایک لائق انگریزی داں کی ضرورت ہوئی چونکہ سرسید اس کلرک کی انگریزی لیاقت سے واقف تھے، انہوں نے اسی کی سفارش کی اور اس کے گھر سے بلوایا۔ چنانچہ وہ صاحب اس کو دو سو روپیہ ماہوار کا نوکر رکھ کر لے گئے۔

ایک صاحب کہتے تھے کہ "مدت کے بعد وہ کلرک مجھ سے ملا تو اس نے صاف صاف بیان کیا کہ میں نے سید احمد خاں کے ساتھ برائی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا مگر اس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مجھے دو سو کا نوکر رکھوا کر بھیجدیا۔ اس نے کہا کہ حقیقت میں سید احمد خاں ایسا شخص ہے کہ جس کے سر پر اس کی جوتیوں کی خاک پڑ جائے اسکی نجات ہو جائے۔" (حیات جاوید ج ۲ ص ۵۱۲-۵۱۳)

نادار طلباء کی مدد:۔ میر ولایت حسین اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں۔

"میں اپنے گھر سے صرف دس روپے لایا تھا۔ اس میں سے میں نے للعہ کی انگریزی کی کتابیں خریدیں۔ چھ میں کمرہ میں چٹائی کا فرش اور ۱۲ آنہ میں ٹین کا فیل سوز خریدا۔ اس طرح سے جو رقم لایا تھا اس کا بیشتر حصہ خرچ ہو چکا تھا اور میرے پاس ریاضی، قدیم تاریخ اور فارسی کی کوئی کتاب نہ تھی میں نے والدہ کو لکھا، انہوں نے جواب دیا کہ یہاں کیا خزانہ گڑا ہے تم واپس چلے آؤ۔ مرزا کلب علی بیگ نے جو میرے ہم جماعت تھے مجھ کو پریشان دیکھ کر کہا۔ مولوی مشتاق حسین صاحب (نواب وقار الملک) سے کہو وہ تم کو پرائیویٹ ٹیوشن دلوا دیں گے۔ شام کو پانچ بجے کے قریب مولوی مشتاق حسین صاحب پارک میں گشت کرتے ہوئے آئے اور مجھ کو کمرہ میں بیٹھا ہوا دیکھ کر فرمانے لگے کہ کرکٹ کھیلنے کیوں نہیں گئے۔ میں نے کہا مجھ کو کرکٹ کھیلنا نہیں آتا۔ فرمایا کہ سیکھنا چاہئے۔ پھر میں چند قدم ان کے ہمراہ گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ کیا کچھ فرمانا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھ کو کسی اسکول کے طالب علم کی پرائیویٹ ٹیوشن دلوا دیجئے۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ تم اپنا وقت دوسرے کے ہاتھ بیچتے ہو میں نے کہا کہ اگر میں اپنا تھوڑا وقت دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کروں گا تو میرا سارا وقت پڑھنے سے چلا جائے گا۔ فرمایا، کیوں؟۔ میں نے عرض کیا میرے والد زندہ نہیں ہیں، میری والدہ کچھ مالی امداد نہیں کر سکتیں۔ ایک روپیہ آٹھ آنے ماہوار وظیفہ سے بچتے ہیں جو میرے متفرق اخراجات کے لئے کافی ہوں بشرطیکہ وہ ملا کریں۔ انہوں نے فرمایا۔ میں فیمبر بورڈنگ ہاؤس سے کہہ دوں گا پھر تو تم کو پرائیویٹ ٹیوشن کی ضرورت نہ ہوگی۔ میں نے کہا میرے پاس کتابیں بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔ جو کتابیں نہیں ہیں ان کی فہرست میرے پاس بھیجدو، میں انتظام کر دوں گا۔"
(ذاتی ڈائری کے چند اوراق) (علیگڑھ میگزین، علیگڑھ نمبر ص۱۲۲)

طلباء کو نیک چلنی پر انعام:۔ اس سال (۱۸۷۹ء) جناب مسٹر سڈنس صاحب بہادر پرنسپل کالج نے اپنی ذاتِ خاص سے ایک انعام کتابوں کا بورڈنگ ہاؤس کے طالب علموں میں سے اس شخص کے لئے تجویز کیا تھا جس کی شائستگی اور نیک چلنی سب سے زیادہ عمدہ ثابت ہو اور یہ انعام نیک چلنی کا نواب محمد عبدالمجید خاں نے حاصل کیا جو نجیب آباد کے مشہور رئیس
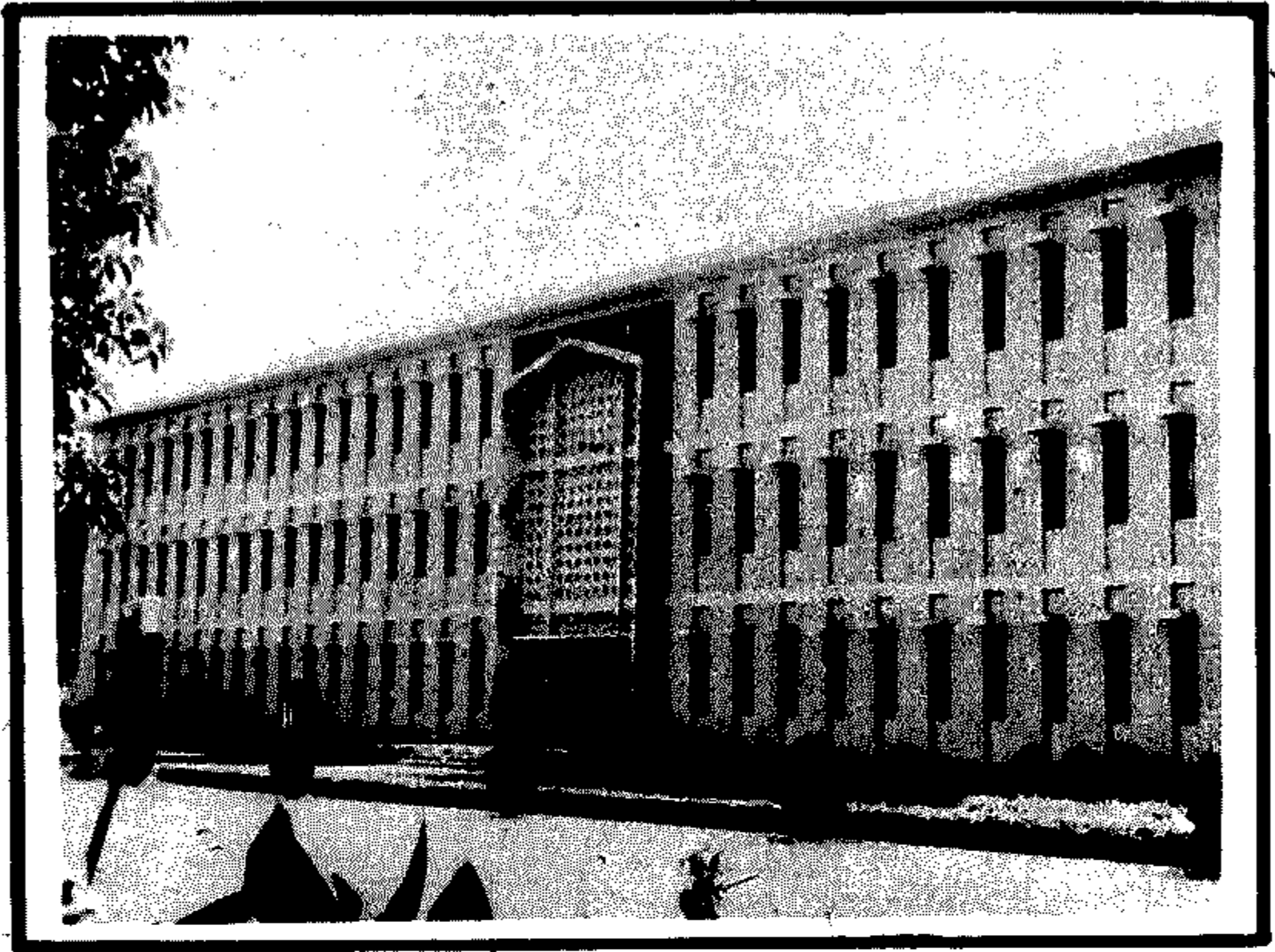
یونیورسٹی کی "فیکلٹی آف آرٹس" کی عمارت جو سب سے زیادہ طلبہ کی تعلیمی ضروریات پوری کرتی ہے

خاندان کی اولاد میں سے ہیں۔" (رپورٹ سالانہ کلاؤڈ بی بورڈنگ ہاؤس)
(مدرسۃ العلوم بابت ۱۸۹۵ء)

قومی کام میں دیوانگی:- مولوی بشیر الدین صاحب کی ایک پارٹی تھی جس کا نام "جبل مرکب" تھا۔ وہ خود اس کے صدر تھے اور ممبران میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، حبیب اللہ خاں، محمد حسین شوق، نثار حسین، مولوی طفیل احمد، خان بہادر جعفر حسین، میر ولایت حسین، اور نظامی بدایونی وغیرہ شامل تھے۔ اٹاوہ کالج کے ہسٹری میوزیم میں ایک تصویر آویزاں ہے جس کے وسط میں مولوی صاحب اپنی مخصوص وضع میں بیٹھے ہیں اور ان کے گرد عمائدین علی گڑھ کا یہ گروپ ہے، کپڑے کی ایک پٹی پر نہایت نستعلیق الفاظ میں "جبل مرکب" لکھا ہوا ہے جو ہر دیکھنے والے کی حیرت کا باعث ہوتا ہے اور اسے سمجھانا پڑتا ہے کہ یہ دراصل قومی دیوانوں کی ایک جماعت تھی جو اپنی ذات کو فراموش کر چکے تھے اور ہمیشہ قومی مسائل کو حل کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے تھے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو مائی لارڈ کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور اگر ان میں سے ایک دو بھی ایک جگہ مل جائے تو پھر ان کی گفتگو سننے سے تعلق رکھتی تھی یہ تصویر علی گڑھ یونیورسٹی میں جوبلی کے موقع پر لی گئی تھی۔
(نقوش۔ شخصیات نمبر ص ۱۳۹۵)

نووارد طلباء کے ساتھ برتاؤ:- پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"میں بڑے تردد اور ناکسی کے عالم میں بریلی لائن سے دس بجے رات کو علی گڑھ پہنچا متعدد کالج کے ہمسفر طلبہ نے حال پوچھے بغیر صرف میری ہیئت و حالت دیکھ کر میری دلداری نہ کی

ہوئی اور اپنے ساتھ لاکر اپنا ناشتہ کھلا کر اپنے کمرے پر اپنی چارپائی اور بستر پر جگہ دے کر خود کہیں اور جا کر ساتھیوں کے بنگلے میں تمام رات جوحق میں بسر نہ کردی ہوتی تو میں شہر جا کر معلوم نہیں کہاں قیام کرتا اور میرا کیا انجام ہوتا! ایک درماندہ اجنبی طالب علم کے ساتھ علیگڑھ کے ہم سفر طالب علموں کی یہ بے ساختہ دوستی اور دردمندی آج بیالیس سال بعد بھی میرے دل کو اسطرح شاداب اور شاداں کرتی ہے۔ جیسے کل کا واقعہ ہوا!"

(آشفتہ بیانی میری" ص ۵۰،۵۲)

درستگیٔ اخلاق کے دو طریقے:۔ درستگیٔ اخلاق کے دو طریقے ہیں۔ معلمانہ ہدایت یا طنزیہ تنقید۔ علی گڑھ نے دونوں کو آزمایا اور دونوں کی روایات قائم کیں۔

معلمانہ کوششوں کے سلسلہ میں سر تھیوڈور ماریسن کا ایک لیکچر بھلایا نہیں جا سکتا۔ ماریسن ایم۔ اے او کالج میں پہلے پروفیسر بعد کو پرنسپل رہے۔ انہوں نے کالج کی فضا کو سنوارنے اور طلباء میں اخلاقی خوبیاں پیدا کرنے میں بڑی جدوجہد کی ان کی بعض تقریروں کو سر سید نے اسٹریچی ہال کے ستونوں پر کندہ کرادیا تھا۔ درسگاہ میں دلچسپی اور بانیٔ درسگاہ سے عقیدت کے پیش نظر اس مسعود کی تربیت ان کے سپرد کردی گئی تھی۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں انہوں نے "اخلاق" (ON MORALS) پر ایک لیکچر دیا تھا۔ جو اس زمانہ میں علیحدہ بھی طبع ہوا تھا۔ یہاں اس کو پورا پیش کیا جاتا ہے۔

درستگیٔ اخلاق کے دوسرے طریقہ کا شاہکار "جنٹلمینز ایکٹ" ہے جو سنہ ۱۹۲۰ء میں نافذ کیا گیا تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس کی دفعات ان ہی

یونیورسٹی کیمپس کی مسجد کی یہ تصویر سامنے سے لی گئی ہے

اور حماقتوں پر محیط تھیں جو اکثر ہم سے وقتاً فوقتاً سرزد ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً نسل یا خاندان پر اترانا، اپنے لباس، ورزشی جسم یا قابلیت کی نمائش کرنا۔ اہم شخصیتوں سے اپنے تعلقات جتانا بڑے آدمیوں کی حضوری میں رہنا یا بڑا آدمی بننے کی کوشش کرنا۔ شعر و ادب یا علم و فن پرستی سنائی رائے دینا وغیرہ ان سب کے لئے مناسب سزائیں مقرر تھیں۔" یہ "ایکٹ" یہاں پورا پیش کیا جاتا ہے۔

اساتذہ کا اخلاق :۔ "مجھے خوب یاد ہے کہ مسٹر مارلسین یا مسٹر ارنلڈ نے کبھی بائیں ہاتھ سے سلام کا جواب نہیں دیا۔ چہ جائے کہ سر ہلا دینا، گردن لچکا دینا یا آنکھ مٹکا دینا! اگر ایسا اتفاق ہوا کہ داہنے ہاتھ میں ان کے کتاب ہے تو بائیں ہاتھ میں کتاب لے کر داہنے ہاتھ سے جواب دیتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ مسٹر بیک سامنے سے آرہے ہیں اور خیال ہوا کہ وہ قریب آلیں تو سلام کروں لیکن انہوں نے ایسا موقع نہ دیا اور خود ہی سبقت کر گزرے۔ فرمایئے کہ ہندوستان کے کسی دوسرے کالج کے طلبا کو بھی یہ نصیب ہے۔ پھر کیا مسٹر بیک کی کوئی عزت گھٹ گئی یا مسٹر مارلسین اور مسٹر ارنلڈ ہم سے ڈرتے تھے، نہیں! بلکہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق کے عالم باعمل ہو کر ہم کو تعلیم دیتے تھے اور کسر نفسی، ہمدردی اولوالعزمی، فرض شناسی اور قناعت وغیرہ کے سبق دیئے جاتے تھے۔"

(سید واجد حسین "اولڈ بوائے" فروری ۱۹۱۱ء ص ۸)

بالآخر اصول ہی کامیاب ہوتا ہے :۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا بیان ہے:

"(نواب وقار الملک نے) کسی واقعہ سے متاثر ہو کر مضطر ہونا تو شاید جانا ہی نہیں۔ کالج کے متعلق شدید سے شدید واقعہ میں طبیعت کا سکون بجائے خود قائم رہا۔ سنی شیعہ کی بحث جس وقت پوری قوت پر تھی اور کالج کی بنیاد متزلزل ہونے لگی تھی۔ میں نے مضطربانہ پوچھا کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا؟ پورے اطمینان سے فرمایا:

"اصول پر قائم رہنا چاہیے، بالآخر اصول ہی کامیاب ہوتا ہے۔" (وقار حیات محمد اکرام اللہ خاں ندوی ص ۸۰۹)

استادوں کی یادگار :۔ "مدرستہ العلوم کے طالب علموں کی ہمیشہ سے خصوصیت کے ساتھ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے خیالات شکر گزاری کو اپنے محسن اور شفیق استادوں کی علیٰحدگی پر عملی شکل میں ظاہر کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر ارنلڈ کی روانگی کے وقت جو شاندار الوداعی جلسے ہوئے وہ اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ کالج کے موجودہ طالب علموں نے کس درد انگیز جوش اور حسرت آمیز محبت سے اپنے عزیز استاد کو رخصت کیا۔"

(حبیب اللہ خاں ا/ مارچ ۱۸۹۸ء محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین مارچ ۱۸۹۸ء ص ۱۰۲)

اپنے نام کے ساتھ درسگاہ کا نام بھی شامل رہے :۔ سرسید، مولوی محمد عنایت اللہ دہلوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تمہارے نام کے ساتھ مدرستہ العلوم کا نام رہنا بلاشبہ تمہاری خوشی کا باعث ہوگا لیکن میری سمجھ میں تمہارے نام کے ساتھ کالج کا نام رہنا کالج کی عزت کا باعث ہے۔ اگر کالج کے بچے ایسے ہوں جیسے کہ تم ہو تو کون شبہ کر سکتا ہے کہ کالج کو اس سے فخر اور اعزاز نہ ہوگا۔ پس تم اپنے نام سے کالج کے نام کو علیحدہ مت کرو۔" (خطوط سرسید، ص ۱۹۱)

والدین اور اساتذہ کا احترام :۔ مرحوم سرسید علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک لکچر میں مدرستہ العلوم کے بورڈروں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ "یہ شکایت سننے میں آئی ہے کہ انگریزی خواں طالب علم اپنے استادوں اور اپنے ماں باپ کا ادب نہیں کرتے میں یقین کرتا ہوں کہ تم میں ایسا کوئی نہیں ہے مگر جو انگریزی خواں طالب علم ایسا کرتے ہیں وہ دنیا کی اور خدا کی لعنت کے مستحق ہیں۔ ماں باپ ان کا جسم پیدا کرنے والے ہیں اور استاد ان میں

انسانیت ڈالتے ہیں اس لئے استادوں کا درجہ حقیقت میں ماں باپ سے بھی زیادہ ہے۔ جب خدا نے ماں باپ کی نسبت فرمایا ہے کہ لا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما تو اس پر خیال کرو کہ تم کو استادوں کا کس قدر ادب کرنا واجب ہے۔ پس مرحوم سرسید کی اس بیش بہا نصیحت اور آب زر سے لکھنے کے قابل الفاظ کو ہر وقت یاد رکھنا اور ان پر عمل کرنا ہم پر فرض ہے۔

(محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین و علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ یکم جولائی ۱۸۹۹ء ص ۲۱۱)

جرأت مندانہ اظہار رائے ضروری ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ مرحوم لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ کسی موضوع پر سرسید نے ایک مضمون لکھا اور مجھے ان کی رائے سے سخت اختلاف تھا۔ میں نے اپنے نام سے تو موصوف کے مضمون کا جواب نہیں دیا بلکہ ایک گم نام خط ان کے مضمون کے جواب میں لکھ دیا۔ اس کے بعد سرسید نے اخبار میں لکھا کہ کسی دوست نے میرے مضمون کا جواب لکھا ہے لیکن اس کی وجہ معلوم نہیں ہوئی کہ انہوں نے اپنا نام کیوں نہیں لکھا۔ ہم کو اس مضمون میں راستی اور معقولیت معلوم ہوتی ہے۔" میں اپنے دل میں بہت خوش ہوا کہ میرے مضمون کی بہت قدر ہوئی اور اگر سرسید سے جا کر اقرار کروں گا کہ وہ خط میں نے لکھا تھا تو وہ مجھ سے خوش ہوں گے۔ چنانچہ میں نے جا کر عرض کیا کہ وہ مضمون میں نے لکھا تھا اپنا نام اس لئے نہیں لکھا کہ یہ بات میری گستاخی سمجھی جائے گی کہ میں حضور والا کے مضامین سے مخالفت کرتا ہوں۔ فرمایا کہ اچھا تم نے یہ گمنام خط لکھا تھا۔ یہ سخت بداخلاقی میں شامل ہے کہ گمنام خط لکھے جائیں۔ ابھی اسی وقت تہیہ کرو کہ آئندہ گمنام مضامین نہیں لکھو گے۔ میں نے توبہ کرلی اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی گمنام مضامین نہیں لکھوں گا اور میں نے آج تک اس عہد کی پاس داری کی ہے۔

ایم اے او کالج اور مسلم یونیورسٹی کے چند قومی رہنما

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، خان عبدالغفار خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین، ظفر علی خاں، عبدالمجید خواجہ، سیف الدین کچلو، ڈاکٹر سید محمود، شیخ محمد عبداللہ، حسرت موہانی، راجہ مہندر پرتاپ، شری پالیوال، سردار یا بنگر پی بی موریا، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، شیخ قریشی، رفیع احمد قدوائی، حافظ محمد ابراہیم، یٰسین نوری، علی ظہیر، پروفیسر حبیب وغیرہ۔

(مشاہدات و تاثرات ص ۱۲)

درسگاہ سے محبت ۔ ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ مرحوم لکھتے ہیں:

"کالج سے اس قدر انسیت پیدا ہوگئی تھی کہ کسی کو اپنے ماں باپ کے گھر سے بھی اتنی محبت نہ ہوتی ہوگی۔ ایک مرتبہ ایک انگریز کلکٹر نے اس زمانہ میں جب کہ میں وکالت کرتا تھا مجھ سے پوچھا کہ تم اپنے کالج کے متعلق کیا کرنا چاہتے ہو اور کیا ایسی بات تمہارے دل میں ہے جس سے تم کو کالج کے متعلق خوشی حاصل ہو سکتی ہے ـــــــ میں نے جواب دیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں پھر طالب علم بن کر اپنے بورڈنگ ہاؤس کے کمرے میں جا کر رہوں۔ اس پر کلکٹر نے قہقہہ لگایا کہ بالکل یہی خیال میرا بھی ہے کہ میں کیمبرج میں جا کر پھر طالب علم کی سی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس زمانے کے طالب علموں کو اپنے کالج سے کس درجہ گہری محبت ہو جایا کرتی تھی۔"

(مشاہدات و تاثرات ص ۹)

ملازم کی بھی عزت نفس ہے۔ سرسید لکھتے ہیں:

جس زمانہ میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں

مولانا حبیب اللہ خاں شیروانی

نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا والدہ کو بھی خبر ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا۔ تو انہوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماماں میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لاکر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماماں نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی انہوں نے کہا: دیکھو! آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں ہیں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں۔ وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔ میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحب مجھے والدہ کے پاس لے گئیں۔ تاکہ قصور معاف کرائیں۔ انہوں نے کہا اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے گا تو میں بھی معاف کردوں گی۔ جب میں نے ڈیوڑھی میں جاکر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا۔" (حیات جاوید ج ۱ ص ۲۷)

اسی تربیت کا اثر تھا کہ سرسید نے بورڈنگ ہاؤس میں یہ حکم نافذ کر دیا تھا کہ جو طالب علم کسی ملازم کو مارے پیٹے گا اس کا نام ہوسٹل سے خارج کر دیا جائے گا۔ ۱۸۸۲ء کا ذکر ہے کہ ایک طالب علم سید حسین نے بیرے کو مارا۔ سرسید نے حکم دیا کہ سید حسین کا نام بورڈنگ ہاؤس سے خارج کر دیا جائے۔ طلباء جمع ہوئے اور سرسید کو عرضی لکھی کہ اس طرح اگر نوکر کے مارنے پر طلباء بورڈنگ ہاؤس سے خارج کئے گئے تو نوکر بہت خودسر ہو جائیں گے۔ سرسید کا جواب آیا کہ تمہاری خودسری حد سے بڑھ گئی ہے۔ میرا حکم نہیں بدل سکتا۔ سید حسین کو خلاف قاعدہ نوکر کو مارنے پر بورڈنگ ہاؤس چھوڑنا پڑے گا۔"

عادت ایسی رکھو کہ ہمیشہ اس کو نباہ سکو۔

سرسید کا بیان ہے:

"جب میں دلی میں منصف تھا تو میری والدہ کی یہ نصیحت تھی کہ جہاں تم کو جانا ضروری ہے وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ اس کو نباہ سکو۔ چنانچہ میں نے جامع مسجد اور خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اور کبھی کبھی سواری پر جاتا تھا۔"

(حیات جاوید۔ جلد ۱ ص ۳۰)

اختلاف رائے کو ذاتی مخاصمت میں تبدیل ہونے دو

طلباء کی "برادرہڈ" کے پہلے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر ماریسن نے کہا تھا:

"آخر میں میں تم کو یاد دلاتا ہوں کہ تم اس بھائی کے لفظ کو جس سے ہم ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ ہمیشہ دل سے یاد رکھو جب تمہاری عمریں زیادہ ہوں گی اور جب معاملات کو فیصل کرنا خاص کر ایسے کاموں میں جو قومی بہبود کے لئے

تم کو مل کر کرنے پڑیں گے تمہارے اختیار میں ہوگا تو یاد رکھو ضرور تمہاری رائے میں اختلافات پیش آئیں گے۔ ایسے کاموں میں اختلافات آرا کسی طرح بند نہیں ہو سکتا۔ اور نہ میں چاہتا ہوں کہ ایسا ہو کیونکہ یہ اختلاف اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ خیالات عمدہ اور اصلی ہیں۔ غرض ان اختلافات کی وجہ سے یہ ہوگا کہ تم ایسے مخالف فریق قائم کرو گے جن سے رائے کے اختلافات ذاتی مخاصمتوں میں تبدیل ہو جائیں گے جس کا برا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنی ذاتی عداوتوں کی پیروی میں ایک مفید کل کے پرزے جدا جدا کر کے رکھ دو گے۔

میں تم کو اس بات کی اس لئے نصیحت کرتا ہوں کہ میں تمہاری طبیعتوں سے خوب واقف ہوں۔ میں نوع انسان کے متعلق ایسے کلیات جو اس کی جامع تواریخ سے نکلتے ہوں بیان نہیں کرتا بلکہ وہ عیوب بتاتا ہوں جو ایک بھائی دوسرے بھائیوں کے ایک گھر میں رہ کر معلوم کر سکتا ہے۔ تم کو اپنی تمام زندگی میں یہ بات پیش آئے گی کہ جب کوئی تمہاری مخالفت کرے گا تو تم کو اس سے دشمنی کا خیال پیدا ہوگا لیکن یاد رکھو کہ ہر انسان کو خواہ وہ کتنا ہی نیک اور اچھا ہو ایسی مخالفتیں پیش آتی ہیں۔ تم کو ایسی حالت میں ترغیب ہوگی کہ جس شخص نے تمہاری رائے کو ہٹا کر تم کو شکست دی ہے تم اس سے سخت عداوت رکھو۔ اس خیال سے تم اپنے دوستوں کو شریک کر کے اس کام سے جس میں تم مل کر کام کرتے تھے علیحدہ ہو جاؤ گے اور اگر ممکن ہوگا تو اس کام کو بالکل ہی غارت کر دو گے حالانکہ تم اس بات کے معترف ہو گے کہ وہ کام اچھا تھا لیکن اس وجہ سے کہ تمہاری رائے کے موافق نہیں ہوا تم نے اس کو تباہ کر دیا۔ تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ یہ اس لئے کہتا ہوں کہ یہاں تم نے فریق بنا رکھے ہیں جو ایک دوسرے کی اس قدر سخت مخالفت کرتے ہیں جس کی مثال انگلستان میں بھی میری نظر سے کبھی نہیں گزری۔

خواجہ عبدالمجید مرحوم

جو کچھ حالت تمہاری ہے وہ ہی کل ہندوستان کے مسلمانوں کی ہے۔ تم اپنے ذاتی خیالات کو قومی فلاح کے خیالات کا مطیع نہیں کرتے۔" (اسپیچ مسٹر ماریسن بر پہلا سالانہ اجلاس مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے طالب علموں کے برادرہڈ میں۔)

(مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۳ء ص ۱۲-۱۱)

کمروں کی صفائی اور ترتیب ۔ ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر صدر ایجوکیشن کمیشن نے جب علی گڑھ کا معائنہ کیا اور طالب علموں کے کمروں کو دیکھا تو کہا:

"طالب علموں کے کمروں کے معائنے کے وقت مجھ کو وہ طریقہ نہایت پسند آیا جس میں یہ کمرے مرتب کئے گئے تھے۔ ہر ایک طالب علم اپنے کمرہ کی آرائش اپنے مزاج کے موافق کرتا ہے اور ہر ایک کمرہ میں اسی قسم کی خصوصیت پائی جاتی ہے جو آئین کالج کے ایک لڑکے کے کمرہ میں دکھائی دیتی ہے۔"

(ایڈریس اور اسپیچیں ص ۶۱)

روشنی پھیلنے کے اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ فضائیں اداس ہیں اور ہر در و دیوار سے غم اور مایوسی ٹپک رہی ہے۔ ابھی کچھ گھنٹے پہلے وہ آفتاب علم غروب ہو چکا ہے جس کی ضیا پاشیاں سے کالج کے بام و در برسوں تک جگمگاتے رہے تھے۔ اپنے مکان سے کچھ فاصلہ پر ایک دوست کی کوٹھی میں سرسید علیہ الرحمہ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دنیا نے ایسا محسوس کیا کہ ؎

دھوپ تھی، گئی آفتاب کے ساتھ

پچاس سال تک کوئی سورج ایسا طلوع نہیں ہوا تھا جس نے اس انسان کو اپنی قوم کی فکر میں مبتلا نہ پایا ہو۔ آسمان پر بکھرے ہوئے بے شمار ستاروں نے اس کی آہ و فغان نیم شبی سُنی تھی۔ "وہ سوتا تھا تو قوم کے غم میں اور جاگتا تھا تو قوم کی فکر میں۔ اس نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ ایک ہی غم میں بسر کیا تھا اور وہ یہ کہ قوم کسی طرح خواب گراں سے بیدار ہو۔ تعصب اور تنگ نظری کی دلدل سے باہر نکلے اور عزم و ہمت کے ساتھ وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینا سیکھے۔ اس کی موت کا یقین نہیں آتا۔ ہر شخص حیران ہے اور سوچتا ہے کہ اس اولوالعزم انسان کو موت نے کس طرح زیر کیا ہوگا۔ اور خود موت پر کیا گزری ہوگی۔

سرسید کے جنازہ سے

۱۸۹۸ء ہے اور مارچ کی ۲۸ تاریخ۔ سورج آہستہ آہستہ مشرق سے ابھر رہا ہے اور اس کی کرنیں وکٹوریہ گیٹ کے سربفلک کلس اور اسٹریچی ہال کی وسیع پیشانی سے ٹکرا ٹکرا کر ہر طرف پھیلنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن بجائے

سرسید کے جنازہ کا آنکھوں دیکھا حال۔ کرکٹ لان پر سرسید کا جنازہ رکھا ہے۔ بے شمار خلقت جمع ہے ہزاروں انسان جن کے دل صدمہ سے بے چین اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں، صف بستہ کھڑے ہیں۔ ان میں مسلمان

ماخوذ

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ کا انتقال تک

سبھی ہیں، ہندو بھی اور عیسائی بھی۔ یوں تو سب ہی غمگین نظر آتے ہیں لیکن دو طرف سے زار و قطار رونے اور دل کو ہلا دینے والی آہوں کی آواز آرہی ہے۔ ایک طرف کالج کے وہ طلبا ہیں جن کے مستقبل کی فکر نے مرنے والے کو عمر بھر خواب راحت سے محروم رکھا تھا اور اب ایسا سو گیا ہے کہ دلسوز صدائیں بھی اس کو بیدار نہیں کر سکتیں۔ اس کی گہری نیند دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اب شاید ؎

عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

دوسری طرف وہ راج مزدور، بڑھئی اور سنگ تراش ہیں جن کے ساتھ ۲۵-۲۶ سال تک اس نے علی گڑھ کی تپتی ہوئی دوپہریں گزاری تھیں۔ اس کی عورتیں اور بچے جو دیہات سے یہ جانکاہ خبر سن کر آگئے ہیں، اپنے محبوب آقا کو آخری سلام کر رہے ہیں ؎

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

تھوڑی سی دیر میں سرسید کا قوی ہیکل جسم مسجد کے ایک گوشہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا اور تاریخ کا ایک دور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ؎

عرش کے نوری زمیں کے فرش پر آنے کو ہیں
اور اک خاکی کو سیر خلد دکھلانے کو ہیں
باغ جنت کو سدھارا سید عالی مقام
راہ میں اس کی ملائک نور برسانے کو ہیں
بوسہ گاہِ قوم ہوگا تیرا سنگ آستاں
نقش پا پر تیرے لاکھوں قافلے آنے کو ہیں

سرسید کے انتقال پر تعزیتی جلسہ:- اسٹریچی ہال میں جلسہ ہے محسن الملک کرسیٔ صدارت پر بیٹھے ہیں۔ ہزاروں نمناک آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی ہیں۔ خوشی محمد ناظر کا دل یہ دیکھ کر بھر آتا ہے۔ ڈائس پر جا کر یہ شعر پڑھتے ہیں اور دل

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ مرحوم

سرسید کے صاحبزادے جسٹس سید محمود مرحوم

پلٹ کر وہیں بیٹھ جاتے ہیں ۔؎

ہائے بزم قوم میں اب جلوہ فرمائے گا کون؟
ماہ کی مانند ہالے میں نظر آئے گا کون؟
یوں تو لاکھوں آئیں گے اس بزم میں اور جائیں گے
سید احمد سا جنوں ساماں مگر آئے گا کون؟

خاموش مجمع سے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہر شخص ایک دوسرے کی طرف دیکھتا تھا اور خاموش تھا۔ شبلی اپنی جگہ سے اٹھے اور آہستہ آہستہ ڈائس کی طرف بڑھے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور بولے:۔

"سید احمد خاں اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں چلے گئے۔ دیکھو ہماری قومی عمارت کے ستون ہل رہے ہیں۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اسوقت طاقت گویائی کہاں سے لاؤں۔

حضرات! اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی قرار پاسکتا ہے تو اس کا آغاز اس کی نشوونما اس کی نمود، اس کا جو کچھ ہوا اس کالج سے ہوا اور یہ کالج جلوہ ہے اسی بڑے شخص کا ۔؎

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

اس کی شخصیت میں کیا جادو تھا۔ اس کی نظر میں کیا تاثیر تھی، اس کی آواز میں کیا کشش تھی ۔؎

دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی
جادو تھی، فسوں تھی، جانے کیا تھی
ذرہ بی ہمہ تن جو تھی اثر میں
نشتر سی اتر گئی جگر میں
صورت سے عیاں جلال شاہی
چہرے پہ فروغ صبح گاہی
لب پر ہے فغاں کہ اب بھی جاگو
اے خواب گراں کے سونے والو
تا چند رہو گے مست و سرشار
اٹھو کہ سحر ہوئی نمودار

شبلی فرط غم سے کچھ ایسے مغلوب ہوئے کہ آگے کچھ نہ کہہ سکے اور بیٹھ گئے۔

محسن الملک نے حالی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"آپ بھی کچھ کہیں گے؟"

یہ جملہ کیا تھا ایک تیر تھا جو حالی کے دل میں اتر گیا۔؎

اک آہ بھری سُن کے یہ حالی نے کہ بس بس
دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی

آنسوؤں کی جھڑی ان کی آنکھوں سے چل رہی تھی۔ چند منٹ تک خاموش کھڑے رہے۔ گردن سے رومال کھولا اور آنکھوں پر رکھ لیا۔ پھر اپنے پر کچھ قابو پا کر بولے۔

"حضرات! دل کی کسک کون دکھا سکا ہے
جو میں دکھانے کی کوشش کروں۔ سرسید
کیا گئے' ایک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ایک
نادار ملک کا گنج بے بہا اور میرا مرشد، رہبر
اور دوست جاتا رہا۔ ہم نے اس سے قومی
خدمت کا مفہوم سیکھا۔ دوسروں کے لئے
اپنی زندگی کے عیش و آرام کو قربان کر دینے
کا سبق پڑھا۔ جب وہ قومی خدمت کے دشوار
گزار راستہ پر آگے بڑھا تو بہت سے لوگ
جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے
رہ گئے' بہت سے افتاں و خیزاں آگے
بڑھے لیکن ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں اور
پیروں پر چھالے پڑ گئے' دم چڑھ گیا اور
چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں لیکن وہ اولوالعزم
انسان اسی طرح تازہ دم رہا۔ نہ اسے رستے
کی تکان نے مضمحل کیا نہ ساتھیوں کے چھوٹ
جانے سے اس کی ہمت ٹوٹی نہ منزل کی دوری
نے اس میں ہراس پیدا کیا۔ اب یہ لیل و نہار
دوسرا سید احمد پیدا نہ کر سکیں گے۔"

محسن الملک کی ہچکیاں بندھی ہوئی ہیں۔ بڑی مشکل سے
سہارا لے کر کھڑے ہوئے اور کہا۔

"جس جگہ آج میں تقریر کرنے کھڑا ہوا ہوں ۔۔۔"
اتنا کہا اور رونے لگے۔ اس جگہ سے ذرا ہٹ گئے اور
پھر بولے:۔

"یہاں سرسید مرحوم کھڑا ہوا کرتے تھے۔
مجھے صرف ان کی ذات سے ہی محبت نہ تھی بلکہ
پچاس سالہ تجربہ نے یہ بات میرے دل پر نقش
کر دی تھی کہ قومی درد اور ہمدردی خواہی کو جب

ایم اے او کالج کے پہلے نگراں مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم

خدا تعالیٰ نے ایک جسم اور شکل دینی چاہی تو
سید احمد اس کا نام رکھ دیا۔ خلوت و جلوت
تنہائی و یکجائی' دن رات' صبح شام جب
میں نے انکو دیکھا اسی حال میں دیکھا' ہم
لوگ ان کے پیرو اور دوست کہلاتے تھے
مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو قومی درد اور قومی
محبت سرسید میں تھی اور وہ آگ جو ان کے دل
میں لگی ہوئی تھی اور وہ درد جس سے ان کا
دل بھرا ہوا تھا ہم میں اس کا نشان بھی نہیں
ہے۔ ان میں یہ سب باتیں فطری تھیں اور
ہم میں مصنوعی۔ سرمگیں آنکھ اور چیز ہے اور
سرمہ لگانا اور بات ہے۔"

اتنا کہا اور محسن الملک کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ پھر

محسن الملک نواب مولوی سید مہدی علی خاں میر نواز جنگ مرحوم

ایک دم کھڑے ہوگئے جیسے سرسید کی روح نے خاموشی سے کان میں کہہ دیا ہو کہ میرا ماتم بھی کسی تعمیری کام کی بنیاد بننا چاہیے۔ لوے ب

حضرات جب کوئی بڑا شخص دنیا سے گزرتا ہے تو اس کو احسان کی نظر سے دیکھنے والے اپنی شکرگزاری اور دلدادگی کے ثبوت میں کوئی نہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو ان کے محبوب اور مقتدا کی شان کے لائق ہو۔ ان کے لئے عالی شان مقبرے بنواتے ہیں۔ سنہرے گنبد تعمیر کرتے ہیں، ان کے نام کے لنگر خانے جاری کرتے ہیں، سالانہ عرس کرتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور ان کے پس ماندوں کے لئے بڑے بڑے ذخیرے مال و دولت جمع کرتے ہیں، تم جسکو چاہتے تھے اور جس کو اپنا مصلح اور پیشوا سمجھتے تھے وہ نہ زندگی میں اپنے لئے نذر و نیاز کا طالب ہوا، نہ اپنی ذات کے واسطے تم سے کسی چیز کا کبھی خواہاں ہوا بلکہ خود اپنا مال تم پر قربان کیا اور اپنی کمائی تمہارے کاموں میں لگائی۔ یہاں تک کہ نہ اپنے مرنے کے لئے ایک جھونپڑا چھوڑا اور نہ اپنے کفن کے واسطے ایک گز کپڑا۔ جو کچھ تم سے لیا تمہیں پر خرچ کیا اور تمہارے ہی کاموں میں لگایا۔ مرنے کے بعد بھی اس کی یہ تمنا نہ تھی کہ اس کی یادگار میں مقبرہ بنایا جائے یا اس کی قبر پر لنگر جاری ہو یا اس کے نام کی کوئی خانقاہ بنائی جائے بلکہ یہی آرزو تھی کہ مرنے کے بعد بھی جو کام تمہاری بھلائی کا اس نے شروع کیا تھا وہ پورا ہو اور قومی ترقی کے اصلی وسائل یعنی تعلیم و تربیت کے سامان پورے پورے جمع کئے جاویں اور ایم۔ اے۔ او کالج کو مسلم یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچایا جاوے۔ سرسید آپ میں نہیں ہیں لیکن ان کا بتایا ہوا راستہ سامنے ہے اور اب بھی پکار رہا ہے۔

تو اے مسافر شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغ جگر سے نورانی

محسن الملک۔ جو آگ سرسید نے اپنے رفقاء کے دل میں لگا دی تھی اس کے شعلے ان کے بعد تیز تر ہو گئے اور ان کے ماتمی جلسوں سے مدرستہ العلوم کو یونیورسٹی بنانے کی تحریک کا آغاز ہوا۔ محسن الملک نے ہاتھ میں کاسہ گدائی لیا۔ ان کے ساتھیوں نے گلے میں جھولیاں ڈالیں اور گھر گھر

جا کر دستک دی ہے

تاکہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا
اس لئے ڈالے گلے میں جھولیاں آئے ہیں ہم
خود غرض ٹھہرائیں، یا مکار ہم کو، یا گدا
ذلتیں یہ کر کے سب خاطر نشاں آئے ہیں ہم
فخر سب بیجا ہیں ان کے قوم ہے جن کی ذلیل
فخر و عزت کے مٹا کر سب نشاں آئے ہیں ہم

راستہ دشوار گزار تھا اور منزل دور، لیکن محسن الملک نے ہمت نہ ہاری اور فیصلہ کیا کہ چاہے کتنے ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑے وہ اپنے نصب العین کو نہ چھوڑیں گے اور اپنی جد و جہد کو جاری رکھیں گے۔

یکم فروری ۱۸۹۹ء کو محسن الملک کالج کے سکریٹری منتخب ہوئے اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء تک جب انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، مسلسل کالج کے کام کو آگے بڑھاتے رہے۔ جب سر سید کا انتقال ہوا تھا تو کالج کی سالانہ آمدنی ۷۶ ہزار تھی۔ محسن الملک نے اپنی کوشش سے اس کو ڈیڑھ لاکھ تک پہنچا دیا اور ۵-۶ سال میں کالج کے لئے چھ لاکھ چندہ جمع کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فصاحت اور خوش بیانی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ تقریر کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے اور سننے والوں پر کیفیت طاری ہو جاتی۔ انہوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو کالج کے کام میں لگا دیا۔ ان کی کوشش سے عوام کی کالج سے غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خاں نے جب علی گڑھ میں قدم رکھا تو طرح طرح کی بدگمانیاں دل میں تھیں لیکن جب ایک دن رہ کر یہاں کے حالات کا جائزہ لیا تو انداز ہی بدل گیا اور اس درس گاہ سے ایک گہرا تعلق پیدا ہو گیا۔ ٹرسٹیوں میں اختلافات شروع ہوئے تو محسن الملک نے درسگاہ کے مفاد کو سب سے مقدم

نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین مرحوم

رکھتے ہوئے ہر ذاتی ذلت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ ایک بار سید محمود خفا ہو گئے۔ بھرے جلسے میں گلوگیر آواز میں تیس سالہ تعلقات کا واسطہ دیا اور ان کے قدموں پر گر گئے۔

ملک کی عام فضا اب بدلنے لگی تھی اور سیاسی تحریکیں ابھر رہی تھیں۔ کالج کے طلبا بھی ان سے متاثر تھے اور ان میں کالج کے انگریز اساتذہ کے خلاف جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ طلبا سر سید کی تعلیمی تحریک ہی کو اس بیداری کا سبب بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ نئے حالات میں ان کی تعلیمی جد و جہد کا تقاضہ ہے کہ سیاسی جبر کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے سر سید کی روح سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا

مولانا سید الطاف حسین حالیؒ

جو اس کی انتہا ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

علی گڑھ کے طلباء کی ایک بڑی تعداد نے آزادی کے نئے رجحانات سے سرشار ہو کر سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ محسن الملک نے ان کے جذبات کا پورا احترام کیا لیکن انتہا پسندی کے خطروں سے بھی آگاہ کر دیا۔

"وہ ابھی جوان اور پُر جوش ہیں اس لیے بڈھوں کے اعتدال یا مصلحت یا دھیمی چال کو وہ کمزوری بلکہ بزدلی اور خوشامد سمجھتے ہیں۔ دس برس کے بعد وہ ایسے بڈھوں کو بھی نہ پائیں گے اور نئے تعلیم یافتہ بہادر اور قوی دل اور قوم کے شیدائی اور فدائی ان کو بہت ملیں گے اور اپنے پُر زور ہاتھوں سے قوم کی رسی کو ایسے زور سے کھینچیں گے کہ سب لوگ ان کے دست و بازو کی قوت دیکھ کر آفریں کریں گے، مگر اندیشہ ہے کہ رسی ٹوٹ جائیگی اور شیرازہ بکھر جائے گا"

۱۹۰۷ء میں طلباء کا اسٹرائک ہوا جس نے بد نما صورت اختیار کر لی۔ محسن الملک بڑھاپے اور بیماری میں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور سیکریٹری کے عہدہ سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔

دامن اس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار، گریباں تو مرا دور نہیں

طلباء نے سنا تو ندامت سے ان کے سر جھک گئے اور ایک معافی نامہ لکھ کر اپنی خطاؤں سے درگزر کرنے کی درخواست کی۔ محسن الملک کا دل بھر آیا اور جواب دیا:

"خدا میرے عزیز طالب علموں کی عمر دراز کرے اور ان کو با اقبال کرے وہ قوم کے فخر ہوں، وہ میرے مرتے وقت اپنے سعادتمندانہ عمل سے تسلی دیں، میرا جنازہ اٹھائیں اور اپنے ہاتھوں سے مجھے دفن بھی کریں، میرے کوئی اولاد نہیں ہے، میرے کوئی بچہ نہیں، مگر جتنے لڑکے یہاں ہیں وہ میرے بچے ہیں گو وہ مجھے اپنا نہ سمجھیں مگر میں ان کو اپنا جگر گوشہ اور پارۂ دل سمجھتا ہوں اور یہ بھی امید رکھتا ہوں کہ مجھے اپنے ہاتھوں سے اسی سرزمین میں دفن کریں اور مٹی کے ڈھیلے میری قبر پر اپنے پیارے ہاتھ سے رکھیں۔"

محسن الملک کا جنازہ شملہ سے علی گڑھ میں

آٹھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ وقت آپہنچا جس کا دھڑکا تھا۔ محسن الملک نے شملہ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

وہ ملک کا محسن، وہ مسلمانوں کا غم خوار سرگرمِ مہم، قوم کے کام آگیا آخر

جنازہ ناوہ لے جانے کے لئے گاڑی کے ذریعہ جب علی گڑھ سے گزرا تو طلبا نے ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے نعش کو علی گڑھ میں اتار لیا اور سرسید کے قریب ان کو ان الفاظ کے ساتھ سپردِ خاک کیا۔

"اے کالج کی مبارک زمین! دیکھ آج قوم کا جگر گوشہ اپنی زندگی کے مرحلے طے کر کے تجھ میں پناہ لیتا ہے۔ دیکھ تیرے پاس ہماری قوم کے دو لعل بے بہا اور بھی دفن ہیں آج ایک تیسرا گوہر شب چراغ در آتا ہے یہ اس خفتہ بخت، حرماں نصیب قوم کی تین امانتیں ہیں جو تجھے داورِ حشر کے سامنے پیش کرنی ہوں گی۔ یہ ہماری آنکھوں کے تارے تھے جو آج تجھ میں مدفون ہیں لیکن یہ غروب ہو کر بھی اپنی روشنی چھوڑ گئے ہیں اور حشر میں پھر چمکیں گے۔ اے روشنی جا! اے قوم کے تارے جا اور وہاں جا کے سو جا جہاں قوم کے آفتاب و مہتاب پڑے سو رہے ہیں شام ظلمت آپہونچی ہے، تاریکی چھا رہی ہے اب اور تارے نکلیں گے مگر تیری چمک کسی میں نہ ہوگی جا! اب عالم بقا میں جا۔ تیرا آنا مبارک ہوا، خدا تیرا جانا بھی مبارک کرے تجھ پر ہزاروں درود اور سلام ہوں اور تجھ پر تا قیامت خدا کی رحمتیں نازل رہیں۔"

نواب وقار الملک:۔ ۱۵ ر دسمبر ۱۹۰۷ء کو نواب وقار الملک ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ ساڑھے چار سال تک کالج کی باگ ڈوران کے بوڑھے مگر مضبوط ہاتھوں میں رہی۔ اصول

ڈاکٹر ڈپٹی نذیر احمد

کی خاطر ہر تکلیف کو برداشت کر لینے کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا وہ دل کے صاف، زبان کے کھرے اور ارادے کے پکے تھے۔ جو بات دل میں ہوتی وہی اسے بلا خوف اور بلا مروت کہہ دیتے تھے۔ ان کے انتخاب پر جو مبارکباد کا جلسہ ہوا اس میں انہوں نے نہایت صفائی لیکن دلسوزی کے ساتھ فرمایا۔

"میں اس وقت وعدہ نہیں کرتا کہ میں کیا کروں گا اور کیا نہ کرونگا اور میرے کام کرنے کے نتائج کیا ہوں گے۔ البتہ مجھ کو اپنے احباب ٹرسٹیوں اور کالج اسٹاف سے امید ہے کہ وہ اور میں مل جل کر کام کریں گے اور وہ مجھے پوری طرح مدد دیں گے اور اس طرح قوم کی جو خدمت مجھ سے بن آئے اس

علامہ شبلی نعمانیؒ

کے لئے میں ہمہ تن حاضر ہوں"

پھر فرمایا ـــــ

"مجھ کو یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ بہت عرصہ سے ہم سنتے چلے آتے ہیں کہ فلاں معاملہ پر اس لئے زور دینا مناسب نہیں ہے کہ کہیں یورپین اسٹاف بددل ہو کر کالج نہ چھوڑ دے اور اب طلباء کی اس حال کی شورش سے ہمارے لئے ایک تازہ دھمکی یہ پیدا ہوئی ہے کہ کہیں طلباء اسٹرائک نہ کر دیں۔ اس قسم کے حالات کے لحاظ سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم کو اپنا انتظام کافی احتیاط اور غور کے ساتھ منصفانہ اور صحیح اصولوں پر قائم کرنا چاہیے اور ہر ایک نقصان کو برداشت کرنے کے واسطے جو ڈسپلن قائم رکھنے کی غرض سے عائد ہو ہم کو تیار رہنا چاہیے، علاوہ ازیں کہ طلباء کی طرف سے کوئی ایسی دھمکی ہو یا اسٹاف کی طرف سے۔ میں انتظام کو ضعیف اور کمزور دیکھنے کی بہ نسبت کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کا خالی دیکھنا مناسب سمجھتا ہوں"

اس بوڑھی آواز میں یقین و اعتماد کی بے پناہ قوت تھی۔ محسن الملک میں اگر شان جمال جلوہ گر تھی تو وقار الملک کی ذات شان جلال کی مظہر تھی۔ لیکن ان کی ضابطہ کی پابندی کے پیچھے ایک حساس، فرض شناس اور قومی لگن سے بھرپور دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی تھیں۔ ان کی دل نوازی کا یہ عالم تھا کہ جو طالب علم ملنے کے لئے آتا، کھڑے ہو کر اسکا استقبال کرتے اور انتہائی عزت اور احترام کے ساتھ بٹھا کر بات کرتے۔ اگر ان کے مطالبے پورے نہ کر پاتے تو اقبال کے اس شعر کی مجسم تصویر بن جاتے ؎

مری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری

مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

وہ طلباء میں عزت نفس خودداری اور احساس خودی پیدا کرنے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ انکا عقیدہ تھا؎

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ

خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

ایک دفعہ کسی شخص نے طنزاً ان کے سامنے کہا کہ بعض ایسے طلباء بھی وظیفہ مانگنے آتے ہیں جو سوٹ اور بوٹ سے آراستہ ہوتے ہیں، ان کو مدد نہ دی جائے۔ یہ گفتگو ان کو ناگوار ہوئی فرمایا۔

"کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ایسے طالب علم ہمارے

سامنے ننگے سر پا چھڑے لگائے ہوئے
آکر مدد مانگیں۔"

ان کا دروازہ طلباء کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا بیماری کے زمانہ میں معالج اور تیماردار کام کرنے کو منع کرتے اور لوگوں سے ملاقات پر پابندی لگاتے تو وہ یہ کہہ کر ساری پابندیاں توڑ دیتے۔

"کام ہی تو میری زندگی کا باعث ہے۔ جس وقت مجھ سے کام چھوٹ جائے اس وقت سمجھ لینا میرا آخری وقت آ پہنچا۔"

درسگاہ کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم پر نکلے اور پیرانہ سالی کے باوجود شہر شہر پہنچے۔ ایک جگہ کہا۔

"میں نہ کوئی عالم ہوں جو اپنے مؤثر وعظ سے جماعت کے دلوں کو ہلا دوں، اور نہ کوئی لیکچرار ہوں جو اپنی فصیح و بلیغ اور جادو بھری تقریر سے دوسروں کے دلوں کو تسخیر کر لوں نہ میں بہت بڑی بڑی اور لمبی چوڑی امیدیں دلانے والا آدمی ہوں۔ البتہ اپنی زندگی میں جہاں بھی آب و دانہ مجھ کو لے گیا اپنے ملک اور قوم کے تعلیمی مسائل کے ساتھ مجھ کو دلچسپی رہی اور شاید یہی روشنی مجھ کو کشاں کشاں یہاں تک لائی ہے۔"

اس کے بعد نہایت درد بھرے لہجہ میں کہا ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

ایک فقیر مجمع سے اٹھا اور پوچھا کتنی رقم چاہیئے ہو، جواب دیا "چھ لاکھ کی ضرورت ہے۔"

فقیر نے چھ پیسے ہاتھ میں دیئے اور کہا چھ لاکھ ملیں گے۔ کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا اور وقار الملک نے اپنے

مولوی ذکاء اللہؒ

زمانہ میں چھ لاکھ روپیہ چندہ جمع کیا۔

وقار الملک کی صحت اب جواب دے چکی تھی۔ احساس فرض کے باعث ان کو آرام نہیں ملتا تھا۔ بالآخر سیکریٹری کے عہدہ سے مستعفی ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ طلباء کو معلوم ہوا تو ۷ رفروری ۱۹۱۲ء کو ان کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا اور استدعا کی کہ وہ اپنی رہبری سے محروم نہ کریں آخر میں یہ شعر لکھا ؎

میکشوں کے سر پہ یارب پیر میخانہ رہے
دور میں ساغر رہے گردش میں پیمانہ رہے

۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو اپنے وطن امروہہ میں نواب وقار الملک نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اعظم گڑھ سے آواز آئی:۔

"نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و

نواب محمد اسحاق خاں مرحوم

سیاست کا ماتم کیا، مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا۔ مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا لیکن وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولو العزمانہ اخلاق کی گمشدگی پر فریاد ـــــ وہ ہمارے کارفرما قافلہ کا آخری مسافر تھا اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔"

نواب وقار الملک کے بعد نواب محمد اسحاق خاں اور سید محمد علی سیکریٹری کے عہدہ پر فائز رہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب ایم۔ اے۔ او کالج کو یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا تو راجہ محمود آباد پہلے وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ پھر سنہ ۱۹۲۲ء میں کچھ مہینوں نواب مزمل اللہ خاں نے کام کیا۔ یکم جنوری سنہ ۱۹۲۳ء کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے وائس چانسلر کے عہدہ کا چارج لیا۔ اور تین سال بعد یعنی ۳۱ ردسمبر سنہ ۱۹۲۶ء کو بیماری کی وجہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم:۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کالج کے پرانے طالب علموں میں تھے دس گیارہ برس کی عمر میں ان کے والد نے جو کنج پورہ ضلع کرنال کے رئیس تھے انہیں علی گڑھ سرسید کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجدیا تھا۔ ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا۔ وکٹوریہ گیٹ کے سامنے احاطہ کی جالیوں کے قریب ایک پختہ نالی تھی جس سے باغوں کو پانی دیا جاتا تھا نئی نئی سرخ اینٹوں کی یہ نالی دور تک سبزے میں چلی جاتی تھی اور بہت خوب صورت معلوم ہوتی تھی۔ آفتاب احمد خاں نے جوتیاں اتاریں اور اس نالی میں دوڑنے لگے جالیوں کے پیچھے سے سرسید اپنی گاڑی پر آ رہے تھے۔ انہوں نے آفتاب احمد خاں کو بلایا اور طمانچہ رسید کیا۔ صاحبزادہ صاحب عمر بھر اس طمانچہ پر فخر کرتے رہے اور جب یکم جنوری سنہ ۱۹۲۳ء کو وائس چانسلری کے عہدہ پر فائز ہوئے تو ان کا دل سرسید کی یاد سے بھر آیا۔

"یہ منظر کتنا روح فرسا ہے کہ سرسید کی خدمات اور کارگزاریوں کو فراموش کرنے والے وہ افراد ہیں جن کے لئے مرحوم نے اپنی حیات اور مساعی کا پورا سرمایہ وقف کر دیا تھا۔ اور جن کی بصیرت اور انشراح قلب کے لئے انہوں نے مہتم بالشان اسوہ حسنہ اور بے غرضی کا بے مثال

کا بے پایاں ترکہ چھوڑا ہے۔"

سرسید کی یادوں سے کچھ محسوس ہونے لگی تھی اور بعض لوگوں کو سرسید کے سیاسی طریقہ کار کے متعلق کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ آفتاب احمد خاں نے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ وہ شخص جس نے ہندوستان میں سب سے پہلے سوراج کی حقیقت کو محسوس کیا وہ ہمارے رہبر سرسید تھے وہ ذات سرسید ہی کی تھی جس نے اس حق کا مطالبہ کیا اور سوراج کے اولین نقوش اس ملک کے صفحات پر بٹھائے۔ سرسید ہی نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت سب سے پہلے محسوس کی اور اس کی تبلیغ ایسے وقت، ایسے طریقے اور ایسی زبان میں کی جو آج تک قابل یادگار ہے۔ حصول سوراج کی آخری منزلوں کو طے کرنے کی سعادت خواہ کسی کو نصیب ہو، لیکن اس حقیقت کا اعتراف قرین انصاف ہے کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ ہر اس شخص کے لئے جو ارباب حکومت کے اشتباہ اور عتاب کا مورد تھا مارشل لاء اور دار و رسن پذیرائی کے لئے موجود تھے۔ صرف سرسید کی وہ ذات تھی جو قوم و ملک کے لئے سب سے پہلے سینہ سپر ہوئی اور اس نے ——

REPRESENTATIVE GOVERNMENT

کی اولین علم برداری کا طرۂ امتیاز حاصل کیا۔ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد ہی انہوں نے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا اور بغاوت

نواب سید محمد علی مرحوم

کا پہلا سبب مجلس قانون ساز میں ہندوستانیوں کا بہ حیثیت رکن موجود نہ ہونا قرار دیا۔"

صاحب زادہ صاحب نے یونیورسٹی کے خاکے میں رنگ بھرے۔ مختلف شعبوں کی از سر نو تنظیم کی۔ رہائشی زندگی کو بہتر بنانے کی تجویز پر سرگرمی سے عمل کیا۔ طلباء میں علم کی لگن پیدا کرنے کی جد و جہد کی، عمارتوں کی تعمیر کا پروگرام بنایا۔ حد یہ ہے کہ ان کی نظر ناقص القویٰ بچوں کی طرف بھی گئی۔

"حضرات! اب میں چند الفاظ ایک ایسے مبحث کی نسبت کہنا چاہتا ہوں جسکو اس ملک کی گورنمنٹ اور رعایا دونوں نے نظر انداز کر رکھا ہے۔ میرا مقصد ان بچوں کی تعلیم و تربیت سے ہے جو دماغی یا جسمانی حیثیت

سرسید کے اخبار "تہذیب الاخلاق" کے پہلے شمارہ کا سرورق

سے ناقص القویٰ ہیں۔"

اس احساس نے احمدی اسکول کی شکل اختیار کرلی

۱۸ ر جنوری ۱۹۳۰ء کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے انتقال کیا۔ ان کے ایک اسکول کے ساتھی اور دوست نے مرثیہ میں لکھا ۔

ہوگا کسی فلک پہ وہ خورشید جلوہ گر
کہتے ہیں آفتاب کبھی ڈوبتا نہیں

سر شاہ محمد سلیمان: ۔ اعظم گڑھ کے ایک عالم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ سرسید کا جب انتقال ہوا تو ان کی عمر ۱۲ سال تھی۔ انہوں نے کیمبرج سے MATHEMATICS میں TRIPOS لیا اور ۳۴ برس کی عمر میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ۹ سال بعد CHIEF JUSTICE کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ہندوستان کی جوڈیشیل ہسٹری میں اس عمر میں اتنے بڑے اعزاز کی مثال دوسری نہیں ملتی۔ ان کی THEORY OF EXPANDING UNIVERSE کا دور دور شہرہ تھا۔ وہ تین بار یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے اس طرح کہ جج کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اور وائس چانسلری کا کام بھی کرتے تھے۔ دہلی سے علی گڑھ آتے اور طالب علموں کی طرح کمرہ میں رہتے اور کام ختم کرکے دہلی واپس چلے جاتے۔ آخری بار وہ ۳۰ ر اپریل ۱۹۳۸ء سے ۲۳ ر اپریل ۱۹۴۱ء تک وائس چانسلر رہے۔

سر شاہ سلیمان نے سائنس کی طرف رغبت دلانے کی کوشش کی اور وقت کی اس اہم ضرورت کی طرف توجہ دلائی ۔ سائنس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ فطرت کو سمجھا جائے اور اس پر قبضہ حاصل کیا جائے اور یہ بھی کہ آدمی حقیقتوں کو جانے اور توہمات کی بندشوں سے رہائی حاصل کرے۔

خیالات اور طبیعت میں آزادی پیدا کرے
اور محض اعتقاد و حکم کا غلام بن کر نہ رہ جائے
سائنس نے ذہنی آزادی کا اعلان عام کیا
ہے اور انسانی خیالات کی وسعتوں کو ترقی
دے دی ہے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ تعداد
میں سائنس کی طرف رجوع کرنا چاہیے ۔

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

انہوں نے بتایا کہ ماضی کی مستقل اور لایعنی یاد حال
کے مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتی۔ اس لئے ضرورت ہے
کہ ٹوٹے ہوئے تاروں کے ماتم کرنے کے بجائے ابھرتے
ہوئے سورج کو دیکھا جائے اور خرد کو غلامی سے آزاد کر کے
علم و عمل کی نئی روایات قائم کی جائیں۔

"بغداد اور قرطبہ کے قدیم درس گاہوں کے ذکر
سے اپنی گزشتہ عظمتوں پر فخر کرنا بیکار ہے
گو تاریخ کے صفحات پر وہ نہایت مہتم بالشان
نظر آتی ہیں لیکن نہ تو اس امر کا بار بار ذکر
کہ قدیم عہد ماضی میں کیا کیا کیا جا چکا ہے
اس وقت ہمارے لئے کارآمد ہے اور نہ
موجودہ پستیوں کی الم انگیز تاریک حالت
کی تصویر کشی ہی ہمارے لئے مفید ہو
سکتی ہے بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنے چاروں طرف
نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ دیگر قومیں ہمارے
مقابلہ میں کیسی ترقی کر چکی ہیں اور اپنے ذرائع
کا اندازہ کر کے ہم کو اسی طرح کی ترقی کے
حاصل کرنے کے وسائل بہم پہنچانے
چاہئیں۔ ہمارے خیالات اور روایات
اور ہماری زندگی کے طریقے پر عظمت

ماضی کی یادگاریں ہیں لیکن جس حد تک
وہ قدیم ہیں اسی قدر وہ پرانی بھی ہیں اور
وہ ہرگز اس ترقی کے سامنے نہیں رکھی
جا سکتیں جسے دنیا نے عہد حاضر میں پیدا
کیا ہے۔ ہم کو اپنی اصلیت محفوظ رکھنی چاہیے
اور اپنی روایات کے روح و جوہر کو بھی
محفوظ رکھنا چاہیے لیکن اسی کے ساتھ
ہمیں خود کو زمانے کے تغیر پذیر ضروریات
کے سانچے میں ڈھالتے رہنا چاہیے۔"
پھر نہایت پُر خلوص آواز میں فرمایا۔

"ہم اس امر کو فراموش نہیں کر سکتے کہ صدیوں
سے ہم اسی ملک میں پیدا ہوتے رہے ہیں
اور یہیں پرورش پائی ہے اور یہی ہمارا
وطن ہے۔ ہماری قسمتیں اسی ملک سے
وابستہ ہیں اور اسی کی آئندہ اقبال مندی
میں ہمارا سود و بہبود منحصر ہے لہٰذا ہماری
تمام توجہیں مادر وطن کی ترقی میں صرف ہونی
چاہئیں۔ ہم کو تعلیمی حیثیت سے اپنے تئیں
اس قابل بنانا چاہیے کہ ہم اپنے عزیزانِ
وطن کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں
اور محض اس وجہ سے کہ ہم ان کی برابر ترقی
کے میدان میں گامزن نہیں ہو سکتے ہمیں
ان کے لئے بار نہ ثابت ہونا چاہیے ہمیں
یہ مناسب نہیں کہ جو لوگ آگے نکل گئے ہیں
ان کو پیچھے کھینچیں بلکہ ہم کو لازم ہے کہ ہم
خود اتنی ترقی کریں کہ ان کا ساتھ نہ چھوٹے۔"

علی گڑھ میں ان کی مسلسل جد و جہد اور پیہم تقریر و تحریر کا
مقصد صرف یہ تھا کہ ۔

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ مرحوم:۔ ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ نے ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کا جھنڈا اس وقت بلند کیا جب کسی کے حاشیہ خیال میں بھی اس کی اہمیت اور ضرورت کا احساس نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا تن، من، دھن سب کچھ اسی مقصد کے لئے وقف کر دیا۔ حالات کی ناساعدت نے بارہا ان کا دامن پکڑا اور مخالف قوتوں نے انہیں بارہا گھیرا لیکن ان کے پائے ثبات میں کبھی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ ان کے استقلال اور عزم کو دیکھ کر اقبال کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا تھا ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

تقریباً ۸۰ سال پہلے ایک تپتی ہوئی دوپہر میں ۱۴ مئی ۱۸۹۱ء کو شیخ محمد عبداللہ فرسٹ ایر میں داخلہ کے لئے لاہور سے علی گڑھ پہونچے۔

"مجھے اس بارک میں کمرہ ملا جس کو کچی بارک کہتے ہیں۔ میرے کمرے کے آس پاس بہت ممتاز طالب علم رہتے تھے مثلاً خواجہ غلام الثقلین مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کالج میں ان دنوں اسٹریچی ہال کی عمارت تعمیر ہو رہی تھی اگر روپیہ ہوتا تھا تو مدد لگ جاتی تھی ورنہ کام بند ہو جاتا تھا۔ سہ پہر کے بعد دیکھا کہ سر سید اپنی فٹن میں بیٹھ کر آئے اور مزدوروں کے پاس مونڈھے پر بیٹھ گئے اور ان کو ہدایت کرنی شروع کی کہ تم اینٹوں کے ردّے غلط لگا رہے ہو اس طرح لگاؤ۔ اس کو دوبارہ چنو۔ اس میں یہ اصلاح کرو میں دور سے کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔ ان کی شخصیت میں عجیب وقار اور دلکشی تھی۔

دوسرے تیسرے دن میں کچھ معززین کے خطوط لے کر جو لاہور سے ساتھ لایا تھا سر سید کی خدمت میں کوٹھی پر حاضر ہوا۔ سر سید نے نہایت شفقت اور مہربانی سے فرمایا کہ کبھی کبھی ہم سے مل جایا کرو۔ میں کبھی کبھی ان کے پاس جانے لگا۔ کیا بتاؤں ان سے ملنے کا مجھ پر کیا اثر ہوتا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دنیا کی سعادت یہاں ہے اور جس نے اس پیرِ جواں ہمت کو دیکھ لیا زندگی میں کچھ اچھا کام کرنے کا جذبہ اس میں بیدار ہو گیا۔ ان کی زندگی سے مجھے یہ سبق ملا کہ ؎

بارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

شیخ عبداللہ کا دامنِ دل علی گڑھ کی سرزمین نے ایسا پکڑا کہ پھر وہ اسی کے ہو گئے اور اپنی پوری عمر سر سید کے تعلیمی مشن کو مکمل کرنے کے لئے تعلیمِ نسواں کے وسائل بہم پہنچانے میں بسر کر دی۔ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ تعلیمِ نسواں کے سیکریٹری خود اپنی کوشش سے منتخب ہوئے۔

"جس روز میں سیکریٹری مقرر ہوا اسی روز سے میں نے اپنا دماغ اس شعبہ کے کام کی طرف لگانا شروع کر دیا اور تدبیریں سوچنے لگا۔ عبداللہ بیگم نے اپنے گھر ایک جلسہ کیا اور اس میں بہت سی عورتوں کو جمع کیا۔ محلہ میں ہر جگہ چرچا ہونے لگا کہ اب تو فرنگیوں کے طریقے اختیار کرنے کی تجویز ہو رہی ہے۔ لڑکیوں کے مدرسے کھلیں گے

اور لڑکیاں کھلے منہ مدرسے جایا کریں ؟

عوام کے خیالات میں تبدیلی لانے کے لئے ضروری تھا کہ کوئی رسالہ جاری کیا جائے جس طرح سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک کا سہارا "تہذیب الاخلاق" کو بنایا تھا شیخ عبداللہ نے سنہ ۱۹۰۴ء میں رسالہ "خاتون" کی داغ بیل ڈالی اور اعلان کیا۔

"خیالات اور اعتقادات، معاشرت اور سوسائیٹی کی حالت میں انقلاب جس شدت اور سرعت کے ساتھ آج کل ہندوستان میں ہو رہا ہے اس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے نظر آئے گی اس وقت مسلمان مردوں کی اصلاح و فلاح اور ترقی کے لئے تھوڑا بہت سامان موجود ہے مگر مسلمان عورتوں کے لئے کوئی مستقل اور قابل وقعت انتظام نہیں ہے بحیثیت انسان وہ ہماری توجہ اور غور کی مستحق ہیں بہ حیثیت مسلمان وہ ہماری ہمدردی کی حق دار ہیں اور بہ حیثیت عورتوں کے وہ ہماری شریک ہیں اور ان کا اور ہمارا معاملہ جدا نہیں ہے۔ ان کی تعلیم کا بھی وہی انتظام ہونا چاہئے جو مردوں کا ہے۔ وقت کا قافلہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر ہم نے فوراً عورتوں کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا تو ہمارا حال یہ ہوگا کہ

لاکھوں آفتاب پاس سے ہوکر گزر گئے
بیٹھے ہم انتظار سحر دیکھتے رہے "

رسالہ کا نکلنا تھا کہ اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ رسالہ کو بند کر دیا جائے لیکن جس نے سرسید کی آنکھیں دیکھی ہوں وہ مخالف طاقتوں کے

ویمن کالج کے بانی شیخ محمد عبداللہ مرحوم

آگے سپر کب رکھ سکتا تھا۔ ان کی جدوجہد جاری رہی اور جب بیگم صاحبہ بھوپال نے سو روپیہ ماہوار کی مدد ان کے مدرسہ کے لئے منظور کر دی تو ان کی کوششیں برگ و بار لانے لگیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں وہ تعلیم نسواں کے متعلق ایک ڈیوٹیشن لے کر گورنر یو پی سے ملے لیکن کوئی امید افزا صورت پیدا نہیں ہوئی انہیں کبھی امید کی کرن دکھائی دیتی تھی اور کبھی اندھیرا چھا جاتا تھا۔ اسی امید و بیم کی حالت میں انہوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ حالی نے یہ کہہ کر ان کی امید بندھائی ؂

اے بے زبانوں کی زباں اے بے بسوں کے بازو ؤ
تعلیم نسواں کی مہم جو تم کو اب پیش آئی ہے
یہ مرحلہ آیا ہے پہلے تم سے جن قوموں کو پیش
منزل پہ گاڑی ان کی استقلال نے پہنچائی ہے

ویمنز کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک منظر

ہے رسائی بھی پربت اگر دل میں نہیں عزم درست
پھر ٹھان لی جب جی میں پھر پربت بھی تو رائی ہے

جو مدرسہ صرف ایک استانی "اختری" کو ملازم رکھ کر شروع کیا گیا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ تعلیم نسواں کا ایک زبردست ادارہ بن گیا اور ۴۰ سال کی جدوجہد کے بعد جب شیخ صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کا کمزور و ناتواں جسم کالج کے ایک گوشہ میں سپرد خاک کیا گیا تو ایک طرف ویمن کالج کی وسیع اور خوبصورت عمارتیں ان کے عزم و خلوص اور لگن کی شہادت دے رہی تھیں تو دوسری طرف انکی نعش زبان حال سے کہہ رہی تھی ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

سرسید کی روح نے خاموشی سے اپنے جانشین کی اس جدوجہد کو دیکھا۔ پھر یکایک ان کی لوح تربت سے آواز آنے لگی ؎

اے کہ تیرا مرغ جاں تار نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی ہے مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی
سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ
تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے
ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

(ایک متعارف جو ۲۶ راپریل ۱۹۷۱ء کو سرسید ہال کی سالانہ تقریب کے موقع پر پیش کیا گیا۔) ●●

میرے زمانے کا علی گڑھ کالج

سعید الملک حافظ محمد احمد سعید خاں (نواب چھتاری) کی ڈائری

یاد ایام کے چند اوراق

(خاص ہما کے لئے)
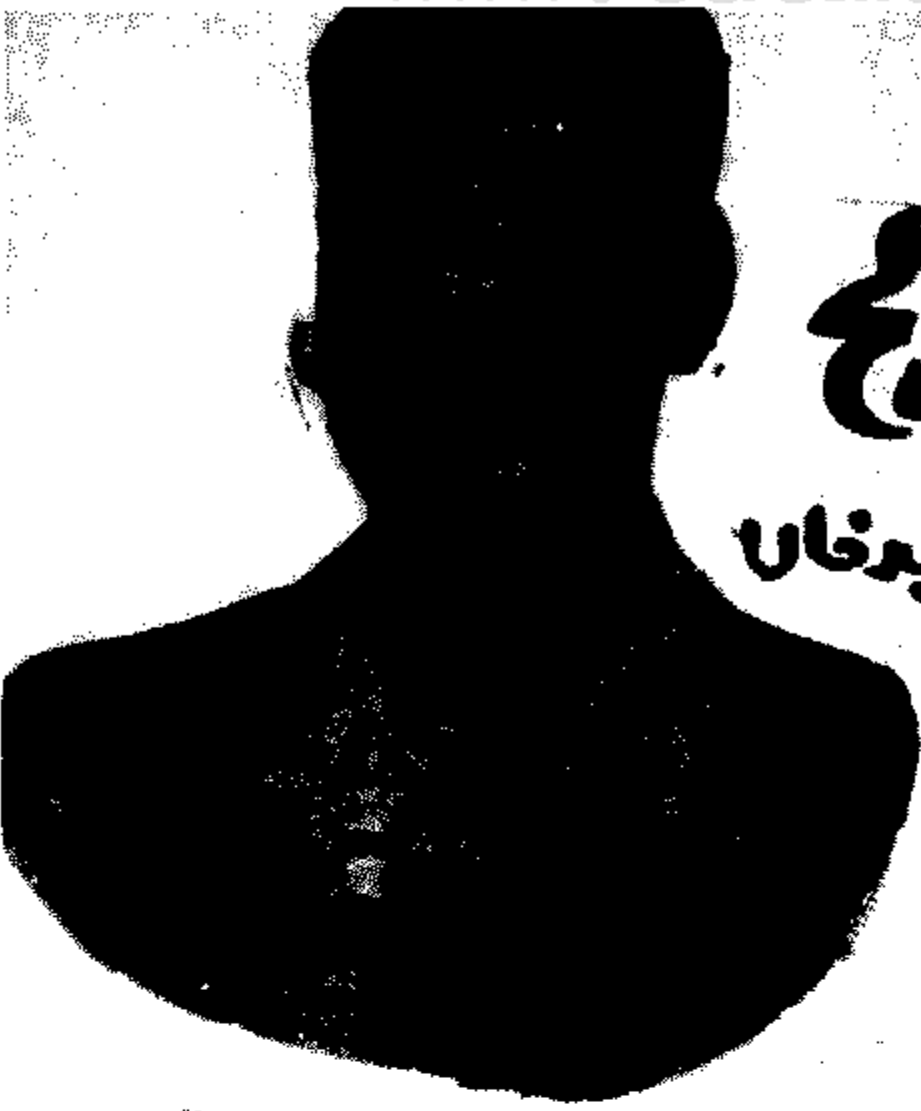
قیام باغپت میں میری انگریزی تعلیم پرائمری سے شروع ہوگئی تھی۔ چھتاری آنے کے بعد انگریزی کی تعلیم کا سلسلہ فوراً روک دیا گیا۔ چونکہ میرے دل پر مذہبی رنگ بہت چڑھا ہوا تھا میں نے حفظ قرآن پاک شروع کیا۔ دادا مرحوم انگریزی طرز معاشرت، انگریزی تعلیم اور مغربی کلچر سے بیزار تھے۔ وہ غدر کے زمانہ میں موجود تھے۔ انہوں نے بہادر شاہ کا قید ہونا خاندان شاہی کا خاک و خون میں ملنا آبرو ریزی اور خانماں بربادی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ انہوں نے وہ سب کچھ مٹتے دیکھا تھا جس کو وہ اخلاق، تہذیب اور انسانیت کا حاصل سمجھتے تھے جن کے بغیر زندہ رہنے میں ان کو نہ لطف آتا تھا نہ عزت محسوس ہوتی تھی۔ ان کو گوارا نہ تھا کہ میں انگریزی تعلیم یا انگریزی طور طریقوں سے کوئی سروکار رکھوں۔ سرسید مرحوم نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ بغیر تعلیم انگریزی اب کام نہ چلے گا۔ علی گڑھ کے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلی۔ میری تعلیم صرف حفظ قرآن تک محدود تھی اور طرز بود و ماند کلیتہً مشرقی اور ہندوستانی تھا۔ ایک بار میرے چچا نواب بہادر عبدالصمد خاں نے مجھے پمپ جوتا منگا دیا میں پہن کر چلا تو بجتہ فرش پر آواز آئی۔ نواب صاحب خلد آشیاں نے فرمایا کیا کوئی گھوڑا قلعہ کی چھت پر آگیا۔ مجھے ایک چھوٹا گھوڑا اور بادرن ہاتھی کا بچہ بھی خرید دیا تھا۔ ان کی زندگی میں میں نے بندوق تو کبھی نہیں چلائی مگر نجیب علی شکاری کو حکم تھا کہ ہر ہفتہ مجھے شکار کو لے جایا کریں۔ باز خانہ بھی میرے واسطے قائم کیا گیا اور باز، جرّے اور شکرے پائے جاتے تھے مجھے شکاری جانوروں کا بہت شوق تھا۔

مجھے سویرے اٹھنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی خاصی چاندنی میں جامع مسجد صبح کی نماز کے واسطے جانا یاد ہے۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ اکثر نماز میں رکوع کے وقت ہاتھ پھسل جاتے اور زمین پر ہاتھ رکھ کر گرنے سے بچتا۔

میں ان کی زندگی ہی میں حافظ ہوگیا تھا جس کی انہیں بہت مسرت ہوئی۔ نواب صاحب خلد آشیاں چاہتے تھے کہ میرا

قرآن شریف ختم ہوا۔ تمام حجام میں بیٹھ کر جامع مسجد جمعہ کی نماز کو گئے وہاں مجھ سے مسلمانوں کے مجمع میں ایک رکوع سنا اور نکتی کے بہت بڑے بڑے بلدو تقسیم کرائے۔ دورانِ علالت میں نواب صاحب میرے چچا سے جو اُن کے پاس چھتاری میں رہتے تھے اکثر کہتے تھے کہ تم ہمیں لے کر سفر مکہ کو چلو۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نہ کہ موت آجائے گی مگر اس سے بڑھ کر اور کون سی سعادت میسر آسکتی ہے۔

نواب صاحب نے دورانِ علالت میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا' ایک روز سہ پہر کے قریب نواب صاحب خلد آشیاں یکایک بے ہوش ہو گئے۔ مجھے لوگوں کا گھبرایا گھبرایا پھرنا یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ کوئی چیز سنگھائی جا رہی تھی۔ جب نواب صاحب کو ہوش آیا تو میرے چچا مرحوم سے فرمانے لگے کہ ہم نے اسوقت ایک عجیب خواب دیکھا یعنی یہ کہ ہمارا انتقال ہو گیا ہے اور ہماری روح کو بارگاہِ ایزدی میں پیش کیا گیا اور میزان پر ہماری نیکی اور بدی کا موازنہ کیا گیا تو بدی کا پلہ کچھ بھاری تھا۔ یعنی گناہ زیادہ تھے۔ ہم یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے مگر ہمیں یہ آواز سنائی دی کہ ایک ہفتہ کی مہلت دو۔ تاکہ اتنی ہی نیکیاں کرلائے اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ اس خواب کے ایک ہفتہ کے بعد رحلت فرمائی۔

نواب صاحب مرحوم نے گو میرا پورا کلام پاک نہیں سنا مگر چوبیس پارہ تک نوافل میں سنا تھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ جس روز اخیر پارہ پڑھنے کو تھا تو یہ حکم دیا کہ آج تہجد کے وقت سنیں گے۔

سخت سردی کا زمانہ تھا اور نواب صاحب ان کمروں میں مقیم تھے جو دیوان خانے کے قریب گرم حمام سے متصل ہیں۔ مجھے تین بجے اٹھایا گیا۔ وضو کیا اور نفل شروع کئے سنا ہے کہ تھوڑی دیر میں مجھے اتنی نیند آئی کہ کھڑے کھڑے ہی سو گیا۔ نواب صاحب مرحوم نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر نیت توڑ کر آگے بڑھے تو امام صاحب آنکھیں بند کئے کھڑے سو رہے تھے۔ مجھے صرف یہ یاد ہے کہ میرا منہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر فرمایا کہ "کتنے نیند آرہی ہے جا سو جا"۔

میں چھتاری میں رہتا تھا اور خوش قسمتی سے منشی وزیر خاں مرحوم ایک ایسے شفیق استاد مل گئے کہ جن کی مثال اس زمانہ میں تو ملنا مشکل ہے۔ وہ مجھے فارسی پڑھاتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا کمال یہ تھا کہ لذت طالب علمی حاصل ہو جاتی تھی۔ مجھے انہوں نے فارسی پڑھائی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کی سلسلہ کتب فارسی پڑھائیں اور فارسی کی دوسری کتابیں بھی۔ ان کی تعلیم کی خوبی یہ تھی کہ مجھے ہمانی فارسی پر ایسا اچھا عبور ہو گیا کہ جامی، نظامی، فردوسی کے کلام کو بلا دقت پڑھ لیتا اور معانی و مطالب سمجھ لیتا تھا۔

یہاں مجھے ایک فرمودہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا یاد آگیا۔ خاں صاحب امیر شاہ خاں مرحوم ایک صاحب تھے۔ ان کے پھوپھا نواب ولی داد خاں کے ہاں ملازم تھے نواب ولی داد خاں مالاگڑھ ضلع بلند شہر کے نواب تھے اور دہلی کے خاندان شاہی سے انکی رشتہ داری تھی۔ جب غدر کے بعد دہلی "اجڑا دیار" بن گیا اور نواب ولی داد خاں کو بھی اپنی جان بچانے کے واسطے روپوش ہونا پڑا تو میرے دادا نے ان کے اعزا و اقربا کی مدد کی اور یہ بزرگ چھتاری آکر رہے۔ خاں صاحب امیر شاہ خاں صاحب فرماتے تھے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ "طالب علمی لذتیست اگر حاصل شود خوانده نہ خوانده برابر است و اگر حاصل نہ شود خوانده و ناخوانده برابر"۔ منشی وزیر خاں کی تعلیم میں لذت طالب علمی حاصل ہو جاتی تھی۔

کلام پاک تو پہلے ہی ختم ہو گیا تھا مگر میرے استاد حافظ حمید اللہ خاں مرحوم کا اسی زمانہ میں انتقال ہو گیا میری عمر اس وقت دس گیارہ سال کی ہو گی۔ مجھے اب تک شرمندگی کے ساتھ یہ یاد ہے کہ ان کے انتقال کی خبر سے مجھے کتنی مسرت ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مارتے بہت تھے۔ ایک چمڑے کا تسمہ گز پون گز لمبا ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور میں قرآن حفظ سناتا تھا وہ پشت کی طرف ٹہلتے رہتے اور جہاں متشابہ لگا اگر مہربانی ہوئی تو ہونہہ کی آواز کان میں آئی اور میں نے سمجھ لیا کہ عبارت غلط ہے اور صحیح پڑھنا شروع کیا لیکن اگر ناخوشی ہوئی تو سڑاک سے چمڑا کمر پر پڑا اور میں بلبلا اٹھا۔ بہر حال یہ تو گزر گیا اب تو میں مرحوم کا شکر گزار ہوں کہ کلام پاک مجھے اب تک یاد ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ۱۸۹۹ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک کوئی محراب ناغہ نہیں ہوئی۔ گو مجھے قرآن پاک اتنا اچھا یاد نہیں جیسا ہونا چاہیے لیکن میں تو اس کو کلام پاک کا اعجاز خیال کرتا ہوں کہ اس نے اپنے ایک غلام کو باوجود اس کی نااہلی کے نہیں چھوڑا۔

عربی اور انگریزی تعلیم کا آغاز:۔ اس دوران میں کچھ عربی اور انگریزی شروع کی گئی عربی تو اپنے ہی مدرسہ میں شروع کی اور میزان و منشعب کی گردانوں تک چلی پھر ختم ہو گئی۔ انگریزی کے اکثر استاد رکھے گئے جن میں مولوی انعام الحق مرحوم حکومت ہند کے پولیٹکل صیغہ میں ڈپٹی سکریٹری ہوئے اور خدا سلامت رکھے سلام الدین صاحب ریاست بھوپال میں وزیر عدالت ہیں لیکن میری تعلیم خیر کے ساتھ یونہی سی ہوئی۔ پڑھنے کا شوق مجھے کبھی نہ تھا اور کوشش اس کی ہوتی تھی کہ استادوں کو بھی کھیل میں لگا لیا جائے اور اس کوشش میں اکثر میں کامیاب ہو جاتا تھا۔۔۔ سوائے منشی وزیر خاں مرحوم کے کہ وہ پڑھانے پاتے

حافظ محمد احمد سعید خاں (نواب چھتاری) جب مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بنے

مشہور ہے کہ کچھ نہ کچھ فارسی زبردستی آ گئی۔ لوگ اکثر کہتے ہیں کہ مکتب کی تعلیم جیسی ٹھوس ہوتی تھی اور لڑکے کے کردار پر جو اثر مکتبی تعلیم کا ہوتا ہے وہ اب اسکولوں کالجوں میں نہیں ہوتا لیکن جتنا وقت کہ مکتبی استادوں کو اپنے شاگردوں پر توجہ کرنے کا ملتا تھا اور جو تعلق قلبی انہیں اپنے شاگردوں سے ہوتا تھا وہ بھی تو اب مفقود ہو گیا ہے منشی وزیر خاں کو میرے ساتھ ایسا تعلق تھا کہ اگر میں ذرا بھی بیمار ہوتا تو وہ بےحد پریشان ہو جاتے۔ انتہا یہ

ہے کہ جب میری منسوبہ کے انتقال کے بعد میرے چچا نے اپنی دوسری بیٹی سے میری نسبت کرنی چاہی مگر جو عمر میں مجھ سے نو برس چھوٹی تھیں تو منشی جی نے اسے سن کر کہا کہ ہمارا لڑکا اتنا انتظار نہیں کر سکتا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اسی وجہ سے ان کی علیحدگی عمل میں آئی۔

میرے ایک اتالیق ملا محبوب خاں تھے۔ بڑے ہمدرد اور نہایت سیدھے آدمی ہزاروں دعائیں انہیں ازبر یاد تھیں۔ مثلاً وضو کی دعا، نہانے کی دعا حتیٰ کہ بیت الخلا جاتے وقت بھی دعا پڑھتے تھے۔ مجھے سب دعائیں یاد کرائیں مگر عملاً ہوتا یہ تھا کہ مثلاً میں غسل خانے گیا اور وہ دروازے پر کھڑے ہوئے بالجہر اللھم انی اعوذبک من الخبث والخبائث ومن الشیطان الرجیم ۝ پڑھ رہے ہیں۔

مجھے شکار کا بہت شوق تھا۔ گھوڑے پر بھی اہلیت تھا۔ میں کبھی گھوڑے کا اچھا سوار نہ بن سکا۔ بندوق بھی چلانے لگا تھا مگر یہ مشق کبوتر اور فاختاؤں تک محدود تھی اڑتے اور بھاگتے جانوروں کو مارنا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔

علی گڑھ کالج کے اسکول میں داخلہ: آخر کورٹ آف وارڈس نے یہ طے کیا کہ مجھے علی گڑھ کالج کے اسکول میں داخل کر دیا جائے میرے چچا نواب بہادر مرحوم کو خصوصیت کے ساتھ اس کا صدمہ تھا لیکن میرے دوسرے چچا نواب یوسف علی خاں مرحوم اس کی موافقت میں تھے۔ نواب یوسف علی خاں مرحوم اپنے بھائیوں میں نہایت دور اندیش اور ذہین تھے انہیں اس کا احساس تھا کہ انگریزی تعلیم ضروری ہے۔

چھتاری کے اکثر لوگوں کو اس کا صدمہ ہوا مولوی ممتاز علی صاحب مرحوم و مغفور تو آبدیدہ ہو گئے۔ یہ بڑے اچھے اور قابل طبیب تھے۔ ان کے صاحبزادے ہنوز ریاست میں طبیب ہیں۔ چھوٹے بڑوں میں عزت و محبت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میر اشفاق علی مرحوم کو بھی بہت افسوس ہوا اس زمانہ میں میری چھتاری کی زندگی کچھ اچھی نہ تھی۔ سارا وقت باز، جرے، بہری اور شاہین کے بنانے اور ان کی ادویات تیار کرنے میں صرف ہوتا۔ اکثر بے کار اور لفنگے لڑکے صحبت میں رہتے۔ تاش اور چوسر سے بھی شوق تھا۔ بٹیر بازی میں بھی کافی دسترس ہو گئی تھی۔ دو تین مرغ بھی پلے ہوئے تھے اور اس سب پر طرہ یہ تھا کہ ہماری ہر حرکت پر تحسین و آفرین ہوتی تھی۔ اس فضا میں میرا نہ رہنا ہی اچھا تھا۔ صرف اتنا غنیمت تھا کہ مجھے شکار اور بھاگ دوڑ کا بہت شوق تھا۔ موٹاپا اس قدر تھا کہ عرض مربع برابر۔ چچا نے میرے لئے ایک گائے مخصوص کر دی تھی جس کا دودھ شام کو ملتا تھا۔ میں جنوری [illegible] میں علی گڑھ آیا۔ پرشین وارڈ نامی ایک پھوس کا بنگلہ تھا وہاں قیام ہوا۔ کھانے کا انتظام ہمارا اپنا تھا۔ مولوی فصیح الدین مرحوم بطور اتالیق ساتھ رہتے اور حافظ حبیب الحق مرحوم قرآن سنتے تھے۔ حافظ جی تو کچھ روز بعد چھتاری واپس ہو گئے اس لئے کہ قرآن سنانے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ لیکن مولوی فصیح الدین عرصہ تک رہے۔ مولوی صاحب نہایت مہذب ذہین اور علم مجلس سے واقف تھے اور نہایت درجہ خوش نویس تھے۔ اس کے بعد میکنائل بورڈنگ ہاؤس میں چلا گیا۔ اس کے بعد انگلش ہاؤس میں داخل ہوا اور یوپلین میں رہنے لگا۔ انگلش ہاؤس اس زمانہ میں سرسید مرحوم کی کوٹھی میں تھا۔ کھانے پینے کا انتظام ہر جگہ میرا اپنا ہی رہا۔ اور بورڈنگ کے مقررہ کھانے سے اکتا کر اکثر بے تکلف دوست میرے ہی یہاں آ جاتے تھے اور ساتھ کھانے کا جو لطف مجھے اس وقت نصیب ہوا وہ مجھ میں ہمیشہ کے لئے راسخ ہو گیا اور میرا تجربہ یہ ہے کہ بہت سے پیچیدہ معاملے اکثر کھانے اور اٹھنے بیٹھنے سے طے پا جاتے ہیں۔

میرے زمانے کا علی گڑھ: استادوں میں اس زمانہ

کے خاص لنک اعلیٰ مسٹر ریس ہیڈ ماسٹر کے، میر ولایت حسین مسٹر انوار الحسن، ماسٹر قیام الدین وغیرہ تھے۔ جب میں شروع شروع علی گڑھ آیا تو میرا لباس وہی پرانی روش کا تھا۔ شاملہ ستارہ کی کامدار ٹوپی۔ اچکن پرانی کاٹ کی (حیدرآبادی شیروانی سے مختلف) اس پر ریشمی یا مخمل کا پاجامہ۔ پائنچے میں بٹن لگے ہوئے۔ اس لباس پر نہایت موٹا جسم گویا فٹ بال لڑھکتی جا رہی ہے۔ چنانچہ لڑکوں کے دربار سے "گوٹے کی گڑیا" کا خطاب عطا ہوا۔ مجھے اس خطاب سے ناگواری ضرور ہوئی لیکن لڑکوں کی یہ بے ساختہ پھبتی اپنی جگہ ٹھیک تھی کہیں ہو، "گوٹے کی گڑیا" کی آواز سنائی دیتی۔ یہ حالت تین چار ماہ رہی۔ پھر ہم بھی پرانے ہو گئے۔ لباس کا طرز بھی بدل گیا اور جو نئے لڑکے آئے انہیں پریشان کرنے میں ہم نے خود حصہ لینا شروع کیا۔ میں انگلش ہاؤس میں ایک صبح بیٹھا ہوا تھا۔ میرے اتالیق مولوی فصیح الدین پلنگ پر بیٹھے کلام پاک پڑھ رہے تھے کہ یکایک انہیں ایک دورہ ہوا۔ اسکے بعد سے مرگی کے دورے ہونے لگے۔ اس لئے مولوی عثمان صاحب اسرائیلی ساکن علی گڑھ کو میرا اتالیق مقرر کیا گیا یہ بہت نیک اور عالم شخص تھے مگر ان میں مولوی فصیح الدین صاحب کی ذہانت نہ تھی۔

زمانہ طالب علمی کے ساتھی۔ اس زمانہ کے ساتھیوں اور دوستوں میں چند کا ذکر بے موقع نہ ہوگا۔

سر راس مسعود یہ جماعت میں تو مجھ سے اونچے تھے مگر انگلش ہاؤس میں ہی ان کا زنانہ مکان بھی تھا اسلئے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ یہ بالعموم سلیپر پہنے نہایت ہی سریلی آواز میں یہ گاتے ہوئے بولیئن (جہاں میں رہتا تھا) کے پاس سے گزرتے تھے ؎

"مطرب خوش نوا بگو، تازہ بتازہ نو بنو"
بچپن میں تو کچھ غیر معمولی ذہانت کا پتہ نہ چلتا،

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

نواب حاجی محمد علی خاں صاحب مرحوم (نواب چھتاری کے والد محترم) جنہوں نے مدینہ منورہ میں وفات پائی

مگر جب بڑے ہوئے تو خوب ترقی کی۔ کے۔ سی (سر) ہوئے اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی۔

میرے ہم جماعت اور بورڈنگ فیلو سر سکندر حیات مرحوم بھی تھے۔ انہیں کھیلوں کا شوق بالکل نہ تھا اکثر کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ ذہین تھے اور انگریزی اچھی تھی مرحوم نے بڑی ترقی کی اور دو بار پنجاب میں گورنری کا کام بھی کیا میرے ان کے تعلقات میں عمر بھر کوئی کدورت نہیں آئی اور جس روز صبح حیدرآباد میں ان کے انتقال کی خبر سنی تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ گویا میرا بھائی مر گیا۔ بے اختیار آنسو نکل آئے۔ سر ناظم الدین مرحوم بھی انگلش ہاؤس ہی میں رہتے تھے اور میرے ہم جماعت تھے۔ بڑے شریف اور مخلص انسان تھے۔

ہما اردو ڈائجسٹ اگست ۱۹۷۵ء

سر راس مسعود اور سر ناظم الدین مرحوم

میرے زمانہ طالب علمی کے ساتھی تھے

اس وقت قلب کی عجیب حالت ہے۔ بیسیوں دوستوں کی تصاویر سامنے آرہی ہیں۔ کچھ تو ان میں سے ہمیشہ کے واسطے بچھڑ گئے۔ کچھ ابھی شاید زندہ ہوں مثلاً مصطفیٰ خاں خورجوی، مسعودالحسن ڈپٹی کلکٹر، واجد حسین ڈپٹی کلکٹر، صاحب زادہ ساجد علی خاں مرحوم، عبدالرشید خاں مرحوم پٹیالہ، عبدالواحد پٹیالہ، مسعودالزماں باندہ، میر محمود علی میسور، محمد جان خاں رام پور کے رئیس تھے۔ نہایت خدا ترس اور صاحب نسبت تھے۔ خدا اول الذکر حضرات کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جو زندہ ہیں انہیں خوش و خرم اور با عزت رکھے آمین۔

میری تعلیمی حالت:۔ میری حالت تعلیمی یہ تھی انگریزی میں سو میں پینتالیس اور پچاس سے زیادہ نمبر کبھی نہ ملے حساب کے معاملہ میں بالکل صفر یعنی ڈاکٹر ضیاءالدین کی ضد جتنی انہیں ریاضی سے نسبت تھی اتنی ہی میرے یہاں اس کی نفی ہے۔ امتحان حساب کا کیونکر پاس ہوتا تھا۔ اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ شاید میرے پرائیوٹ ٹیوٹرز آسانی سے بتا سکتے۔ مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ ایک بار جب امتحان کا زمانہ قریب آیا تو روزانہ کی مشق میں میں نے دیکھا کہ دو سوال ایسے ہیں کہ جو میرے پرائیوٹ ٹیوٹر تیسرے چوتھے روز مجھے نکالنے کو دیتے ہیں۔ جب امتحان کا روز آیا تو دیکھا کہ پرچہ میں دونوں سوال دھرے ہوئے ہیں۔ تاریخ اور جغرافیہ کچھ یونہی سر پڑ آتا تھا البتہ اردو اور فارسی میں مجھے کلاس میں سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اور بارہا فارسی اور اردو کے گھنٹہ میں میں نے کلاس کو خود پڑھایا ہے۔ آٹھویں کلاس کے سالانہ امتحان میں واجد علی شیدا صاحب مرحوم ممتحن تھے اور مجھے ۹۹ نمبر دیئے اور میری کاپی اپنے پاس دوسرے لڑکوں کو دکھانے کے واسطے رکھ لی۔ میں کلاس میں فرسٹ کبھی نہیں آیا اور ایک بار ڈبل پروموشن بھی ہوا یعنی ششماہی امتحان ہی میں چھٹی جماعت سے ساتویں میں ترقی مل گئی۔ اور سالانہ امتحان میں ساتویں بھی پاس کرلی۔ لیکن پہلے پانچ لڑکوں میں ہمیشہ آجاتا تھا۔

میری شرارتیں:۔ مجھے شرارت سوجھتی تو تھی مگر عملی حصہ لینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ میں نے کبھی کسی شریک شرارت دوست کی شکایت نہ کی نہ ان کے خلاف گواہی دی۔ ہاں چھوٹی چھوٹی شرارتیں خود بھی کرتا تھا۔ مثلاً کاغذ کی گولیاں بنا کر میں اور میرے دوست اپنی جیب میں رکھتے اور ایک تو دینیات کے مولوی صاحب کے گھنٹہ میں اور ایک اور ماسٹر صاحب جغرافیہ پڑھاتے تھے ان کے گھنٹہ میں برابر گولی باری ہوتی تھی۔ اگر استاد کا رخ میری طرف ہے تو دوسرے دوست نے گولی چلائی اور اگر رخ دوسری طرف ہے تو اس جانب سے نشانہ بازی ہوئی۔ ایک بار اس حسن خدمت کے صلہ میں پچاس لائن لکھنے کا جرمانہ بھی ہوا۔ ایک یہ شرارت اکثر ہوتی تھی کہ کرسی کی پشت پر چاک سے الٹا "الو" لکھ دیا اور جب ماسٹر صاحب نے ٹیک لگائی تو "الو" سیدھا ہو گیا۔ ایک بار میری کلاس کے چند لڑکوں نے کچھ چکادڑیں بیٹھی ہوئی تھیں

اعلیٰ نواب محمود علی خاں صاحب مرحوم (نواب چھتاری کے دادا) جو انگریزی تعلیم کے مخالف تھے

تجویز یہ ٹھہری کہ انہیں پکڑ کر اس ڈیسک میں بند کر دیا جائے جس میں حاضری کا رجسٹر رہتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دوسرے پیریڈ میں جب ماسٹر صاحب استادی کی کرسی پر متمکن ہوئے اور حاضری لینے کے لئے رجسٹر نکالنا چاہا تو ایک چمگادڑ تڑپ کر ان کی گود میں جا بیٹھی۔ ماسٹر صاحب کے چہرے کے تغیرات جن میں ڈر، غصہ اور حیرت سب بیک وقت کارفرما تھے میری نظروں میں اب تک محفوظ ہیں۔

ایک واقعہ اور بھی بچپن کی شرارتوں میں قابلِ ذکر ہے ہمارے یہاں ایک ڈرائنگ اسکول ماسٹر تھے ان کے ایک صاحبزادے مصطفیٰ نامی میرے کلاس فیلو تھے ایک روز انہیں یہ سوجھی کہ لنچ کے واسطے وقفہ ہوا تو چاقو سے کرسی کے بید کو جس پر بیٹھا جاتا تھا کچھ اس طرح کاٹا کہ بظاہر تو جڑا رہا مگر قریب قریب کٹ چکا تھا۔ ان کی اس جدت طرازی کا علم لنچ سے آتے ہی ہمیں بھی ہو گیا۔ دو ایک اور لڑکوں کو بھی پتہ چل گیا۔ اتنے میں ماسٹر صاحب تشریف لائے۔ ان کی عادت تھی کہ کتاب ڈیسک پر پٹخ کر زور سے کرسی پر بیٹھتے تھے۔ کرسی کا بید تو پہلے ہی مجروح تھا۔ جوں ہی ماسٹر صاحب بیٹھے گلدستہ بن گئے۔ ہاتھ اور ٹانگیں باہر اور ماسٹر صاحب کرسی کے اندر۔ اُدھر ماسٹر صاحب کا اِدھر میرا چہرہ سرخ ہو گیا صرف فرق یہ تھا کہ میرا ہنسی کے مارے اور ان کا غصہ سے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو اطلاع ہوئی مسٹر ریس بہت ہی اچھے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انہوں نے فوراً تحقیقات کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفیٰ پکڑے گئے اور ریس صاحب نے جسمانی سزا دی۔

زمانہ طالب علمی کے چند دلچسپ واقعات

میرے ہی زمانہ میں پرنس آف ویلز کی حیثیت سے شہنشاہ جارج پنجم تشریف لائے۔ مجھے وہ نظارہ اب تک یاد ہے وہ انگلش ہاؤس آئے سب ان کے انتظار میں کھڑے تھے کہ یکایک مجھے چکر آیا اور دھڑ سے گرا۔ خیر یہ ہوئی کہ پرنس اس وقت تک نہ آئے تھے۔ خدا جانے یہ کیوں ہوا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں بالکل تندرست ہو گیا اور جب پرنس آئے تو ان کے خیر مقدم میں شریک ہوا۔ اسی موقع پر شہزادہ کی تفریح کے واسطے فٹ بال اور ہاکی فیلڈ میں کچھ کھیل کئے گئے تھے وہاں میں بھی موجود تھا اور سر جیمس لاٹوش لیفٹیننٹ گورنر تھے میرے چچا نے مجھے لے جا کر ان کے سامنے پیش کیا ان کی شکل اس وقت تک مجھے یاد ہے بڑے نیک اور رحمدل انسان معلوم ہوتے تھے ہز رائل ہائی نس آغا خاں بھی اسی زمانہ میں تشریف فرما ہوئے یہ اس وقت بالکل کم عمر تھے۔ شاید تیس ۳۰ بتیس ۳۲ کی عمر ہو گی۔ بہت خوب

وائی، بی، چوہان

یہ سچ یہ تاریخ کا یادگار مظاہرہ ہے کہ جہاں آزادی کے وقت ہمارے مسلمان بھائیوں نے ہم سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کیا وہیں مسلمانوں کی ذہنی قبلہ گاہ مسلسل ہمارا ساتھ دے رہی ہے، اس قبلہ گاہ کے تربیت یافتہ نوجوانوں کو اسلام کے بہترین جوہروں کو سامنے لانے دیجئے تاکہ فراخ دلی کے ساتھ ہماری مشترکہ جمہوری تہذیب کو ان سے سنوارا جاسکے، وہ جمہوری تہذیب جس کے ثمرات سے آج ہم متمتع ہو رہے ہیں اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں جن سے فائدہ اٹھائیں گی۔ (۲۳ر دسمبر ۱۹۵۹ء کانووکیشن)

یو، این، ڈھیبر

علیگڑھ آنے سے پہلے مجھے یہاں سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں تھیں لیکن یہاں آکر وہ سب ختم ہوگئیں، ہندو مسلم اتحاد قومی ترقی کے لئے سب سے بڑا ہتھیار ہے جو علیگڑھ بڑے حسن وخوبی سے بنا رہا ہے۔

ضرورت جوان تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جو بڑی دلکش اور جاذب تھی۔ میں نے اسے بہت محسوس کیا، اسی موقع پر مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم نے ہز ہائی نس کو مخاطب کرکے برمحل یہ شعر پڑھا تھا جسکو سب نے بے حد پسند کیا اور ہز ہائی نس بھی بہت مسرور ہوگئے اور برسوں زباں زد عام رہا ۔

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

کالج میں شاہ افغانستان کی آمد اور میرا دینیات میں امتحان

شاہ کابل امیر حبیب اللہ خاں مرحوم بھی اسی زمانہ میں آئے۔ ان کی آمد کی بڑی دھوم دھام رہی۔ مجھے کل کی سی بات یاد ہے کہ نواب محسن الملک بہادر آئے اور مجھے اور چند اور لڑکوں کو جنہیں مذہبی ذوق تھا پکڑ کر آسمان منزل میں لے گئے معلوم یہ ہوا کہ امیر صاحب چند لڑکوں سے مل کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انہیں اسلامی عقائد اور مسائل پر کیسا عبور ہے —— علی الدین صاحب نے جو ابھی ڈپٹی کلکٹری سے ریٹائر ہوئے ہیں قرآن شریف پڑھ کر سنایا۔ اور خوب پڑھا۔ امیر صاحب مرحوم بہت ہی متاثر معلوم ہوئے پھر مسائل شرعیہ کے متعلق استفسار ہوا تو قرعہ فال ہمارے نام نکلا اور بچپن کی "ملا بدھن" کی پڑھائی کام آئی۔ انہوں نے دو سوال کئے، جن میں سے فقط ایک یاد رہ گیا ہے۔ لیکن اتفاق سے دونوں کے جواب بالکل صحیح دیئے۔ جو سوال یاد ہے وہ یہ تھا کہ اگر کوئی بے وضو یا غسل کی ضرورت ہو اور وہ بلا ارادہ دریا میں گر جائے یا بغیر نیت پاکی غسل یا وضو کرے تو اس کا غسل یا وضو ہوا یا نہیں جس کا جواب میں نے اثبات میں دیا کہ بلانیت کے بھی غسل اور وضو ہوجائے گا تو امیر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اگر ایسے ہی بلانیت تیمم کرے تو کیا وہ پاک ہوجائیگا۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس واسطے کہ تیمم میں نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس پر امیر صاحب نے فرمایا کہ یہ فرق کیوں ہے؟ یہاں منشی وزیر خاں کی مکتبی پڑھائی کام آئی اور میں نے جواب دیا کہ پانی طاہر بھی ہے اور مطہر بھی لیکن خاک فقط طاہر ہے مطہر نہیں اسے حکماً ضرورتاً مطہر بنا دیا ہے اور اسی واسطے بلانیت کے وہ پاک نہیں کرسکتی۔ امیر صاحب بہت خوش ہوئے اور باہر نکلنے کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے مجھے بہت دلداری اور کہا کہ تم نے ہماری لاج رکھ لی۔

میں نویں جماعت میں تھا کہ سلسلۂ تعلیم ختم ہوگیا۔ مجھے اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی کہ چھتاری میں رہنا ہوگا۔ وہ زمانہ بھی کیا تھا جب نہ سوچنا بھی ایک تفریح تھی۔ ★

شاہین ملک۔ ایم اے (علیگ)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ماحول ایک ایسا ادبی ماحول ہے جس میں رہ کر خود بخود حسِ مزاح پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں طلباء بات میں بات پیدا کرنا خوب جانتے ہیں۔ اکثر شاعرے لطائف کو جنم دیتے ہیں۔ ادبی محفلیں دلچسپیاں پیدا کرتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ قہقہوں کی دنیا آباد کرتا ہے۔ وہ انسان جس کا ذرا سا بھی تعلق مسلم یونیورسٹی سے رہا ہے اپنی اس حس کی بنا پر فوراً پہچان لیا جاتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار ہم لوگ چھٹیوں میں گھر جا رہے تھے ہمارے کمپارٹمنٹ میں یونیورسٹی کے ایک استاد بھی اپنی بیگم کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اتفاق سے دونوں ہی کافی موٹے تھے اور کھڑکی کے نزدیک بیٹھے تھے۔ ایک اسٹیشن پر دو لڑکے ہمارے کمپارٹمنٹ کے پاس آئے اور استاد و بیگم کو دیکھ کر ایک بولا "کیا یہ ڈبہ ہاتھیوں کے بچوں کیلئے مخصوص ہے؟" استاد محترم نے ایکدم جواب دیا "جی نہیں کتے کھبے بھی آسکتے ہیں۔ تشریف لائیے" سارا کمپارٹمنٹ قہقہوں سے گونج اٹھا اور دونوں لڑکے! فوراً غائب۔

اگر مسلم یونیورسٹی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ایسے بہت سے لطیفے نظر سے گذرینگے جن کو پڑھ کر بے اختیار مسکراہٹ لبوں پر رقص کرنے لگتی ہے۔ سرسید احمد خاںؒ سنجیدہ ماحول کو اپنی پرلطف باتوں سے لالہ زار بنا دیا کرتے تھے اور یہی حال ان کے رفقاء کا بھی تھا۔

جب سرسید نے اپنی تعلیمی و اصلاحی تحریک شروع کی اور جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کی تفسیر لکھی تو ان کے خلاف ایک عظیم طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ انہیں کافر، ملحد، نیچری وغیرہ کے خطاب دیئے گئے۔ ان کے معاونوں کا بھی بُرا حال کیا گیا۔ مولانا حالیؔ کے مقابلے میں خالیؔ اور ڈفالیؔ جیسے حریف سامنے آئے علمائے کرام نے ان کے خلاف فتوے دینے شروع کر دیئے۔ انہیں میں ایک بزرگ مولوی علی بخش بھی تھے جنہوں نے صرف سرسید کے خلاف علمائے دین سے فتویٰ لانے کے لئے سفرِ حج کا قصد فرمایا۔ جب وہ فتویٰ لیکر واپس آئے تو سرسید نے ان کے بارے میں تحریر کیا "مولوی علی بخش ہمارے کفر کا فتویٰ لینے کے لئے مکّہ معظمہ تشریف لے گئے چنانچہ ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج نصیب ہوا۔ سبحان اللہ! ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی، کسی کو ہاجی، کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بنا دیتا ہے۔"

کرنل بشیر حسین زیدی جو ۳ر اکتوبر ۱۹۵۶ء سے ۱ر نومبر ۱۹۶۲ء تک مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے وائس چانسلر رہے

ایک بار سرسید، مولانا شبلی اور سید ممتاز علی ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ سرسید کا ایک ضروری کاغذ کھو گیا۔ وہ اسے تلاش کر رہے تھے مگر ملتا نہ تھا۔ اتفاقاً شبلی کو وہ کاغذ الگ پڑا ہوا مل گیا انہوں نے یونہی سرسید کو ذرا پریشان کرنے کے لئے کاغذ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا کہ سرسید کی نظر اس پر نہ پڑے مگر سرسید بھانپ گئے کہ وہ کاغذ شبلی دبائے بیٹھے ہیں مسکرا کر بولے "بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ جو چیز گم ہو جاتی ہے شیطان اسے اپنے ہاتھ کے نیچے دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ حضرت مولانا! ذرا دیکھئے کہیں میرا کاغذ آپ کے ہاتھ کے نیچے تو نہیں ہے؟"

ایک مرتبہ ایک شخص نے سرسید کو خط لکھا کہ اگر کوئی شخص نماز میں بجائے عربی عبارتوں کے ان کا اردو ترجمہ پڑھ لے تو کوئی حرج یا نقصان تو نہیں ہے۔ سرسید نے جواب میں لکھا کہ ہرگز کوئی حرج یا نقصان نہیں ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ نماز نہیں ہوگی۔

ایک شخص نے سرسید کو خط میں لکھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ تعریف کر رہے ہیں کہ ان کی ساری عمر قوم کی خیر خواہی میں گذری۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بزرگ آپ ہی ہیں۔ پس میری مشکل اگر حل ہوگی تو آپ ہی سے ہوگی۔ سرسید نے جواب میں لکھا: "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور جس آدمی کو آپ نے خواب میں دیکھا تھا وہ شیطان ہوگا۔"

سرسید کے ساتھی مولانا حالی ایک مرتبہ سہارن پور تشریف لے گئے وہاں ایک زمیندار کے یہاں ٹھہرے۔ گرمی کے دن تھے، حالی کمرے میں لیٹے تھے۔ زمیندار صاحب نے ایک کسان کو بلا کر کہا کہ ان صاحب کو پنکھا جھل۔ وہ پنکھا جھلنے لگا کچھ دیر کے بعد اس نے سوال کیا کہ یہ کون صاحب ہیں میزبان نے کہا کہ کم بخت تو ان کو نہیں جانتا سارے ہندوستان میں مشہور ہیں، یہ مولوی حالی ہیں۔ اس پر غریب کسان حیرت سے بولا "ہالی بھی مولوی ہو سکے ہے" (وہ حالی کو ہالی یعنی ہل چلانے والا سمجھا)

مولانا لیٹے تھے سوئے نہ تھے کسان کا جملہ سن کر پھڑک گئے اور فرمایا "حضرت! اس تخلص کی داد آج ملی ہے؟"

مولانا حالی کے دوستوں میں مولوی وحید الدین سلیم (لٹریری معاون سرسید) تھے۔ ایک روز وہ مولانا حالی کے

پاس بیٹھے تھے۔ مولانا نے نئی غزل سنائی تو سلیم پھڑک اُٹھے کہنے لگے "مولانا ! واللہ جادو ہے۔" مولانا کے بالا خانے کے نیچے ایک کوٹھری تھی وہ ایک مجذوب فقیر کو دے رکھی تھی۔ وہ باہر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ اس کے کان میں یہ فقرہ پڑا تو بے اختیار چلا اٹھا "جادو برحق کرنے والا کافر۔" مولانا نے مسکرا کر کہا "لیجئے مولوی صاحب سرٹیفکٹ بھی مل گیا۔"

مولانا حالؔی اور مولوی سلیمؔ باتیں کر رہے تھے۔ ایک شخص آیا اور مولانا سے پوچھنے لگا کہ حضرت میں نے غصہ میں آکر اپنی بیوی کو طلاق دیدی اب اپنے کئے پر افسوس ہے میری بیوی بھی راضی ہے مگر مولوی صاحب کہتے کہ اب تو طلاق ہو گئی، اب بتائیے کیا کروں۔

ابھی مولانا کچھ کہنے ہی والے تھے کہ مولوی سلیم بول اٹھے "تم نے "ط" سے طلاق دی تھی یا "ت" سے۔"

اس شخص نے کہا "میں تو جاہل ہوں میں کیا جانوں "ط" سے طلاق کیسی ہوتی ہے اور "ت" سے کیسی۔"

سلیم نے سمجھایا "یہ تو بتاؤ تم نے کھینچ کر قرات سے طلاق کہا تھا جس میں ط کی پوری آواز نکلتی ہے یا پھر سیدھے سادے طریقے سے کہا تھا جس میں "ط" کی نہیں "ت" کی آواز نکلتی ہے۔"

اس نے کہا "مولوی صاحب میں نے معمولی طریقے سے کہا تھا، قرات سے نہیں۔"

یہ سن کر مولوی سلیم نے اطمینان کا سانس لیکر کہا "ہاں بس معلوم ہو گیا کہ تم نے "ت" سے طلاق دی تھی جس کے معنی ہیں آ محبت کے ساتھ مل بیٹھ "تم بے فکر ہو کر بیوی کو گھر لے آؤ۔ اگر کوئی کچھ کہے تو صاف کہہ دیجیو میں نے "ت" سے طلاق دی تھی "ط" سے ہرگز نہیں۔"

سرسید کے رفیق خان بہادر مولانا ذکاء اللہ وقت کے بہت پابند تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روز دن کے ٹھیک نو بجے اپنے گھر سے نکل کر کہیں جایا کرتے تھے۔ ایک دن جو گھر سے باہر نکلے تو سرسید کے لڑکے سید محمود ہاتھ میں گھڑی لئے اپنے گھر کے سامنے ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ مولانا نے پوچھا "میاں یہاں کیوں کھڑے ہو۔" سید محمود نے جواب دیا "جی میں اپنی گھڑی کو کوک دینی بھول گیا تھا اس لئے بند ہو گئی۔ اب آپ کے انتظار میں کھڑا تھا کہ گھڑی کا وقت درست کر لوں۔"

بدرالدین طیب جی ۲۸ نومبر ۱۹۶۲ء سے ۲۸ فروری ۱۹۶۵ء تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے

مسلم یونیورسٹی کے طلباء بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم

نواب علی یاور جنگ جو یکم مارچ ۱۹۶۵ء سے ۵ جنوری ۱۹۶۸ء تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں

پر چلے اور سیکڑوں لطیفوں کو جنم دیا۔ مجاز یونیورسٹی کی شمشاد مارکیٹ میں ٹہل رہے تھے۔ قریب سے ایک رکشا گزرا۔ مجاز نے رکشا رکوایا اور رکشے والے سے پوچھا "اسٹیشن جاؤ گے؟" رکشا والے نے جواب دیا "ہاں میاں جاؤں گا۔" "تو جاؤ" مجاز نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔

ڈاکٹر ہادی معصوم رضا کا چہرہ داڑھی مونچھوں سے عاری ہے۔ جب وہ علی گڑھ میں تھے تو ایک بار انہوں نے یونہی شوقیہ مونچھیں رکھ لیں۔ ان دنوں ان پر کوئی مقدمہ چل رہا تھا۔ ایک بار شمشاد مارکیٹ میں کسی دوکان سے کچھ سامان خرید رہے تھے۔ ایک معتقد مل گئے، مونچھوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "ارے بھائی یہ مونچھیں کیوں رکھ لی ہیں" ڈاکٹر رضا نے مسکرا کر کہا "تاکہ اگر مقدمہ ہار جاؤں تو ان کو منڈا دوں اور اگر جیت جاؤں تو ان پر تاؤ دوں۔"

ایک بار مسلم یونیورسٹی کے تین طلبا ٹرین سے کہیں جا رہے تھے۔ ایک لڑکا اوپر سامان والی برتھ پر بیٹھا تھا اور دو نیچے بیٹھے تھے۔ ٹکٹ چیکر اندر داخل ہوا اور ان سے ٹکٹ مانگے۔ ان میں سے ایک لڑکے نے ٹکٹ نکال کر چیکر کو دیدیا۔ چیکر نے کہا "یہ تو نصف ٹکٹ ہے۔" "ہم بھی تو نصف ہی ہیں" لڑکے نے مسکرا کر کہا۔ چیکر نے کہا "کیا مطلب؟" لڑکے نے سمجھاتے ہوئے کہا "دیکھئے ایک اوپر ہے اور دو نیچے یعنی ایک بٹا دو ہوئے۔ اسی لئے ٹکٹ بھی ایک بٹا دو یعنی نصف ہے" اور ٹکٹ چیکر کمپارٹمنٹ میں گونجنے والے قہقہوں میں ڈوب کر رہ گیا۔

ایک ٹرین میں چند طلبا چھٹیوں میں گھر جا رہے تھے۔ ٹکٹ چیکر کمپارٹمنٹ میں گھسا اور ان سے ٹکٹ مانگے "ٹکٹ چاہئے؟" طلبا کے لیڈر نے سخت لہجہ میں کہا "ابھی دیتے ہیں آپ کو۔" اس نے طلبا کو اشارہ کیا وہ سب اپنے جوتوں کے بند کھولنے لگے۔ یہ دیکھ کر ٹکٹ چیکر بہت بوکھلایا اور گھبرا کر کھڑکی کی طرف بھاگا۔ ایک لڑکے نے اسے پکڑ لیا "ٹھہرئیے ٹکٹ تو دیکھتے جائیے۔" چیکر کانپنے لگا۔ اتنی دیر میں طلبا نے اپنے جوتے اتار لئے تھے۔ چیکر کا خوف دیکھ کر سب نے قہقہہ لگایا۔ ان کا لیڈر بولا "قبلہ گھبرائیے نہیں آپ ہمارے بزرگ ہیں اور ہم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا ہیں۔" اور طلبا کے جوتوں میں سے ٹکٹ نکل کر چیکر کے ہاتھ میں آ گئے۔ یہ دیکھ کر چیکر جھینپی جھینپی ہنسی کے ساتھ ٹکٹ چیک کرنے لگا۔ اور دوسرے مسافر کسی طرح اپنے قہقہے نہ روک سکے۔

★★

مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین

(جاوید حبیب)

جس طرح مسلم یونیورسٹی ملک کے دیگر تعلیمی اداروں میں ایک مخصوص حیثیت رکھتی ہے اسی طرح مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کو بھی ملک کے دیگر تعلیمی اداروں کی۔۔۔ اسٹوڈینٹس یونینوں کے مقابلے میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کی آرزو تھی کہ "ملک کی دیگر اسٹوڈینٹس یونینیں بھی مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کی طرح ہو جائیں" اور اس طرح ہماری یونین کو "مدر یونین" کا درجہ حاصل ہے۔

یہ یونین "سڈنس ڈبیٹنگ یونین کلب" کے نام سے قائم ہوئی۔ بانیٔ درس گاہ سرسید نے اس کے قیام کیوقت کہا تھا کہ "خود لڑکے بھی باہم مل کر ایک کلب بنائیں گے، جس کا نام انشاء اللہ تعالیٰ مثل کیمبرج کی کلب کے یونین کلب کہلائے گا۔ علمی باتوں اور دنیاوی علوم میں مباحثہ ہوا کریگا اور قواعد اسکے بعینہٖ وہی ہوں گے جو کیمبرج یونین کلب کے ہیں"۔ یونین کلب قائم ہوا اور بعینہٖ انہیں خطوط پر قائم ہوا۔ لائق و فاضل اساتذہ کی سرپرستی اور طلبار کے ذوق و انہماک نے اس کلب کو درس گاہ کے کلب کی حیثیت بخش دی اور خود سرسید نے اس کلب کی ممبری کے لیے کالج میں داخلہ لینے کی شرط پوری کرنیکی خواہش کی۔

یونین کی عمارت کا ایک گوشہ

اس کلب کے ذریعے نہ صرف یہ کہ طلباء میں تحریر و تقریر کی صلاحیتیں اُجاگر ہوئیں بلکہ اس کی رنگارنگ ادبی اور علمی سرگرمیوں کی بدولت آزادانہ تحقیق، فراخ حوصلگی اور غیر متعصبانہ علمی شغف نیز قوم و ملک کی تعمیر و خدمت کی اسپرٹ پیدا ہو گئی۔ اور یہ کلب طلبار کی علمی، ثقافتی اور ذہنی تربیت کا محور و مرکز بن گیا اور اس کلب کے زیر سایہ خواجہ غلام الثقلین، مولانا محمد علی، راجہ مہندر پرتاپ، سید محمود، ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، غلام السیدین جیسی عظیم شخصیتوں نے جنم لیا اور اس عظیم تربیت گاہ میں اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا۔

یونیورسٹی بننے کے بعد بھی یہ یونین اپنے ماضی کی روایات پر گامزن رہی اور اسی یونین کے پلیٹ فارم سے خلافت تحریک، تحریک عدم تعاون، اور تحریک آزادیٔ ہند کی لہریں اٹھیں اور پورے ملک پر چھا گئیں، اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ ملک کا ہر بڑا لیڈر اور قومی رہنما اس یونین کا مہمان بننے کا مشتاق رہتا۔

ملک اور بیرونِ ملک کے سیاسی رہنما، مذہبی عالم، اصحاب علم و ادب اس یونین کے مہمان بنے اور طلبار سے مخاطب ہوئے اور طلبار کی بے نظیر علمی، ادبی اور ثقافتی

یونین کا الیکشن جیتنے کے بعد یونین کے عہدیداران قیصر محمود اور عارف محمد خاں اپنے ورکروں کے ساتھ

سرگرمیوں اور خوبیٔ تحریر و تقریر اور ان کی شستہ و شائستہ روایات اور روشن اقدار کا کبھی نہ بھلانے والا اثر لیکر گئے۔

ایم۔ اے۔ او کالج اور یونیورسٹی کے بہت سے مخالف جب یونین کے جلسوں میں شریک ہوئے اور انھوں نے طلبار کی سرگرمیاں دیکھیں تو اپنی رائے تبدیل کی ان میں گوکھلے اور یو۔ این۔ دھیبر جیسے لوگ شامل ہیں اور موجودہ زمانے میں مشہور صحافی نرادسی چودھری کے تاثرات جو کہ انکے علی گڑھ آنے سے پہلے کے تاثرات سے قطعاً مختلف تھے اسکی چھوٹی سی مثال ہے۔

یونین ہال میں جب مہمان تقریر کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو ہال کی چھت پر سے ایک مخصوص ڈھنگ سے پھولوں کی بارش کی جاتی ہے اور طلبار اس موقع پر پُر زور تالیاں بجاتے ہیں اسی کے ساتھ طلبار کی مہمان نوازی، لطافت، طرز گفتگو، شائستگی اور وقار مل کر میزبان پر ایسا اثر کرتے ہیں کہ وہ علی گڑھ کے گُن گانے لگتا ہے اور اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ کے طلبار کو پھول کی پتّی سے ہیرے کا جگر کاٹنا بھی آتا ہے!

مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کی ہمہ جہتی سرگرمیاں طلبار کے مسائل سے دلچسپی اور علمی، ادبی، ثقافتی سرگرمیوں کی بدولت آج بھی اسٹوڈینٹس یونین یونیورسٹی کے دل کی حیثیت رکھتی ہے۔

یونین کی سرگرمیوں کو ہم درج ذیل حصوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

۱۔ طلبار کے تعلیمی، اقامتی اور انتظامی مسائل۔

کینیڈی ہال میں مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی "انسٹالیشن سیری منی" (INSTALLATION CEREMANY) دائیں سے بائیں وائس چانسلر ڈاکٹر علیم خطاب کرتے ہوئے۔ منتخبہ صدر سید قیصر محمود، نائب صدر افتخار حسین خاں، معتمد اعزازی عارف محمد خاں

۲۔ تحریری و تقریری سرگرمیاں۔
۳۔ علمی و ادبی سرگرمیاں۔
۴۔ دوسرے تعلیمی اداروں سے روابط۔
۵۔ ثقافتی سرگرمیاں اور انڈور گیمس۔
۶۔ تعلیمی وظائف اور اسکول۔
۷۔ استقبالیے۔
۸۔ الیکشن۔

۱۔ پہلے زمرے میں اقامتی زندگی میں روزمرہ پیش آمدہ مسائل، نیز اقامت گاہوں اور شعبوں میں پیدا شدہ بدنظمیوں سے شکایات اور اسی قسم کے دیگر مسائل آتے ہیں ان کے حل کے لیے پہلے گفتگو، ملاقاتوں اور تجویزوں نیز باہمی میل جول کے ذریعے کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے مسئلہ حل نہ ہو تو علامتی اسٹرائک اور پھر بھی مسئلہ حل نہ ہو تو علامتی ہنگر اسٹرائک کا جو کہ تمام طلبا کرتے ہیں سہارا لیا جاتا ہے اور ۹۹ فی صدی مسئلوں کا یہاں تک پہنچتے پہنچتے حل نکل آتا ہے۔ اسٹرائک یا مظاہرے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ پُرامن، پُروقار اور پوری طرح منظم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ذریعے نہ تو یونیورسٹی کی املاک کو کبھی نقصان پہنچا اور نہ کبھی اساتذہ کی بے حرمتی کے دائرے میں یہ احتجاج یا مظاہرے داخل ہوئے۔

۲۔ تحریری اور تقریری سرگرمیوں کے لیے یونین کے ذریعے مضمون نویسی اور تقریری مقابلے ہوتے ہیں، ایک اسپیکرز رائٹرز کلب اور ایک اسکول آف پبلک اسپیکنگ اینڈ پارلیمینٹری پریکٹس یونین کے زیر اہتمام چلتا ہے۔

راجہ
مہندر پرتاپ
یونین آفس
میں

اسی کے ساتھ اردو اور انگریزی تحریری اور تقریری مقابلوں کے لیے گولڈ میڈل بھی دیے جاتے ہیں۔ گولڈ میڈل حاصل کرنے کے لیے مخصوص تحریری اور تقریری مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔

۳۔ علمی ادبی سرگرمیوں میں سمپوزیم، سیمنار اور جلسوں کا اہتمام کیا جاتا ہے نیز عظیم شخصیتوں کے خصوصی یوم منائے جاتے ہیں۔ سیمنار اور سمپوزیم کل ہند پیمانے پر بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یونین کا ترجمان علیگیرین اردو اور انگریزی زبان میں شایع کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ یونین کی اپنی ذاتی لائبریری اور ریڈنگ روم بھی ہے۔

۴۔ دوسرے تعلیمی اداروں سے روابط کے لیے مختلف جگہوں پر سیمناروں، جلسوں اور کانفرنسوں میں طلبا کے وفود بھیجے اور بلائے جاتے ہیں۔

۵۔ اس سلسلے میں شستہ و شائستہ ڈرامے ــــــ موک کانووکیشن بہت سلیقے بہت پرکیف اور دلچسپ انداز میں اسٹیج کیے جاتے ہیں۔ نیز یونین کے کامن روم میں

کینیڈی ہال
میں
تقریری
مقابلہ

انڈور گیمس بلیرڈ، ٹیبل ٹینس وغیرہ کا انتظام ہے۔

۶۔ یونین کی جانب سے مستحق طلبار کی رفیع ریلیف فنڈ کے ذریعے مالی مدد کی جاتی ہے۔ ہماری یونین ایک امتیازی اور تعمیری کام انجام دے رہی ہے وہ یہ کہ اس کے زیر اہتمام ایک پرائمری اسکول جس میں یونیورسٹی کے ملازمین کے بچے تقریباً مفت تعلیم پاتے ہیں بحسن وخوبی چلایا جارہا ہے۔ غالباً اس کی مثال ملک کی اور کوئی یونین پیش نہیں کرسکتی۔

۷۔ یونین کا ایک بہت ہی اہم کام یہ ہے کہ ملک اور بیرون ملک کی ممتاز شخصیتوں کو مدعو کرے اور ان کو استقبالیے پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ پون صدی میں شاید ہی کوئی قابل ذکر شخصیت ایسی ہو جو یہاں نہ آئی ہو۔

۸۔ ان سب کاموں کے علاوہ یونین کے ذریعے قرآت کے مقابلے، جنرل نالج کے مقابلے اور اسی قسم کے دوسرے مشاغل شامل ہیں۔ یونین نے سوشل سروس کے کاموں، قومی دفاعی فنڈ اور فسادات کے لیے ضرورت پڑنے پر

مہمانوں کا استقبال اور باہمی مشورے

ہمیشہ اپنی حدود میں رہ کر کوششیں کی ہیں اور فنڈ اکٹھے کیے ہیں۔

الیکشن :۔ اگر الیکشن کا ذکر نہ کیا جائے تو یونین کا ذکر ادھورا اور خشک رہ جائے گا۔ یونین کا الیکشن بھی اپنا مخصوص طرز اور مثالی روایتیں رکھتا ہے۔ آئیے ہم اس کا جائزہ لیں۔

یونیورسٹی کا نیا سال شروع ہوتے ہی الیکشن کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ جن طلبار کو الیکشن لڑنا ہوتا ہے وہ اچانک سرگرم ہو جاتے ہیں۔ طلبار سے تعلقات بڑھانے لگتے ہیں، عام مسائل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ غیر معمولی طور پر شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس ہو جاتے ہیں۔ یہی سب سے بڑی علامت ہوتی ہے اور لوگ اس پر آوازے کسنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب جن صاحب نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا ہوتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ سلام شروع کر دیں گے اور ان کے سلام میں بڑی عاجزی پیدا ہو جائے گی اور وہ مصافحہ کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیں گے۔ یہ ابتدائی مرحلہ فیلڈ بنانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ ایک سال پیشتر ہی فیلڈ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔

اب دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے کہ الیکشن لڑنے والے پرانی کابینہ پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ جلد از جلد الیکشن کرائے اور پرانی کابینہ اس فکر میں رہتی ہے کہ کسی بہانے

الیکشن ملتے رہیں غرض ایک دن الیکشن ہونے کا اعلان ہو جاتا ہے بس اسی روز سے ہما ہمی شروع ہو جاتی ہے۔

امیدواروں کو سپورٹرس اور ورکرس کی تلاش ہوتی ہے مخلص ورکر کم اور نمائندے کی جیب کے وزن کو دیکھ کر زیادہ ورکرس مل جاتے ہیں، چائے اور ہوٹل بازی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اس کو علی گڑھ کی مخصوص زبان میں "کٹنا" کہا جاتا ہے۔ جو امیدوار جتنا زیادہ بے وقوف ہوگا اتنا ہی "کٹے گا"۔ یہ پرانا اصول ہے۔ اور پرانے امیدوار اپنے سپورٹرس سے چندہ کی اپیل کر کے خود انہیں کو "کاٹنا" شروع کر دیتے ہیں۔

نامزدگی کے فارم بھرنے کے بعد باقاعدہ کنویسنگ شروع ہو جاتی ہے ہر امیدوار کے ساتھ دو ایک پرانے الیکشن باز چیف سپورٹرس کی حیثیت سے اور چند ورکرز ہوتے ہیں۔ صدارت، نائب صدارت اور سکریٹری شپ کے امیدواروں کے باقاعدہ کیمپ قائم ہو جاتے ہیں۔ روایت یہی رہی ہے کہ عام طور پر کیمپ سرسید ہال میں بنایا جائے کبھی کبھی امیدوار مناسب کمرہ نہ ملنے پر دوسرے ہال میں کیمپ بناتے ہیں۔

نامزدگی کے فارم کی جانچ کی پیٹنگ ہو جانے کے بعد امیدواروں کی طرف سے باقاعدہ انتخاب لڑنے کا اعلان ہوتا ہے یہ اعلان ایک تقریب میں کیا جاتا ہے جس میں عام طور پر چائے اور نمک پارے پیش کیے جاتے ہیں اور یونیورسٹی کے تمام سینئرز اور نمایاں طلبا کو اس میں مدعو کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر امیدوار اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے بعض سپورٹرز امیدوار کی توصیف و تعریف نیز اس کے الیکشن لڑنے کے ہمہ گیر فوائد اور اس کی بے مثال قائدانہ صلاحیتوں کے گن گاتے ہیں بعض امیدوار تو اظہار خیال کو بھی کسرِ شان سمجھتے ہیں اور اس موقع پر بھی دوسرے ہی ان کی طرف سے اظہار خیال کرتے ہیں۔ شرکا کی توجہ اور توجہ چائے اور نمک پاروں پر ہوتی ہیں اور تقریری پروگرام ختم ہوتے ہی چائے اور نمک پاروں پر دھاوا بول دیا جاتا ہے اس تقریب کے بعد امیدوار کے لیے یونین کے لیے اور یونیورسٹی کے لیے نعرے لگائے جاتے ہیں اور پھر حسب توفیق کندھوں پر یا پیدل ہی امیدوار

ملکی فلاح و بہبود کے موضوع پر گفتگو

کو جلوس کی شکل میں اپنے کیمپ تک لے آیا جاتا ہے اور اب یہاں بیٹھ کر تمام سیاسی پیچ اور سرپیچ منصوبے بناتے ہیں۔ اور ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہیں اور ہر امیدوار کے سپورٹرس اپنے امیدوار کو اپنے خاص حساب کے ذریعے کامیابی کا پورا یقین دلا دیتے ہیں۔

کیمپ میں آنے کے بعد رات کو رہائشی ہالوں اور ہوسٹلوں کا دورہ (راؤنڈ) ہوتا ہے۔ امیدوار صاحب دولہا کی طرح آگے آگے، زندہ باد کے نعروں میں ہر ہوسٹل میں پہنچتے ہیں، ہر کمرے میں جاتے ہیں، سب سے ہاتھ ملاتے ہیں، ہاتھ ملاتے وقت تھوڑا سا جھکنا اور مسکرانا ضروری ہوتا ہے اور بقدر ظرف ہاتھ کو دبانا بھی جس سے بے تکلفی کا اظہار ہو سکے۔ امیدوار کے سپورٹرس ساتھ ہی امیدوار کے انتخابی کارڈ بھی بانٹتے جاتے ہیں۔ پھر تقریر ہوتی ہے اور سوالات وجوابات اور واپس کیمپ آکر سب لوگ اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں کیمپ میں حسب توفیق چائے وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔ اور اب خاص محفل جمتی ہے۔

اس میں دن بھر کا جائزہ لیا جاتا ہے اور آئندہ کا منصوبہ بنتا ہے مخالفوں کے راز اور کمزوریوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس موقع پر سینئر "الیکشن باز" بڑھ چڑھ کر اپنی کوششوں کا ذکر کرتے ہیں کہ آج انہوں نے فلاں ہوسٹل ہموار کر دیا اور کل فلاں ہال پکا ہو جائے گا یہ الگ بات ہے کہ موصوف کا زیادہ وقت چائے اور سگریٹ پینے اور آرام سے سونے میں گزرا ہو۔ اسی قسم کے "متحرک" سپورٹرس عام طور پر ہار کا سبب بنتے ہیں۔

راتوں رات یونیورسٹی کے چپے چپے پر رنگا رنگ پوسٹر لگا دئے جاتے ہیں، پھر امیدواروں کی "کوالی فیکیشن" بنتی ہیں پہلے مخالف امیدواروں کی کمزوریوں کو اُجاگر کرنے کے لیے بہت ہی دلچسپ انداز میں "ایلیمی" یا "ہجو نامے" تقسیم ہوتے تھے جو عرصے تک یاد رہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اس میں سر پھٹول کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ لہٰذا یہ سلسلہ اب بند ہے۔ باوجود اس کے کہ دیواروں پر پوسٹر لگانے کی اجازت نہیں لیکن اتنے پوسٹر لگا دیئے جاتے ہیں کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیواروں پر پوسٹر نہیں بلکہ پوسٹروں میں دیواریں لگا دی گئی ہیں۔

کنویسنگ، راؤنڈ اور انفرادی ملاقاتوں کے بعد امیدواروں کے خاص سپورٹرس اور ورکرس کو ہم نوا بنانے کی کوشش جسے "سپورٹر توڑنا" کہا جاتا ہے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد خاموش معاہدے اور گروپ سپورٹ کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً اعظم گڑھ گروپ، بہار گروپ، جنوبی ہند کے طلبا، کشمیری طلبا یا غیر ملکی طلبا اور طالبات، ان کی حمایتیں حاصل کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔

غرض پوری یونیورسٹی میں دن رات الیکشن کی دھوم مچی ہوتی ہے۔ طالبات میں کنویسنگ کو سپورٹرس مقدس فریضہ سمجھتے ہیں، ہر طرف جوڑ توڑ، معاہدے، مخالفت، دعوے، وعدے، شرطیں اور سرگرمی ہوتی ہے۔

یہاں تک کہ یونین میں "الیکشن تقریر" ہوتی ہے اس میں عام طور پر کسی امیدوار کی تقریر سنی نہیں جاتی کیوں کہ طلبا کا بے پناہ ہجوم، نعرے بازی، اپنے امیدوار کے کارڈ پھینکنا اور پھر یہ ڈر کہ کسی مقرر کی تقریر زیادہ اثر انداز نہ ہو جائے۔ غرض ایک ڈیڑھ گھنٹے کی اس روایتی تقریر بازی میں شور ہی شور رہتا ہے۔

اس تقریری پروگرام کے بعد امیدوار کو دوبارہ کیمپ تک لایا جاتا ہے اور اب اسے الیکشن کا نتیجہ نکل جانے تک اسی کیمپ میں رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے اب الیکشن کیمپوں

پیدا ہو جاتی ہے۔ چائے اور دائے کا سلسلہ بڑھ جاتا ہے سمجھدار قسم کے امیدوار کے دانش مند سپورٹرس جن کے کیمپ میں چائے وغیرہ کا معقول انتظام نہیں ہوتا ان کیمپوں میں چائے والے پیتے ہیں جہاں صرف چائے ہی چلتی ہے اور کام باتوں کی حد تک۔ اب کنویسنگ انفرادی اور خاموشی سے ہوتی ہے اور امیدوار گوشہ نشین ہو کر گویا اعتکاف میں یا ما یوں بیٹھ جاتے ہیں۔ اب امیدوار نمازوں کا پابندی سے اور دعاؤں کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔

آخر کار پولنگ کی رات آجاتی ہے اور رات بھر دوڑ بھاگ، جوڑ توڑ اور آخری کنویسنگ ہوتی رہتی ہے اور امیدواروں کو اپنے حق میں الیکشن سے کنارہ کش کرانے کی کوششیں جاری رہتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر سینیرز کا فیصلہ "غیر جانب دار طلبا کی رائے"، "بہی خواہان یونین کی اپیل" کسی ایک امیدوار کے خلاف یا حق میں بہت تیزی اور خاموشی سے بانٹی جاتی ہیں۔

پولنگ کے وقت تمام امیدواروں کے ورکرز، بیج لگا کر قطاروں میں پولنگ اسٹیشنوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ کچھ ٹولیاں راؤنڈ پر نکل کھڑی ہوتی ہیں۔

پولنگ کے بعد ہفتوں کی تھکن کے بعد سب گہری نیند سو جاتے ہیں۔ بے چارہ امیدوار اب بھی فتح و شکست کی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ اس غریب کا دو ہفتوں میں تقریباً کچومر نکل چکا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ دوسرے دن ووٹوں کی گنتی شروع ہو جاتی ہے اور ہزاروں طلبا وہاں جمع ہو جاتے ہیں اور منٹ منٹ کی خبر امیدواروں تک پہنچاتے ہیں ——— آخر کار رزلٹ نکل آتا ہے جیتنے والے امیدواروں کے کیمپوں پر ہزاروں طلبا کا ہجوم ہوتا ہے تمام جیتے ہوئے نمائندوں پر پھولوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے اور وہ فلک شگاف نعروں کے ساتھ پوری یونیورسٹی میں چکر لگاتے اور شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہارنے والے خوددار امیدوار پھر کبھی کسی کو نظر نہیں آتے۔ ہاں جو نیم خوددار ہوں وہ علی گڑھ تو پہلی فرصت میں چھوڑ دیتے ہیں لیکن پھر نمودار ہو جاتے ہیں بعض امیدواروں کے ووٹوں کی کل تعداد ان کے ورکرز کی کل تعداد سے بھی کم رہتی ہے۔ ★

یونین کے عہدیدار

برائے ۷۲-۱۹۷۱ء

مربی۔ پروفیسر عبدالعلیم۔
ٹرشرار۔ ڈاکٹر رشید الظفر۔
صدر۔ سید قیصر محمود۔
نائب۔ جناب اقتدار حسین خاں۔
معتمد اعزازی۔ عارف محمد خاں۔
محمد عمران۔ انچارج رفیع ریلیف وسیمنار آن اسلام۔
تاج احمد۔ استقبالیہ۔
پی کے خالد۔ کامن روم (ہلبرڈ)
آفتاب عالم خاں۔ کامن روم، مالک کانوکیشن کوپی سیمنار۔
ابو تحمہ۔ ریڈنگ روم۔
خالد عمر خاں۔ اسکول آف پبلک اسپیکنگ اینڈ پارلیمنٹری پریکٹس، آل انڈیا مشاعرہ مقابلہ قرأت۔
اقتدار خاں۔ نائب صدر یونین اسکول کے انچارج بھی بنائے گئے۔

علی گڑھ کول

(از مولوی محمد اسلم جیراجپوری)

کالج کو خاص علی گڑھ میں قائم کرنے کے جو وجوہ اور اسباب تھے وہ بجائے خود بہت معقول ہیں، اس نواح کے روٴسا، و اہلِ دول کی علمی دل چسپی اور فیاضی سے اس کالج کو ہر قسم کے فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل نظم میں صرف اس سرزمین کی خصوصیات جس پر یہ کالج قائم کیا گیا ہے۔ شاعر نے دکھائی ہیں۔ ادارہ

وہ کول اب کہ جس کا علی گڑھ ہے نام
جہاں میں عجب طرفہ تر ہے مقام

کہ اتنا تو دنیا میں مشہور ہے
مگر دیکھنے کی نہیں کوئی شے

عمارات عمدہ نہ سڑکیں فراخ
نہ قصرِ معلّیٰ، نہ ایوان و کاخ

نہ اونچے مکاں ہیں نہ کوٹھے بلند
نہ بازار شائستہ و دل پسند

نہ مسجد، نہ مندر، نہ گرجا، نہ دیر
کہ جس کی کرے اجنبی آکے سیر

نہ کوئی سڑک ہے یہاں خوشنما
نہ کچھ چوک ہی شوکت و شان کا

جگہ تنگ ہے اور دکانیں ہیں پست
عمارت کی ہے بد قوارہ نشست

وہ گلیاں ہیں کاواک و پست و بلند
سنبھل کر نہ چلئے تو پہونچے گزند

قرینہ کا کوئی محلہ نہیں
نہ شوکت، نہ زینت، نہ رونق کہیں

نہ تفریح کا کوئی ایسا مقام
جہاں لوگ جاکر پھریں صبح و شام

نہ گلشن ہے کوئی، نہ ہے کوئی باغ
کہ ہو جس کی بو سے معطّر دماغ

سواد اس کا خشک اور ویران ہے
جدھر دیکھئے اک بیابان ہے

نہ سبزہ کہیں ہے، نہ ہے مرغزار
کہ دیکھے کوئی جاکے جس کی بہار

اِدھر اور اُدھر ہیں ببولوں کے جھنڈ
نہ چشمہ کہیں ہے، نہ پانی کا کنڈ

جدھر دیکھئے سخت پانی کا کال — نہ ندی، نہ نالا، نہ دریا، نہ تال
اگر آپ کہئے کہ عنصر ہیں چار — یہاں کوئی شاید کرے اعتبار
جو پانی نہیں ہے تو مچھلی کہاں — نہ کھانے کو ملتی ہیں مرغابیاں

وہ گرمی میں آندھی کے طوفان روز — کہ تاریک ہو مہرِ عالم فروز
ہواؤں کے جھونکے وہ تند اور سخت — کہ گرتے ہیں صدمہ سے جن کے درخت
ہر اک سمت اڑتی ہوئی خاک دھول — کہ صحرا کو بھی آدمی جائے بھول
دریچہ اگر رہ گیا ہے کھُلا — تو سامان مٹی میں سب مل گیا
وہ بارش میں کیچڑ، خدا کی پناہ — کہ جوتے کا ہے سخت مشکل نباہ
جہاں چھپ سے جوتا زمیں پر پڑا — تو چھینٹا وہیں آستیں پر پڑا
وہ دیمک کی کثرت یہاں الاماں — کہ گویا ہے یہ سرزمیں اس کی کان
نہ رکھئے برابر اگر دیکھ بھال — تو چیزوں کا بچنا ہے اس سے محال

زمیں ہے یہاں کی خراب اس قدر — کہ پیدا نہیں کوئی اچھا ثمر
ہیں امرود خشک اور کھٹے تمام — کہ کھاؤ تو ہو جائے فوراً زکام
نہ کیلا رسیلا، نہ شاداب بیر — نہ آم ایسے میٹھے کہ ہوں کھا کے سیر
جہاں پر میسر نہ ہووے شکر — وہاں کیا ملے اور کوئی ثمر
یہاں کی زمیں کچھ اُگاتی نہیں — شریفہ نہیں، ناشپاتی نہیں
وہ گل جن کی آنکھوں کو ہے جستجو — نہیں اس گلستاں میں ان کی نمو
نہ ہے لالۂ آتشیں رُو یہاں — نہ سروِ خرامانِ دل جُو یہاں
عبث پھول کرتی ہے بلبل تلاش — کہ فطرت یہاں کی نہیں گل تراش

جو آب و ہوا میں لطافت نہیں — کسی چیز میں بھی طراوت نہیں
نہ اعضا میں چستی، نہ دل میں نشاط — نہ خاطر میں تفریح اور انبساط
نہ صورت میں ہے شان و شوکت نہ فر — نہ دل میں امنگوں کا کوئی اثر
ارادے قوی ہیں، نہ ہمت بلند — قویٰ مضمحل، جسم راحت پسند
نہ کوشش، نہ جوشش، نہ شورش، نہ دھوم — نہ زندہ دلوں کا کہیں پر ہجوم
نہ رنگیں طبیعت، نہ رنگیں لباس — جو افسردہ دل ہے تو چہرہ اداس
نہ شیریں ہو جس سرزمیں کا ثمر — وہاں کیا ہوں شیریں شمائل بشر

مگر دیکھئے کیا ہیں قدرت کے کھیل — کہ کالج کی ڈالی یہاں داغ بیل
یہاں پر جڑا لا کے وہ کوہ نور — کہ جس کی گئی روشنی دور دور
بنایا یہاں ایسا دار العلوم — کہ اس شہر کی مچ گئی جس سے دھوم
ہوئی مرکزِ علم یہ سرزمیں — کوئی شہر اب اس کا ہمسر نہیں
یہ کالج ہے گویا کہ اک تاجِ زر — جو رکھا گیا اس کے بالائے سر
ہوا اس سے روشن علی گڑھ کا نام — کہ عالم میں ہے اب وہ مشہور عام
جہاں دیکھئے شرق سے غرب تک — علی گڑھ کا شہرہ ہے زیرِ فلک
اب اس شہر کو دیکھنے کے لئے — چلے آتے ہیں لوگ ہر سمت سے
مجالس ہیں روز اور محافل ہیں روز — ہزاروں طرح کے مشاغل ہیں روز
خلایق کا مرجع ہوا اب یہ شہر — لگے آنے فرمانروایانِ دہر
کیا اس کو کالج نے مقبولِ عام — نہ تھا ورنہ اسلم یہ دل کش مقام

منش کردہ ام رستم داستاں
وگرنہ سیلے بود در پاستاں

ماخوذ از ۔ علی گڑھ منتھلی ۔ بابت ماہ دسمبر ۱۹۱۵ء جلد ۱۳ شمارہ ۱۲

ں کی گود میں سرسید کا بچپن گزرا

(ایم رحمان)

۱۸۸۴ء میں برصغیر کی تعلیمی حالت کی تحقیقات کے لئے ایک ایجوکیشن کمیشن قائم کیا گیا۔ سرسید احمد خاں اس کے ممبر تھے۔ ان سے تعلیم نسواں کے بارے میں سوال کیا گیا۔ تو انہوں نے اثنائے شہادت میں فرمایا:

"خود میں نے فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنی ماں سے پائی نیز اوائل عمر میں مجھے بہت سے مفید اور اخلاقی سبق میری والدہ نے دیئے، جو اب تک بعینہٖ مجھے یاد ہیں۔"

سرسید احمد خاں کی والدہ کا نام عزیز النساء بیگم تھا۔ وہ نواب دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ اگرچہ صرف قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں لیکن نہایت لائق، منتظم، ذہین، رحمدل اور بااخلاق تھیں۔ سرسید احمد اپنی ابتدائی تعلیم کا جو انہوں نے اپنی والدہ سے حاصل کی، اس طرح ذکر کرتے ہیں:

"میں نے خود گلستان کے سبق ان سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں۔ مجھ کو خوب یاد ہے جب میں ان کو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر کرتا، تو وہ سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتیں۔ اگرچہ وہ خفا تو کئی بار ہوئی ہوں گی مگر ان سوت کی لڑیوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی۔"

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایسے شخص نے سرسید احمد خاں سے بدی کی جس سے انہوں نے کبھی بہت بڑا سلوک کیا تھا۔ اتفاق سے وہ تمام ثبوت جس سے اسے پوری سزا عدالت سے مل سکتی تھی۔ ان کے ہاتھ آ گئے اور سرسید انتقام لینے پر آمادہ ہو گئے، ان کی والدہ نے جب سنا، تو کہا:

"اگر تم اس کو معاف کر دو تو اس سے عمدہ کوئی کام نہیں اور اگر تم کو اس کی بدی کی سزا حاکم سے دلوائی ہے تو نہایت نادانی ہے کہ اس قوی اور زبردست احکم الحاکمین کے چنگل مجبور ایک اعمال کی سزا دینے والا ہے، چھوڑ کر دنیا کے ضعیف و ناتواں حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو۔"

سرسید کہتے ہیں اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس وقت سے میرے دل میں کبھی کسی شخص سے انتقام لینے

اردو ڈائجسٹ ہما اگست ۱۹۷۲ء

کا خیال نہیں آیا۔

سرسید ایک اور واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی، میں نے ایک نوکر کو جو بہت بڈھا اور پرانا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور تھوڑی دیر بعد میں گھر گیا تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا: اس کو نکال دو، جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے، یہ گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا، چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک دوسری ماما میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا، نکلی اور مجھے میری خالہ کے گھر لے گئی، میری خالہ نے کہا، دیکھو تمہاری والدہ تم سے کس قدر ناراض ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھے گا، اس سے بھی خفا ہوں گی، مگر تم کو میں چھپائے رکھتی ہوں اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں چھپا دیا۔ تین دن تک میں اس کوٹھے میں چھپا رہا، میری خالہ میرے سامنے لڑکوں اور بہنوں سے کہتی تھیں "دیکھنا آپا جی کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں"۔ تین دن کے بعد میری خالہ میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں۔ انہوں نے کہا "اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے تو میں معاف کروں گی"۔ وہ نوکر ڈیوڑھی میں بلایا گیا، میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے جب تقصیر معاف ہوئی۔"

سرسید اپنے ایک دوست سے ہمیشہ ملنے جایا کرتے لیکن اتفاق سے وہ دوست ناراض ہو گئے اور انہوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا، سرسید بدستور ملتے رہے لیکن ایک مدت بعد انہوں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔ جب ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے سبب دریافت کیا ــــــ سرسید نے جو بات تھی، کہہ دی۔ انہوں نے کہا:

"نہایت افسوس ہے جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو جب دوستی ہے تو اسے پورا کرنا چاہیے یہ تمہارا فرض ہے تم کو بدستور اپنا فرض ادا کرنا چاہیے اس سے تم کو کیا، دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں۔"

عزیز النسا بیگم غریب اور مسکین عورتوں کی ہمیشہ خبر گیری کرتی تھیں اور مکان کا ایک حصہ ان کے رہنے سہنے اور علاج کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک غریب اور لاوارث بڑھیا زینن تھی جو مرتے دم تک ان کے ساتھ رہی ــــ اتفاق سے وہ اور زینن ایک ہی زمانے میں بیمار ہو گئیں۔ جو دوا حکیم ان کے لئے تجویز کرتا تھا، وہی دوا زینن کو پلاتی تھیں دونوں کو صحت ہو گئی۔ اس کے بعد حکیم نے ایک قیمتی معجون تجویز کیا جو سرسید تیار کرا کر لائے چونکہ انہیں یقین تھا کہ زینن کو یہ قیمتی معجون کوئی تیار کر کے نہیں دے گا، وہ خفیہ خفیہ زینن کو کھلاتی رہیں اور خود چکھی تک نہیں۔ اس سے زینن کی صحت میں بہت کچھ ترقی ہوئی اور ساتھ ہی ان کی صحت بھی اچھی ہو گئی۔ چند روز بعد جب سید صاحب نے کہا: "اس معجون نے تو آپ کو بہت فائدہ کیا" تو انہوں نے ہنس کر جواب دیا "کیا تمہارے نزدیک خدا بغیر دوا کے صحت نہیں دیتا؟" سید صاحب کو یہ سن کر بہت تعجب ہوا اور پھر سارا قصہ معلوم ہوا۔

ان کے بڑے بیٹے یعنی سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا انتقال عین جوانی میں ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر کوئی ۲۷ سال کی ہو گی جیسا کچھ انہیں رنج ہوا ہو گا، وہ ظاہر ہے۔ سب لوگ گریہ وزاری میں مصروف تھے ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہتے تھے اور زبان سے صرف یہ الفاظ نکلے: "خدا کی مرضی" لیکن بڑا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ اتفاق سے انہی دنوں میں قریب کے عزیزوں کی ایک بیٹی کی شادی تھی۔ سامان شادی ہو چکا تھا، تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی جب یہ موت واقع ہوئی، اس لئے حسب دستور ان لوگوں نے اس شادی کو ملتوی کرنا چاہا مگر سید احمد خاں کی والدہ اس انتقال کے تیسرے روز ان کے گھر گئیں اور کہا:
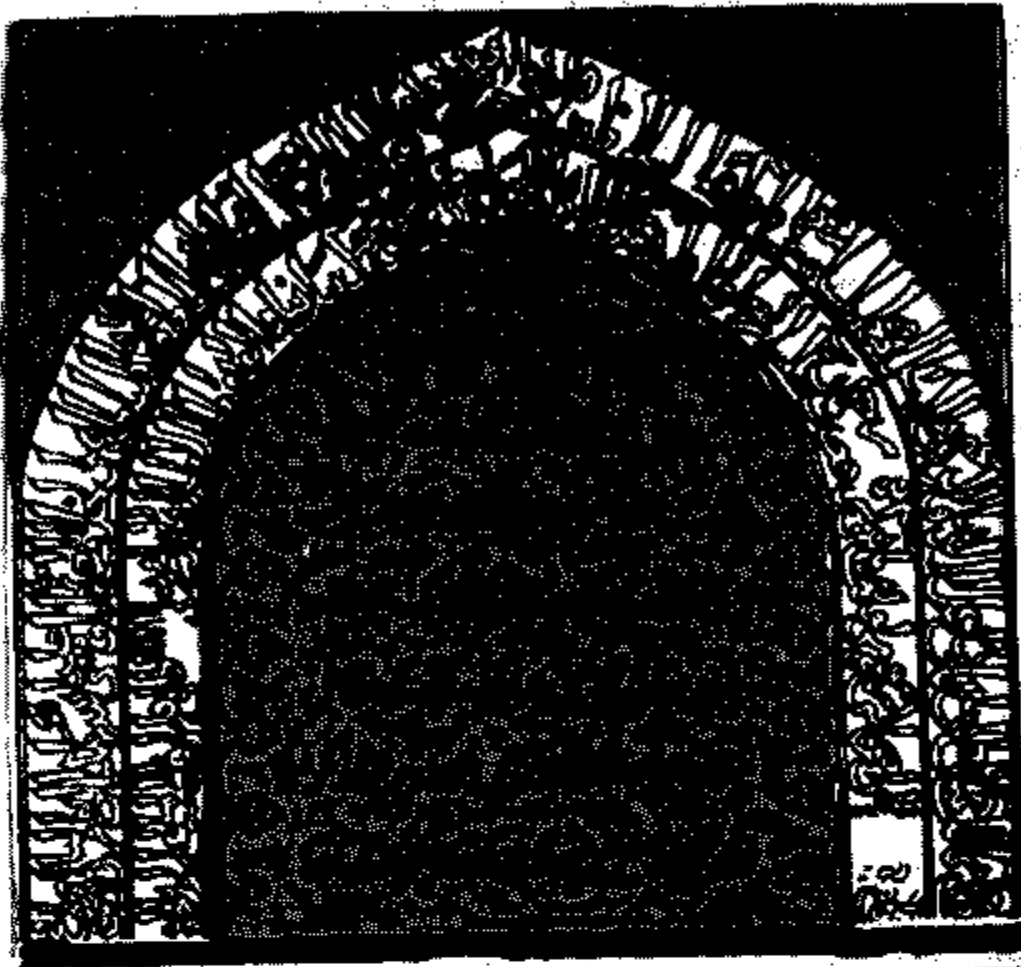
سرسید مرحوم کی مشہور کتاب "آثار الصنادید" کے پہلے ایڈیشن سے قطب مینار کے چند کتبے اور نقشے
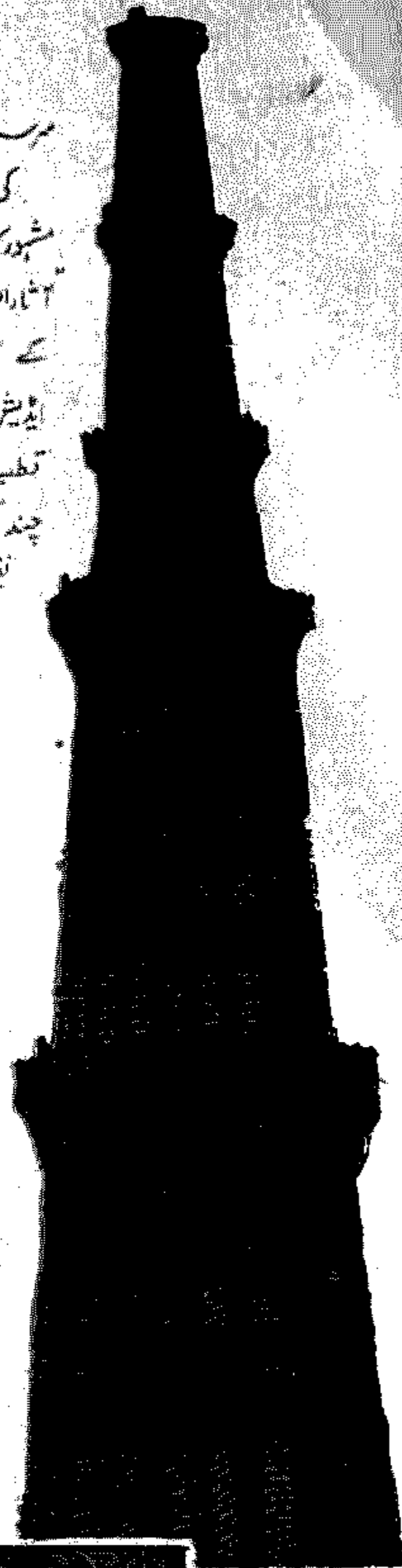
تمہاری شادی میں آئی ہوں، تین دن سے زیادہ ماتم کرنا منع ہے جو ہونا تھا ہو چکا، تم شادی ہرگز ملتوی نہ کرو اور جب میں تمھیں اجازت دیتی ہوں، تو پھر تمھیں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔"

وہ کبھی کسی مقصد کے لئے منّت یا نیاز نہیں مانتی تھیں اور نہ انھیں فال، گنڈے تعویذ پر اعتقاد تھا۔ تاریخوں اور دنوں کی سعادت یا نحوست کی وہ ذرّہ برابر پروا نہیں کرتی تھیں۔ انھیں خدا پر پورا بھروسہ تھا۔ سید احمد خاں کہتے ہیں۔

"میرے ننھیال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب (جن کے وہ معتقد تھے) کے یہاں جو کچھ ہوتا تھا، اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لئے ایک گنڈا دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا۔ اس تعویذ میں

ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کو ذبح کر کے اس کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا تھا۔ بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کی اس کو ممانعت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کے ننھیال والوں نے وہ گنڈا پہنایا، مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈے کے سبب انڈا یا مرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھائیں گے، تو کوئی آفت آئے گی، خدا پر ایمان رکھنے کے خلاف ہے۔ وہ دونوں لڑکے جب کبھی ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا، تو وہ بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔"

عزیز النسا بیگم بڑی ہی دوراندیش تھیں۔ سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد خاں نے وزارت سے استعفیٰ دیا، تو کچھ دنوں بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد کو ان کے پاس بھیجا اور تیس ہزار دینار سفرخرچ کے لئے پیش کیے اور لاہور بلوایا۔ سب دوستوں اور عزیزوں کی کمال خواہش تھی کہ وہ اسے منظور فرمالیں، خود بھی ان کی کسی قدر مرضی تھی، لیکن ان کی بڑی بیٹی یعنی سید احمد خاں کی والدہ نے کہا:

"آپ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اور اس قدر کہ اپنی بقیہ زندگی نہایت آرام و آسائش سے بسر کر سکتے ہیں، خود لاہور جانا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات ہاتھ میں لینا اور ہم سب کا انگریزی عمل داری میں رہنا خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے۔ نہ معلوم کیسے اتفاقات اور کیسے انقلابات در پیش آئیں۔ دوسرے آپ کا زمانہ ضعیفی کا ہے اور طبیعت بھی اچھی نہیں رہتی، اس لئے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں رہیں۔" دبیر الدولہ کے دل پر اس قدر اثر ہوا کہ انھوں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا اور سفرخرچ واپس بھیج دیا۔

وہ بڑی ہی نیک اور عابد و متقی خاتون تھیں۔ سرسید لکھتے ہیں۔" انتقال سے پہلے صرف دو وصیتیں کیں: ایک یہ کہ ان کو بغلی قبر میں جو مسنون ہے، دفن کیا جائے۔ دوسری یہ کہ ان کے ذمے نہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے اور نہ کوئی نماز۔ صرف بیماری کے دنوں کی نمازیں قضا ہوئیں۔ اگر زندہ رہتی تو ان کی بھی قضا پڑھتی۔ میرے مرنے کے بعد تم اس قدر نمازوں کا حساب کر کے کفارے کے گیہوں غریبوں کو بانٹ دینا۔ دوسرے دن انھوں نے قضا کی، تو میں نے ان کی دونوں وصیتیں پوری کر دیں۔" ان کی نصیحتیں بہت نہایت حکیمانہ ہوتی تھیں، وہ کہتی تھیں:

"مصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں، اس میں کچھ خدا کی حکمت ہوتی ہے، مگر بندے اس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔"

انھوں نے ایک مرتبہ سید صاحب کو نصیحت کی،

"جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو۔ ایسا لازمی کہ ہر حالت میں جانا ہوگا، تو وہاں تم کبھی سوار ہو کر جایا کرو اور کبھی پا پیادہ۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں ہے، کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو نباہ سکو۔"

"اگر کسی نے ایک دفعہ تمہارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر برائی کرے یا دو دفعہ نیکی کی اور دو دفعہ برائی کرے تو تمھیں آزردہ نہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ایک یا دو دفعہ نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے، اس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔"

سائنٹفک سوسائٹی
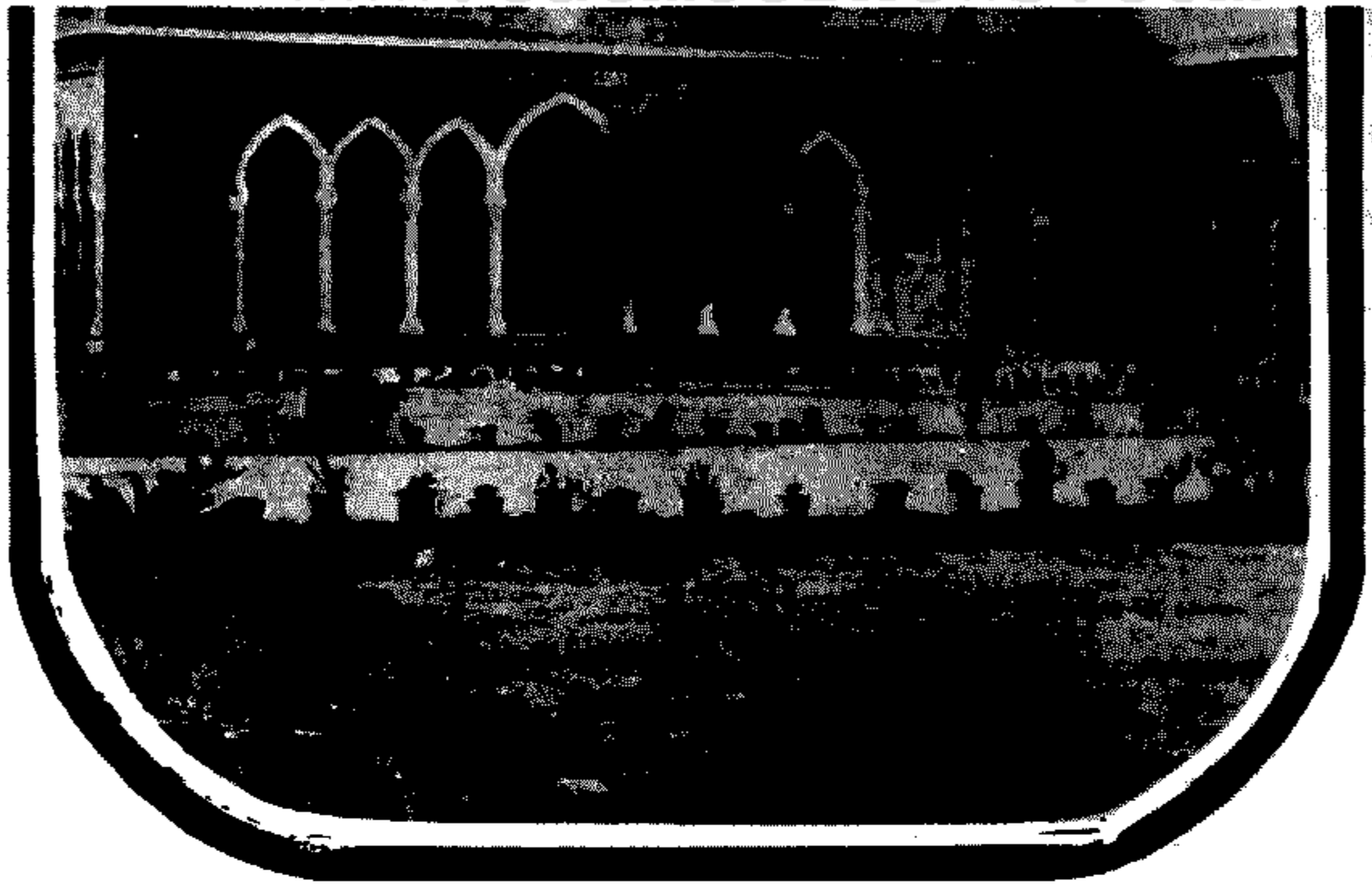
نشأتِ ثانیہ

سرسید کا خیال تھا کہ سماجی اصلاح اور ترقی کی کوئی کوشش اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک عوام کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے منظم جدوجہد نہ کی جائے وہ کہا کرتے تھے کہ صرف نئے خیالات کی روشنی ہی سے تنگ نظری اور توہم پرستی کا کہرا چھٹ سکتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی اور تقریروں، علمی مباحثوں اور سائنسی تجربوں کے علاوہ ایک عظیم الشان منصوبہ مغربی علوم کی اہم کتابوں کو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے کا تیار کیا ۱۸۶۴ء میں جب وہ غازی پور سے علی گڑھ آئے تو سائنٹیفک سوسائٹی بھی ان کے ساتھ یہاں آگئی۔ ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی تنظیم تھی جس کے نام ہی سے اس کے مقاصد اور نوعیت کار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے مغربی علوم اور افکار سے ہندوستانیوں کی بیگانگی کو دور کیا اور ایک ایسی فضا تیار کر دی جس میں سائنس کے فکری اور عملی کارناموں کو سمجھنے اور حالات گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مدد ملی۔ سرسید کی تعلیمی مہم کے لئے سائنٹیفک سوسائٹی نے ہراول کا کام کیا راجہ جے کشن داس نے ۶ رجون ۱۸۶۴ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک کوئی سہل طریقہ علوم و فنون مروجہ یورپ کے حاصل ہونے کا سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اب جو یہ تدبیر یعنی تقرر سائنٹیفک سوسائٹی کا سید احمد خاں صاحب نے اپنی عالی ہمتی سے محض اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کے لئے کیا ہے یہ نہایت عمدہ تدبیر ہے۔ اس میں صرف تھوڑا سا صرف کرنے سے آپکو اور اپنی اولاد کو اور اپنے جمیع ہم وطنوں کو نہایت عمدہ فائدہ پہونچ سکتا ہے۔"

(روئداد نمبر ۵ ص ۴-۳)

سرسید نے اس سوسائٹی کی تنظیم نہایت اعلیٰ پیمانے پر کی تھی۔ تقریباً تیس ہزار کی لاگت سے اس کی عالی شان عمارت خاص اپنے اہتمام اور نگرانی میں تیار کرائی۔ ہر مہینے میں متعدد جلسوں کا بندوبست کیا۔ مضامین جن پر لکچر ہوتے تھے خاص طور پر ایسے چنے جاتے تھے جن سے معلومات میں اضافہ ہو اور آزادیٔ فکر و نظر پیدا ہو۔ ڈاکٹر کلکی ہر مہینے ایک لکچر نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو کہ سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے۔" ایک پورا عملہ سوسائٹی میں کام کرتا تھا۔ مترجم، مولوی، پریس مین، چپراسی، مالی وغیرہ کو تقریباً پانسو روپیہ ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی مولانا حالی لکھتے ہیں۔

"سرسید نے قطع نظر اپنی ذاتی کوشش اور محنت کے جس پر فی الحقیقت سوسائٹی کا دارومدار تھا اور علاوہ ڈونیشن اور سالانہ چندہ کے طرح طرح سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا ذاتی پریس جو انہوں نے آٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے تبیین الکلام کے چھاپنے کو خریدا تھا اور سوسائٹی کی تمام روئدادیں اور تمام انگریزی اور اردو کاغذات ابتدا سے اسی پریس میں چھپتے تھے جب تبیین الکلام کی چھپائی موقوف ہوگئی تو کل سامان پریس کا ایک عام جلسہ میں سوسائٹی کو مفت دے دیا۔"

(حیات جاوید ج ۱ ص ۱۲۵)

سرسید اس سوسائٹی کو جس قدر ضروری اور اہم سمجھتے تھے اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو ۶ ار اپریل ۱۸۶۹ء کو انگلستان جاتے ہوئے انہوں نے جہاز پر سے نواب محسن الملک کو لکھا تھا۔

"مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹیفک سوسائٹی کی طرف متوجہ ہوں اور اس کو سنبھالنے اور ممبروں کو بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمادیں۔" (خطوط سرسید ص ۲۴)

عجیب اتفاق ہے کہ آج پورے سو سال بعد اس

سوسائٹی کی تجدید کا سامان جس عمارت میں کیا جارہا ہے وہ نواب مہدی علی محسن الملک ہی کے نام سے موسوم ہے۔

سائنٹیفک سوسائٹی کی ضرورت :- (۱) جب میں اپنے پیارے ہم وطنوں کے حال پر نظر کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گزشتہ حالات سے اسقدر ناواقف ہیں کہ آئندہ رستہ چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی روشنی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے اور اس سبب سے وہ کچھ نتیجہ نکال نہیں سکتے کہ کل کیا ہوگا۔ وہ نہیں جانتے کہ دنیا میں جو بہت چھوٹی چھوٹی قومیں تھیں انہوں نے کیونکر ترقی پائی اور کس طرح وہ ایک بڑے شاندار اور سایہ دار درخت کی مانند ہوگئیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جو بڑی بڑی قومیں ایک بڑے میوہ دار درخت کی مانند پھل پھول رہی تھیں وہ کیونکر مرجھا کر سوکھ گئیں۔"

(رسالہ نمبر ۱، ص ۲۶ تقریر سرسید)

(۲) آؤ اب ہم بالاجمال ان دلیلوں پر غور کریں جن سے قوموں کی دانائی اور علوم اور عقلمندی کے اقبال کو ترقی ہوتی ہے۔ اس امر عظیم الشان کے مطلب کے صحیح نتیجہ کے دریافت کرنے کے لئے ہم کو ان قوموں کے اگلے اور پچھلے حال پر نظر کرنی چاہیے جو آج کے دن فنون اور علوم کی کھیتی میں سب سے بڑھ کر درجہ رکھتی ہیں۔ جب کہ ہم اگلے زمانے اور حال کے زمانے کی تاریخ پر متوجہ ہوتے ہیں تو ہم کو بطور قاعدہ کلیہ کے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس کی طبیعت میں دوسری قوم نے تخم ریزی نہ کی ہو اور اس نے علوم و فنون میں بزرگی اور عظمت حاصل کی ہو۔ ایسے شخصوں یا قوموں کی چند مثالیں ہیں جنہوں نے خود آپ ہی اپنی طبیعت سے کوئی فن یا علم ایجاد کیا یا اس کو تحقیق کیا اور پھر اس کو اس کے برتر درجوں میں پہنچاتے گئے اور آخر کار اس کو کاملیت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ مگر عموماً ہم کو یہ دریافت ہوتا ہے کہ ایک قوم تو کسی بات کی تحقیق کرتی ہے اور دوسری قوم اس تحقیقات کو

سرسید احمد خاں

ایک نظر میں

سنہ	واقعہ
۱۸۱۷ء	۱۷ اکتوبر کو دہلی میں پیدائش۔
۱۸۲۵ء	نانا کا انتقال۔
۱۸۳۸ء	والد جناب سید محمد متقیؒ کا انتقال۔ دہلی میں نوکر ہوئے۔
۱۸۴۰ء	پہلی کتاب 'جام جم' کی اشاعت۔
۱۸۴۷ء	آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن۔
۱۸۵۸ء	والدہ محترمہ عزیز النساء کا میرٹھ میں انتقال۔
۱۸۶۱ء	شریک حیات کا انتقال۔ مراد آباد میں انگلش اسکول کا قیام
۱۸۶۴ء	غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی شروع کی۔ غازی پور میں ہی ایک اسکول کی بنیاد رکھی۔ جسے بعد میں علیگڑھ منتقل کر دیا گیا۔
۱۸۶۶ء	برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اشاعت کا کام شروع کیا۔
۱۸۶۹ء	یکم اپریل کو انگلینڈ کے لئے روانہ ہوئے۔
۱۸۷۰ء	۲ اکتوبر کو ہندوستان واپس آئے۔ تہذیب الاخلاق کی اشاعت شروع کی۔
۱۸۷۳ء	کالج شروع کرنے کی اسکیم پیش کی۔
۱۸۷۵ء	۲۴ مئی کو ایم۔ اے۔ او کالج کا افتتاح۔
۱۸۷۶ء	نوکری سے ریٹائر ہو کر علیگڑھ میں سکونت اختیار کر لی۔
۱۸۸۶ء	محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام۔
۱۸۸۹ء	بورڈ آف ٹرسٹیز کا قیام۔
۱۸۹۸ء	۲۷ مارچ کو دنیائے فانی سے کوچ فرمایا۔

مولانا شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے علمیت و فضیلت کے اعلیٰ مدارج طے کئے ۱۸۸۲ء میں سرسید نے انہیں علی گڑھ کالج میں فارسی کا پروفیسر بنادیا علیگڑھ کی فضا شبلی کی علمی نشوونما کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی، اور وہیں سے علمی دنیا میں شہرت حاصل کی۔ مولانا شبلی نے علم کلام، تاریخ، تنقید، سیرت، غرض ہر میدان میں اپنی ذہانت کا نقش جمایا لیکن سب سے زیادہ نام تاریخ اور تنقید میں پیدا کیا۔ ادب، تاریخ اور تحقیق میں مولانا کا رتبہ بہت بلند ہے۔

اس سے لیتی ہے اور پھر اپنی محنت اور استقلال سے اسکو قابلیت کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ غرض کہ قوموں کی دانائی کی ترقی کچھ تو خاص انہی کی اور کچھ اور قوموں کی محنتوں اور کوششوں سے ہوتی ہے۔ قومیں بھی اسی طرح جیسے کہ کوئی شخص آپس کی معاونت سے عمدہ ترقی پاتے ہیں اس طرح کہ جو کچھ ان کے پاس ہے اوروں کو دیں اور جو کچھ ان کے پاس نہیں ہے وہ اوروں سے لیں۔ اسی اصول پر دنیا کے انتظام اور علم کی ترقی اور تربیت کے پھیلنے کی بنیاد ہے۔ پس یہ بات بالکل صاف ہے کہ جب تک ہمارے ہم وطن اپنے علم کے موجودہ ذخیرہ میں اور کچھ نہ بڑھادیں گے اور کاہلی اور سستی اور خود مطلبی اور ہم وطنوں کی خیرخواہی سے بے پرواہی کی حالت میں جس میں وہ اب دکھائی دیتے ہیں اور جس میں بدبختی سے وہ آپڑے ہیں، رہنے پر راضی رہیں گے اس وقت تک ان کو کسی طرح ترقی کرنے کی توقع نہیں ہوسکتی۔ پس آؤ ہم مستعد ہوں اور کوشش کریں اور قوموں کے مختلف فنون اور علوم کے لینے اور ان کو بخوبی حاصل کرنے سے اپنے علم کو بڑھادیں۔ اس مردہ پنے کی کاہلی کی حالت میں سے نکلنے کو جس کی روز بروز ہم میں ترقی معلوم ہوتی ہے۔ ہر برس جو گزرتا ہے ایک نئی مشکل پیدا کرتا ہے اور ہر برس وقت کو زیادہ کرتا ہے۔"

"التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند" سرسید۔ ص ۲۰۶۔

سائنٹیفک سوسائٹی کا مقصد: "اس مجمع کا نام سائنٹیفک سوسائٹی یعنی علمی سوسائٹی کہا جاوے گا اور مقصد اس کا یہ ہوگا۔

(۱) ان علوم اور فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی اور کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔ (۲) ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب اور نفیس کتابوں کی تلاش کرکے بہم پہنچانا اور چھاپنا سوسائٹی کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار نہ ہوگا۔"

(قانون سوسائٹی ص ۱)

سوسائٹی کی مطبوعات:۔ سائنٹیفک سوسائٹی نے جن کتابوں کو ترجمہ کر کے شائع کیا یا جو اس کے اشاعتی پروگرام میں شامل تھیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) "ایک مختصر رسالہ جس میں یورپ کے علوم و فنون کے جو ہاملر صاحب کے خزانہ علم میں سے تالیف کیا جاویگا"

(۲) "پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب آدم اسمتھ صاحب کی کتاب کا جو قوموں کی ترقی دولت کے بیان میں ہے"

(۳) تاریخ ہندوستان مؤلفہ الفنسٹن صاحب (۴) رسالہ بھاپ کی کلوں کے بیان میں مصنفہ ڈبلیو جے ایم کورن رین کاین صاحب (۵) تاریخ جدید ہندوستان مؤلفہ مارشمین صاحب (۶) ایک اچھا بڑا نسخہ جغرافیہ کا جو کئی انگریزی جغرافیوں سے تالیف کیا جاوے گا (۷) رسالہ یورپ کے آلات کشتکاری کے بیان میں جو کئی انگریزی کتابوں سے تالیف کیا جاوے گا۔

(۸) تاریخ چین زبان فارسی کا ترجمہ محمد زماں عرف فرنگی خاں اصل انگریزی مصنفہ ایک پادری صاحب کی جس میں بیان ہے چین کی صورت اور پیداواریوں اور علوم اور فنون اور مذہب اور رسومات سلطنت مورخہ چھٹی صدی (۹) ایک کتاب بطور فہرست کے جس میں عمدہ عمدہ مشرقی کتابوں کے نام ہوں گے اور مصنفوں کے نام اور تاریخ تصنیف اور نام زبان جس میں وہ کتاب ہو اور کچھ کیفیت اس کے مضمون کی اور ان لوگوں کے نام جن کے کتب خانہ میں وہ ہوں۔

(۱۰) رسالہ اثر کہربائی جس میں عملی اور علمی دونوں مذکور ہیں معہ بہت سی تصویروں کے مصنفہ بیکول صاحب۔

(۱۱) رسالہ جیالوجی یعنی اس علم کا جس میں انقلابات زمین کا بیان ہے معہ بہت سی تصویروں کے۔ مصنفہ جان فلپس صاحب۔ (۱۲) تاریخ ایران مصنفہ سر جان مالکم صاحب (۱۳) تاریخ بھوپال مصنفہ سر جان مالکم صاحب جس کا انتخاب کیا جاوے گا ان کی تاریخ ہندوستان سے۔ (۱۴) مسلمانوں کے عہد کی تاریخ اسپین جو تالیف کی جاویگی تاریخ عرب و اسپین مصنفہ کانڈ صاحب اور اسپین کے

سجاد حیدر یلدرم

۱۸۸۰ء میں ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔

۱۹۰۱ء میں علی گڑھ سے بی اے پاس کیا پھر ترکی میں مترجم بن کر گئے اور وہیں ترکی تخلص یلدرم (بمعنی بجلی) رکھا اور ترکی زبان کے چند شہ پاروں کو اردو میں منتقل کیا۔ واپسی پر یو پی میں ڈپٹی کلکٹر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے۔ ۱۹۴۳ء میں انتقال ہوا۔ سجاد حیدر یلدرم نے ایک خاص طرز تحریر کی بنیاد ڈالی اور اردو ادب میں ایک نیا تصور، ایک نیا اسلوب اور ایک نئی زندگی منتقل کی۔

سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم علی گڑھ مسلم کالج کے ایک ہونہار طالب علم تھے

عربوں کی تاریخ مصنفہ شیخ ابی العباس المقری اور تاریخ اسپین مصنفہ کالی کٹ ـــــ میں سے۔ (۱۵) رسالہ علم فلاحت یعنی کاشتکاری مصنفہ لابچی صاحب (۱۶) تاریخ اسکندر اعظم مصنفہ ایرین صاحب (۱۷) مغلیہ دربار کا بیان مصنفہ برنیر صاحب (۱۸) رسالہ علم طبعیات جو نہایت پسندیدہ اور آزمودہ ہے مصنفہ جے گریفن صاحب (۱۹) کلک صاحب کے آخر نسخہ کی چوتھی اور پانچویں فصل (۲۰) حافظی صاحب کی کتاب منطق (۲۱) حصہ در رسالہ حکمت قدرت کے دیل صاحب کے سلسلہ میں سے (۲۲) جنرل کننگھم صاحب کی رپورٹ ان تلاشوں کی جو انہوں نے صوبہ بہار اور گورکھپور میں کیں (۲۳) رسالہ ہیئت یا کئی دنیاؤں کا ثبوت مصنفہ ڈی ول صاحب (۲۴) رسالہ پہاڑوں کی شہادت مصنفہ ملر صاحب (۲۵) مگل صاحب کی دوسری جلد کا چھٹا باب جس میں نتیجہ نکالنے کی حکمت کی عظمت کا بیان ہے (۲۶) میکس ملر صاحب کی کتابیں درباب علم سنسکرت (۲۷) مواعظ سکندر مصنفہ ارسطو (۲۸) پولیٹیکل اکونومی یعنی انتظام مدن مصنفہ سینیر صاحب (۲۹) رولن صاحب کی قدیم قوموں کی تاریخ یونان میں شامل حصہ جو ابتدائے قدیم ہونے سلطنتوں یونان سے اس زمانہ تک جب کہ یونان میں علوم و فنون میں مشہور مشہور لوگ ہوئے علاوہ ازیں اس کا دوسرا حصہ اور تیسرا حصہ۔

(۳۰) رسالہ علم فلاحت یعنی کاشتکاری مصنفہ رابرٹ اسکاٹ برن صاحب (۳۱) رسالہ نیچرل فلاسفی مصنفہ چارلس ٹاملنسن (۳۲) رسالہ علم ہوا آب و ہوا مصنفہ چارلس ٹاملنسن (۳۳) رسالہ جر ثقیل مصنفہ چارلس ٹاملنسن (۳۴) رسالہ در علم قوت برقی مصنفہ چارلس ٹاملنسن (۳۵) سینیرز پولیٹیکل اکونمی (۳۶) اصول سیاست مدن۔ مقالہ اول۔ جان اسٹورٹ مل مترجمہ پنڈت رام نراین دہلوی۔ (۳۷) تاریخ ایران (چار حصے) سرجان مالکم۔

مولوی عبداللطیف خان بہادر (کلکتہ) نے ۸ جنوری ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں مندرجہ ذیل کتابوں کے ترجمے شائع کرنے کی تجویز پیش کی۔

(۱) رسالہ ہیئت اور علم جہازرانی جو اور رصاحب کے دائرہ علوم میں سے لئے جاویں (۲) ہمبولٹ صاحب کی

سیاحی کے حالات اور نیز حالات سیاحی کسی اور مصنف کے (۳) مابرٹ سن اور پرسکٹ صاحب کا رسالہ درباب تحقیق ہونے امریکہ یعنی نئی دنیا کے (۴) تاریخ خلفاء عباسیہ (۵) کلیک صاحب کی تاریخ انگلستان (۶) رسالہ درباب ترکیب اور انتظام سلطنت انگریزی (۷) رسالہ درباب سڑک ریل (۸) لیک پابلس صاحب کا رسالہ درباب فن فاٹک گرافی یعنی سورج کے عکس سے تصویر کھینچنے کا فن (۹) رسالہ در باب امریکہ کی ترکیب اور انتظام سلطنت موجودہ کے (۱۰) تھارنٹن صاحب کی تاریخ ہندوستان (۱۱) حیات نامے مشہور مشہور زندہ لوگوں کے جن کا انتخاب اس کتاب میں سے کیا جاوے جو زمانے کے لوگوں کے نام سے مشہور ہے (۱۲) انگریزی اور سنسکرت کی کتابوں میں سے وہ رسالہ جو فن سلنگ اور اشعار سانگ سے متعلق ہے (۱۳) کانب صاحب کا رسالہ درباب ترکیب جسم انسانی کے (۱۴) ڈاکٹر اے کانب صاحب کی طبعیات متعلقہ تندرستی اور تعلیم (۱۵) ڈاکٹر سوئنٹزر کا رسالہ درباب سلامتی عقل (۱۶) ہربٹ صاحب کا رسالہ درباب حقوق انسانی اور ان حقوق کی حفاظتوں ملکی کے (۱۷) ڈاکٹر جارج ولسن صاحب کا رسالہ درباب تاربرقی کے (۱۸) سمی یا نیپیر صاحب کا رسالہ استعمال بجلی متعلقہ ملمع کرنے کے۔

سائنٹیفک سوسائٹی کا اخبار: ۱۸۶۶ء میں سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے آخیر دم تک جاری رہا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار نکلتا تھا۔ پھر ہفتہ میں دو بار نکلنے لگا۔ اس اخبار کا ایڈیٹوریل اہتمام ابتدا سے آخیر تک سوائے ان ایام کے جبکہ سرسید علی گڑھ میں نہیں رہے انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ گو ایک مدت سے بسبب اس کے کہ مدرسہ کا کام حد سے

ایک یادگار تصویر (نامورانِ ایم۔اے۔او کالج)
دائیں سے بائیں۔ بابائے اردو مولانا عبدالحق مرحوم
ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور خواجہ عبدالمجید مرحوم

زیادہ بڑھ گیا ہے اور سرسید کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان کو اس میں کسی بڑے آرٹکل کے لکھنے کا موقع کم ملتا تھا مگر تعلیم کے متعلق یا خاص اپنے کالج کے متعلق یا جب کبھی ملک یا قوم میں کوئی مہتم بالشان واقعہ پیش آتا تھا وہ ہمیشہ اس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ اس میں سوشل اخلاقی، علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے۔ ایک خاص وصف جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز ٹھیراتا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنی طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ کسی خاص شخص کی دلآزاری روا نہیں رکھی۔ اس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیرخواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔

پروفیسر محمد حبیب مرحوم

پروفیسر محمد حبیب یکم نومبر ۱۸۹۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے او کالج اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ مسلم یونیورسٹی کی ۱۹۲۲ء سے ۱۹۷۰ء تک ۴۸ سال خدمت کرتے رہے۔ اور ۲۴ر جون ۱۹۷۱ء کو ۸ بجے شب کو انتقال کیا۔ اور یونیورسٹی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی ——
اس کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ وہ تینتیس[۳۳] برس برابر جاری رہا اس عرصہ میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہوگا جو اپنی تاریخ معین پر نہ نکلا۔ (حیات جاوید ص ۱۲۲ - ۱۲۸-)

سوسائٹی کا کتب خانہ: "اس بات کے رپورٹ کرنے سے بھی رضامندی ہوتی ہے کہ کتابوں کا واسطے سوسائٹی کے خریدنا شروع ہوگیا ہے اور ایک عمدہ ذخیرہ ان کا فراہم ہوتا جاتا ہے چنانچہ جس قدر کتابیں خرید کی گئی ہیں یا لوگوں نے بطور نذر کے سوسائٹی کو دی ہیں ان سب کی فہرست مرتب ہوئی ہے اور آئندہ کو مشتہر کی جاوے گی۔ منجملہ ان کے سید احمد خاں نے جو نذر کی ہیں وہ قیمتی چھ سو روپیہ کی ہیں۔"
(روداد نمبر ۹، ۲۸ر جنوری ۱۸۶۵ء ص ۹)

سوسائٹی اور زراعت کے طریقوں کی اصلاح۔

سرسید پیداوار بڑھانے کے لئے زراعت کے طریقوں میں اصلاح کو از بس ضروری سمجھتے تھے اور اس کام کو انہوں نے سوسائٹی کے سب سے اہم کاموں میں رکھا۔ علی گڑھ آرکائوس میں متعدد خطوط ہیں جو اس سلسلہ میں ان کی مساعی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ۲۶ر اگست ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

علم فلاحت کا ہم ہندوستانیوں میں بالکل معدوم ہوگیا ہے زمیندار انہیں اصول پر کاشت کرتے آتے ہیں جو ہزاروں برس ہوئے کہ ان کے باپ دادا کے استعمال میں تھے اور ان قباحتوں سے جو نامناسب تردد اور برے موسموں اور ان بری رسموں سے کہ زمین کو کچھ فرصت نہیں دیتے اور فصل در فصل چین تردد کرتے ہیں جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں ان سے ناواقف ہیں اور نئے نئے طریقے جو ترقی زراعت کے لئے یورپ میں ایجاد ہوئے ہیں اور نئی نئی کلیں جو یورپ میں لگائی گئی ہیں اور جس سے زراعت کا کاروبار میں بہت آسانی ہوگئی ہے ہندوستانی ان سے مطلق پرواہ نہیں رکھتے۔ اگر ان کا رواج دیا جائے اور ہم ہندوستانی بھی علم فلاحت سے جو یورپ میں ایجاد ہوا ہے اور ان مفید کلوں

سے واقف ہوں تو کچھ شبہ نہیں کہ بذریعہ ترقی پیداوار زمین
کے ہندوستان کی دولت کو بھی بہت ترقی ہو۔

یہ بات سچ ہے کہ ہندوستان کی زمین کثرت پیداواری
میں ملکوں میں مشہور ہے لیکن اگر اس عمدہ زمین میں کاشتکاری
علمی قاعدہ سے ہو تو اور زیادہ ترقی ہوتی متصور ہے۔ بہت
سی اجناس ہندوستان کی پیداواری کی ایسی ہیں جو اور ملکوں
کی اجناس کے مقابلہ میں ناقص اور بری ہیں لیکن اگر یہاں
کے کاشتکار علم فلاحت کی تمام شاخوں سے واقف ہوں تو بلا
شبہ یہاں کی اجناس پیداوار بھی اور ملکوں کی اجناس پر سبقت
لے جاوے۔ یہ بات ہمیشہ ہوتی ہے کہ اگر کسی ملک میں کوئی
جنس اچھی پیدا نہیں ہوتی تو یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہاں کی
زمین اس جنس کے لائق نہیں ہے۔ یہ بات کسی قدر سچ ہو مگر
اس کے ساتھ بلاشبہ یہ بات بھی ہوتی ہے کہ ناقص جنس کا
پیدا ہونا اکثر بہ سبب ناواقفیت فن زراعت کے ہوتا ہے۔

(روئیداد نمبر ۶ ص ۱۰-۹)

سائنٹیفک سوسائٹی کا اخلاقی نصب العین

سچائی:۔ لوگ سچ کو مذاق میں مانتے ہیں اچھا کہتے ہیں پر
پر بولتے نہیں، اچھا جانتے ہیں پر برتتے نہیں، سچ کو پوچھتے
ہیں پر سنتے نہیں، ہزاروں ہیں جو تلون مزاجی سے خوش ہیں سچ
پر قائم نہیں رہتے۔ اپنے خیالات کو اپنے افعال کو سچ کا پابند
نہیں رکھتے۔ سچ کے ڈھونڈھنے میں کچھ محنت مشقت نہیں، سچ
میں کچھ دھوکا نہیں۔ جو آدمی اسے چھوڑے اور جھوٹ کو پکڑے
مگر ایک جبلی عادت ہے کہ آدمی کو خود بخود جھوٹ بولنے کا مزا ہوتا ہے۔
بعضے حکیموں نے اس کی تحقیقات کی اور حیرانی میں رہے
کہ جھوٹ سے آدمی کو نہ شاعرانہ خوشی ہوتی ہے نہ سوداگرانہ فائدہ
ملتا ہے پھر وہ کیوں جھوٹ بولتے ہیں۔

مگر سبب اس کا یہ ہے کہ سچ کی نسبت جھوٹ زیادہ پُر
رونق معلوم ہوتا ہے۔ وہ شمع کیسی روشنی ہے جسمیں رنگ برنگ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم

۱۸۷۴ میں ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں کراچی میں
انتقال ہوا۔ ۱۸۹۴ء میں علیگڑھ سے بی اے پاس کیا اور
وہیں سرسید اور مولانا حالی سے صحبتیں رہیں پھر عثمانیہ کالج
اورنگ آباد کے پرنسپل اور حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ
اردو مقرر ہوئے پچاس سال تک انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے
۱۹۳۵ء میں انجمن کا دفتر حیدرآباد سے دہلی منتقل کیا اور
اپنی تمام عمر اردو کی خدمت میں گذاری۔

کے سوانگ اور طرح بہ طرح کی بازیگریاں اور عجیب عجیب طرح کی
آرائشیں بہت ہی خوبصورت اور خوشنما دکھائی دیتی ہیں اور سچ
دن کیسی روشنی ہے جسمیں وہ سب چیزیں پھیکی پڑ جاتی ہیں سچ
ایک آبدار موتی کی مانند ہے جو دن میں بھی نہایت خوب دکھائی
دیتا ہے پر ہیرا اور شب چراغ نہیں جو صرف رات ہی کو روشنی میں
جگمگاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جھوٹ سے ہمیشہ لطف زیادہ ہو
جاتا ہے بے فائدہ دل خوش رہتا ہے۔ کیا اس میں کچھ شک ہے
کہ اگر آدمیوں کے دلوں میں سے بے ہودہ خیالات اور جھوٹ

ویمن کالج کی چند استانیاں اور طالبات کالج کے احاطہ میں۔ آج کی مسلم یونیورسٹی میں عبداللہ ہال اور سروجنی نائڈو ہال طالبات کے لئے مخصوص ہیں

موت کا تشخص اور جھوٹی شیخی نکل جائے تو ان کے دل افسردہ اور ان دلوں کا ولولہ پژمردہ نہ ہو جائے گا۔

بعضے نیک لوگوں نے شاعری کو بھی برا کہا ہے اس سے بھی ہمارے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے ہیں اور وہ سب جھوٹ کے پتلے ہوتے ہیں مگر اس جھوٹ سے جو صرف خیال میں ہو کر گزر جاتا ہے کچھ نقصان نہیں ہوتا بلکہ اس سے نقصان ہوتا ہے جو دل میں بیٹھ جاتا ہے یا دوسرے کے دل میں بٹھایا جاتا ہے۔

جھوٹ کیسا ہی خوشنما دکھائی دیتا ہو اور لوگوں کے دلوں کو کتنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہو لیکن سچ یہ ہے کہ سچ کی خوبی خود اس کی ذات سے عیاں ہے۔ سچ از خود یہ بات سکھاتا ہے کہ سچ کی تحقیقات کرنا جس سے اس کا عشق ظاہر ہوتا ہے اور سچ کا جاننا جس سے اس کا وجود ثابت ہوتا ہے اور سچ کو مان لینا جس سے اس کا برتاؤ ہوتا ہے انسان کی عمدہ ترین صفتوں میں سے ہے۔

ایک شاعر نے کیا اچھا کہا کہ سمندر کے کنارے پر کھڑا ہو کر جہاز کو سمندر میں چلتا دیکھنا خوشی کی بات ہے قلعہ کے جھروکوں میں سے معرکہ کارزار کو دیکھنا خوشی کی بات ہے مگر سچ کی اچھی اور اونچی خوش ہوا زمین پر کھڑے ہو کر جھوٹ کی نیچان کی خرابیوں اور آندھیوں کی گرد و غبار کے دیکھنے کے برابر کوئی خوشی کی بات نہیں مگر ہمیشہ یہ تماشا عبرت کی نگاہ سے دیکھا جاوے نہ غرور و تکبر سے کچھ شک نہیں کہ آدمی کے دل میں نیک باتوں کا ولولہ ہونا اور سچ کے جھولے میں جھولنا دنیا ہی میں بہشت ہے۔

عارفانہ اور حکیمانہ سچ سے درگزرو اور دنیادارانہ سچ

پرآخر تو بھی ظاہر ہوگا کہ دنیا کے کاموں میں بھی سچ سب سے عمدہ بات ہے۔ جو لوگ سچ کو نہیں برتتے وہ بھی کہتے ہیں کہ صاف معاملہ اور کھرا لین دین آدمی کی عزت ہے۔ دنیا کے کاروبار میں جھوٹ کا ملاؤ چاندی سونے میں تلنبے کا سا ملاؤ ہے کہ گو وہ مل جاتا ہے پر چاندی سونا کھوٹا ہو جاتا ہے۔ جھوٹ پیچ در پیچ سانپ کیسی لکیریں ہیں جو نہایت ذلت سے پیٹ کے بل رینگتا ہے پر پاؤں کے بل نہیں چلتا جھوٹ اور فریب سے زیادہ کوئی بری چیز نہیں جس سے انجام کو آدمی حد سے زیادہ شرمندہ ہو جھوٹ بولنے والا بے شک خدا سے نڈر اور آدمیوں سے خوفناک ہوتا ہے۔ کیونکہ جھوٹ خدا سے تو نہیں چھپتا ہاں آدمیوں سے چھپ سکتا ہے۔ پھر کیا یہ عقل کی بات ہے کہ آدمی خدا سے تو نہ ڈرے اور انسانوں کا ڈر کرے۔

بہت لوگ کہتے ہیں کہ سچ سے آدمی کا اکثر نقصان ہوتا ہے اس لئے لاچار جھوٹ بولنا پڑتا ہے مگر یہ ایک بڑی غلطی ہے وہ شخص ابتدا ہی سے سچ کو نہیں برتتا اور پہلی دفعہ کے جھوٹ ظاہر ہونے سے نقصان اٹھاتا ہے اور غلطی سے سمجھتا ہے کہ میں نے پچھلے سچ کے سبب نقصان اٹھایا۔ اگر کوئی ایک جھوٹے تمسک پر گواہی کرے اور پھر سچ کہدے کہ میں نے جھوٹی گواہی کی ہے اور بالفرض اس کو کچھ مضرت پہنچی تو سچ سے مضرت نہیں پہنچی بلکہ اس پہلے جھوٹ نے نقصان پہنچایا۔

اگر آدمی یہ عہد کرے کہ میں سب گناہ کروں گا مگر جھوٹ نہیں بولنے کا تو اس سے از خود سب گناہ چھوٹ جاتے ہیں، چوری کرتے وقت، جوا کھیلتے وقت اس کو خیال ہوگا کہ اگر کسی نے پوچھا تو سچ کہنا پڑے گا اور شرمندگی یا ذلت یا سزا اٹھانی ہوگی پس وہ سچ ہی اس کو ہر قسم کی برائی کرنے سے روکتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹ تمام گناہوں کی "ماں" اور سچ تمام برائیوں کا علاج ہے ۔

راستی موجب رضائے خداست

مسلم یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں حصہ لینے والے کچھ اساتذہ و طلبا

کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

سرسید: اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ۔

۲۰ اپریل ۱۸۶۶ء (ص ۵۱ ـ ۵۰)

فہرست ممبران سوسائٹی (انگریز): ـ جے ایچ بلین ـ جے ایچ بکس ـ ڈبلو جے براملی ـ ایم براڈہرسٹ ـ لیفٹیننٹ ایس بردک ـ جے ڈبلو کلائیو ـ ڈبلو گولڈاسٹریم ـ اے کالون ـ ایف کوپر ـ لیفٹیننٹ کریگی ـ سی ڈانیل ـ آر ایم ایڈورڈس ـ سی اے ایلیٹ ـ جی فانتھم ـ ڈبلو اے فاربس ـ لیفٹیننٹ جے ایف آئی گریہم ـ لیفٹیننٹ اے ڈبلو گریہم ـ کرنل جی ڈبلو ہملٹن ـ ڈبلو آر ایم ہال ایڈ ـ ڈبلو اے ہیو ـ اے او ہیوم ـ کرنل اے لیک ـ کرنل آر میکگن ـ ایف ڈی مکلیوڈ جی بی منی ـ آر منی ـ اے مانٹیگو ـ کرنل آر مارلیس ـ ڈبلیو میور ـ جی پامر ـ ایف بی پیرسن ـ جے ایچ پرنسپ ـ جی ایچ رکٹس ـ اے اے رابرٹس ـ بی سپیٹ ـ اے شیکسپیر ـ ڈی سمسن ـ جے سمسن ـ آر سمسن ـ جے ایم سی سٹن بلٹ ـ جان اسٹریچی ـ جی ڈی ٹرنبل ـ ڈبلو این ٹرنر ـ میجر آر وید نگٹن۔

ہندوستانی: ـ الف ـ مہاراجہ ایسری پرشاد نراین سنگھ کاشی نریش ـ نواب محمد امین اللہ خاں ـ منشی احمد حسین تحصیلدار سیونڈا ضلع باندا ـ منشی الطاف حسین میرٹھ ـ مولوی سید امداد العلی، ڈپٹی کلکٹر مرادآباد ـ شاہ اسدعلی وکیل آگرہ ـ منشی امجد علی خاں امروہہ ـ سید احمد خاں علی گڑھ ـ مولوی امجد علی وکیل آگرہ ـ منشی امام الدین تحصیلدار مرادآباد ـ مولوی امانت اللہ غازی پور ـ لالہ اجودھیا پرشاد منصف مرزاپور ـ مولوی محمد امراللہ وکیل آگرہ ـ محمد امداد علی تعلقہ دار بچاسو ـ محمد آغا جان انسپکٹر ڈیرہ دون ـ محمد ارشاد علی خاں رئیس سعدآباد ـ محمد احمد علی خاں رئیس بوڑھانسی ـ بابو ایشر چندر رئیس کول ـ چودھری اصغر علی رئیس کھیرہ ضلع بدایوں ـ محمد الطاف احمد رئیس بریلی ـ مولوی ابوالقاسم عبدالحکیم کلکتہ۔

ب: ـ رائے بختاور سنگھ صدر امین بدایون ـ رائے بلدیو بخش ڈپٹی کلکٹر غازی پور ـ شیخ برکت علی منصف بانس گانو ـ منشی بخشش علی سررشتہ دار غازی پور ـ منشی بندا پرشاد انسپکٹر پولیس غازی پوری ـ منشی بابو لعل کان پور ـ سوتی بہاری لعل منصف فرخ آباد ـ رائے بشمبر سہائے تحصیلدار ہاپوڑ ـ لالہ بدری پرشاد وکیل علی گڑھ ـ لالہ بنارسی داس لکھنؤ ـ منشی بنایک پرشاد سررشتہ دار لکھنؤ ـ سید باسط علی رئیس جلالی۔

پ: ـ راجہ پرتاپ سنگھ ـ بابو پیاری موہن بانرجی بنارس۔

ت: ـ سید تراب علی ڈپٹی کلکٹر بدایون ـ تقی علی خاں دریا بار۔

ٹ: ـ ٹھاکر رت پنڈت غازی پور ـ راجہ ٹیکم سنگھ بہادر۔

ث: ـ منشی ثناء اللہ سررشتہ دار بریلی۔

ج: ـ راجہ جے کشن داس ـ لالہ جگت نراین وکیل غازی پور ـ پنڈت جانکی پرشاد تحصیلدار پٹنی۔

چ: ـ منشی چنی لال بنارس ـ بابو چندر شیکر بدایوں

ح: ـ نواب محمد محسن خاں سنوانی ـ منشی حافظ علی خاں تحصیلدار باندا ـ مولوی محمد حبیب اللہ خاں مرزاپور ـ نواب حمزہ علی خاں شیخوپورہ ـ شیخ حفیظ الدین حیدر وکیل مرزاپور ـ مولوی حیدر حسین وکیل آگرہ ـ مولوی محمد حفیظ الدین منصف کول ـ محمد حرمت علی خاں پنڈراول۔

خ: ـ مولوی خورشید علی خاں صدر الصدور الہ آباد

د:۔ راجہ دیونرائن سنگھ بنارس ــــ ڈاکٹر دمڑی لعل تیواری کانپور ــ مولوی وجیل الدین ڈپٹی مجسٹریٹ بست چہار پرگنہ ــ چوبے دھنت رائے ڈپٹی کلکٹر آگرہ۔ دلیل الدین احمد انسپکٹر غازی پور۔ بابو درگا پرشاد وکیل علی گڑھ ــ لالہ دھنی رام ہاتھرس ــ بابو دکھنا نارنجن سکریٹری انجمن اردو۔

ڈ:۔ مہاراجہ ڈگ بجے سنگھ بلرام پور۔

ذ:۔ سید ذاکر حسین منصف ہاتھرس

ر:۔ منشی رام غلام سنگھ تحصیلدار غازی پور ــــ پنڈت رادھا کشن تحصیلدار دھام پور ــ منشی رام ملادا وکیل کپور تھلہ ــ بابو رام کالی چودھری منصف بلیا ــــ بابو روپ چندر گھوش بیسا ــ منشی رگھناتھ سہائے منصف

ز:۔ مولوی زین العابدین منصف محمد آباد۔

س:۔ مولوی سمیع اللہ خاں وکیل آگرہ ــ بابو سوبھک سنگھ غازی پور ــ سید علی خاں بنارس ــ مولوی سراج حسین مہوبا ــ سر سید محمد تحصیلدار سکندرہ راؤ ــــ ــــ مولوی سلطان حسن منصف کھیر۔

ش:۔ لالہ شیو بالک سنگھ غازی پور ــــ رائے شنکر داس منصف امروہہ ــ لالہ شیو امر لعل وکیل غازی پور۔ بابو شیو پرشاد بنارس ــ بابو شنبھو ناتھ پوسٹ ماسٹر مراد آباد۔ شیخ شرف الدین مجسٹریٹ بدایون۔

ص:۔ صفات احمد خاں غازی پور۔

ض:۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں۔

ط:۔ منشی طالع چند پرشاد تحصیلدار رسڑا۔

ظ:۔ سید ظہور حسین وکیل آگرہ ــ قاضی ظہور الحق غازی پور۔

ع:۔ مولوی عبداللطیف خاں بہادر ــ مولوی عبدالماجد غازی پور ــ منشی علی حسن تحصیلدار بنارس ــ نواب علی رضا خاں قزلباش لاہور ــ قاضی عزیز الحق غازی پور ــ شیخ عبدالمجید غازی پور ــ منشی سید علی نقی غازی پور ــ منشی سید علی حسین پرتاب گڑھ ــ قاضی علی اکبر وکیل غازی پور ــ مولوی محمد عبدالقیوم منصف الٰہ آباد ــ نواب عبدالعلی خاں رئیس بنارس ــ مولوی عبدالستار وکیل آگرہ ــ قاضی عنایت حسین صدر الصدور فتح گڑھ ــ مرزا عباس بیگ اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ ــ قاضی محمد عباس مراد آباد ــ محمد عنایت اللہ خاں تعلقہ دار بھیکم پور ــ منشی محمد عبدالعزیز سررشتہ دار علی گڑھ ــ مولوی عبداللہ عبیدی مدرس ہوگلی۔

غ:۔ محمد غلام حیدر خاں پیش کار کول ــ شیخ غلام حسین سربراہ کار۔

ف:۔ فیض احمد خاں رئیس دتاولی ــ شاہ فرید عالم غازی پور ــ مولوی فضل احمد تحصیلدار قائم گنج ــ مولوی سید فرید الدین وکیل آگرہ ــ سید فضل حق وکیل علی گڑھ ــ قاضی فضل احمد تحصیلدار میرٹھ۔

ق:۔ شیخ محمد قطب الدین بریلی ــ مولوی سید قادر علی تحصیلدار نگینہ۔

ک:۔ مولوی محمد کریم بخش ڈپٹی کلکٹر للت پور ــــ بابو کاشی ناتھ بسواس منصف سید پور ــ بابو کالی پرشنو سنگھ کلکتہ ــ مولوی سید کرامت علی امام باڑہ ہگلی ــ منشی کاشی پرشاد سررشتہ دار غازی پور ــ منشی کالی چرن سررشتہ دار مرزا پور ــ پنڈت کالکا پرشاد تحصیلدار گنور ــ بابو گینو رائے غازی پور ــ سید محمد کمال الدین حسین تحصیلدار دلیل نگر ــ رائے کرن سنگھ بردلی ــ منشی کنہیا لعل منصف ایٹہ ــ منشی محمد کرامت اللہ منصف شاہ جہاں پور لالہ کشن سہائے میرٹھ۔

گ:۔ لالہ گوپی ناتھ وکیل غازی پور ــ بابو گردداس متر بنارس ــ لالہ گلاب سنگھ وکیل مراد آباد ــ بابو گنیش پرشاد

ویمن کالج کی طالبات کلاس روم میں

مندرم لکھنو۔ منشی گورسرن داس تحصیلدار علی گڑھ۔ مصر گوپال سہائے منصف جلیسر۔ ددبے گوجرمل علی گڑھ۔

ل :۔ بابو لکھی نراین سین غازی پور۔ بابو مجھی داس خزانچی غازی پور۔ قاضی محمد لطافت حسین وکیل علی گڑھ محمد لطف علی خاں رئیس چھتاری۔ منشی للتا پرشاد جوڈیشل کمشنر لکھنو۔

:۔ مہاراجہ مہیشر بخش سنگھ رئیس ڈمراؤں۔ شیخ محمد جان غازی پور۔ مولوی سید محمد مبین ڈپٹی کلکٹر فرخ آباد۔ پنڈت من پھول میر منشی پنجاب۔ منشی سید محمد حسین وکیل پٹیالہ۔ مولوی محمد عزیز مانیا ضلع غازی پور۔ مولوی محمد مظہر اللہ سررشتہ دار بجنور۔ مولوی محمد بخش خاں بہادر آگرہ۔ لالہ متو لعل وکیل غازی پور۔ مولوی محمد حسن صدر امین بجنور۔ منشی مادھو لعل بنارس۔ مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور مراد آباد۔ مولوی محمد مومن علی خاں صدر الصدور شاہ جہاں پور۔ رائے مان رائے وکیل آگرہ۔ مدد علی خاں غازی پور۔ منشی محمد مدد حسین وکیل علی گڑھ۔ محمد مردان علی خاں مراد آباد۔ چوبے موہن لعل تحصیلدار ہاتھرس۔ محمد معشوق علی خاں تعلقہ دار جیکا تھل مہاراجہ مان سنگھ فیض آباد۔ راجہ مادھو سنگھ امیٹھی۔ شاہ لچھمن لال لکھنو۔ کنور معشوق علی دان پور۔ خواجہ محمد حسین کول۔ لالہ متر سین ہاتھرس۔ نواب محمد علی خاں رام پور۔ مولوی مہدی علی خاں تحصیلدار اٹاوہ۔ میونسپل کمیشن بریلی۔ لالہ منو لعل وکیل علی گڑھ۔

ن :۔ منشی نجم الدین حیدر تحصیلدار آگرہ۔ مولوی محمد نجم الدین ڈپٹی انسپکٹر میرٹھ۔ دیوان نہال چند وکیل جمو۔ سردار نہال سنگھ چھاچھی لاہور۔ منشی سید نصیر علی تحصیلدار باغپت۔ رائے نراین داس بنارس۔ منشی نواب رائے منصف داتا گنج بدایون۔ سید ناصر علی خاں بہادر ذوالقدر الہ آباد۔ پنڈت نند کشور تحصیلدار سنبھل۔ حکیم نصیر الدین تحصیلدار جون پور۔ محمد نظام علی خاں انسپکٹر پولیس کول۔ بخشی نند کشور رئیس ہاتھرس۔ محمد نصرت خاں رئیس سومیرہ۔ منشی نول کشور مالک مطبع لکھنو۔

و :۔ کنور وزیر علی خاں ڈپٹی کلکٹر میرٹھ۔

ہ :۔ لالہ ہربنس لعل وکیل غازی پور۔ بابو ہیران چندر غازی پور۔ منشی ہنومان پرشاد وکیل آگرہ۔ لالہ ہوتی لعل ہاتھرس۔ راؤ ہندو پت جاگیردار علی گڑھ۔

●●

نواب مزمل اللہ خاں کو یونیورسٹی کے متعلق ایک خط

نواب چھتاری کی ڈائری کا ایک ورق

نوٹ :- حافظ محمد احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری موجودہ چانسلر اپنی ڈائری "یاد ایام" میں تحریر فرماتے ہیں کہ ——— ایک روز مسٹر میکزی سے علی گڑھ کا ذکر آیا تو یہ معلوم ہو کر قلق ہوا کہ ان کی رائے میں علی گڑھ کے لڑکوں کا معیار لیاقت بہت ہی کم تھا۔ یہ حضرت یوپی گورنمنٹ کے ناظم تعلیمات تھے اور ملازمتوں کے انتخابات کے موقع پر یہ یا ان کا نمائندہ ہر بورڈ پر ہوتا تھا۔ میں نے اس گفتگو سے متاثر ہو کر ایک نوٹ وائس چانسلر کو بھیجا۔ نواب مزمل اللہ مرحوم اس زمانہ میں عارضی وائس چانسلر تھے۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میٹرک کے بعد اساتذہ کا ایک بورڈ مقرر ہو جو طلباء اور ان کے والدین کو مشورہ دے کہ لڑکے کی آئندہ تعلیم کس نوعیت کی ہو آیا اسے کسی خاص شعبہ کے واسطے تیار کرنا مناسب ہوگا، یا لڑکے میں مقابلے کے امتحانات میں بیٹھنے کی صلاحیت ہے یا نہیں وغیرہ۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ ایسا کرنا مفید ہوگا تاکہ لڑکے اپنی اہلیت اور صلاحیت کے مطابق ایسی تعلیم پاسکیں جو ان کے مستقبل کی ضمانت کر سکے ورنہ بہ حالت موجودہ کسی تین مضامین میں بی۔ اے کرنے کے بعد بے روزگاری کا شکار ہوتے ہیں اور مولانا حالی مرحوم کے اس شعر کا مصداق بن جاتے ہیں ؎

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر ✤ وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

اب یہ کافی نہیں ہے کہ تعلیم دی جائے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ تعلیم ملکی ضروریات کے لحاظ سے ایک منظم پروگرام کے مطابق ہو۔ اس طرح کی منصوبہ بندی کی ہر شعبہ میں ضرورت ہے مثلاً یہ کافی نہیں کہ زراعت کو ترقی دی جائے بلکہ یہ طے کرنا بھی ضروری ہے کہ نیشکر کتنی ہو اور گیہوں کتنا، روئی کتنی ہو اور تمباکو کتنا۔ اسی طرح صنعت و حرفت میں یہ کافی نہیں کہ صنعت کو ترقی دی جائے بلکہ کپڑے کے کارخانے اتنے اور جوتا بنانے کے اس قدر ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی منصوبہ بندی تعلیم کے واسطے بھی ضروری ہے کہ ہر شعبہ کے واسطے منتخب اور موزوں نوجوان دستیاب ہو سکیں۔

عہدِ سرسید کے کچھ ہندوستانی اساتذہ

سنہ ۱۸۷۵ – ۱۸۹۸ء

ایم۔ اے۔ او کالج۔ علیگڑھ

نمبر	نام	عہدہ
۱۔	ابوالحسن	ماسٹر
۲۔	الطاف علی	"
۳۔	امجد علی	"
۴۔	امبا پرشاد	"
۵۔	استوش بھٹاچاری	"
۶۔	برج موہن لال	"
۷۔	بختاور لال	"
۸۔	بنسی دھر	"
۹۔	بہادر علی	"
۱۰۔	بندوری لال	اسسٹنٹ پروفیسر
۱۱۔	پیارے لال	ماسٹر
۱۲۔	چکرورتی جادھین چندر	پروفیسر ریاضی
۱۳۔	چکرورتی بھوانی چندر	ماسٹر
۱۴۔	خلیل احمد	پروفیسر عربی
۱۵۔	وائی رام	ہندی ماسٹر
۱۶۔	سید ابوطالب	ماسٹر
۱۷۔	مولانا سید جعفری	پروفیسر دینیات
۱۸۔	سید حسین	ماسٹر
۱۹۔	مولانا سید عباس	پروفیسر شعبہ دینیات
۲۰۔	سید کرامت حسین	پروفیسر قانون
۲۱۔	سید عبدالباقی	ماسٹر
۲۲۔	سراج الدین	"
۲۳۔	شوکت حسین	"
۲۴۔	شیو شنکر	پروفیسر سنسکرت
۲۵۔	محمد ضیاء الدین احمد	اسسٹنٹ پروفیسر ریاضی
۲۶۔	عبدالحق	ماسٹر
۲۷۔	عبدالجبار خاں	پروفیسر فارسی
۲۸۔	عبدالخالق	ماسٹر
۲۹۔	مولانا عبداللہ انصاری	ناظم دینیات
۳۰۔	محمد عبدالباسط	ماسٹر
۳۱۔	علی محمد خاں	"
۳۲۔	عنایت احمد	"
۳۳۔	قمر علی	"
۳۴۔	کشن لال	"
۳۵۔	پنڈت کیدار ناتھ	"
۳۶۔	گوبند پرشاد	پروفیسر ریاضی
۳۷۔	ماتا پرشاد	ماسٹر
۳۸۔	محمد اکبر	پروفیسر عربی
۳۹۔	محمد سلیم	ماسٹر
۴۰۔	مولانا محمد شبلی نعمانی	پروفیسر عربی و فارسی
۴۱۔	محمد علی	ماسٹر
۴۲۔	محمد خالق	"
۴۳۔	رام شنکر مصرا	پروفیسر ریاضی
۴۴۔	موہن لال	ماسٹر
۴۵۔	ظفر علی خاں	ماسٹر فارسی
۴۶۔	ولایت حسین	ماسٹر
۴۷۔	ہرناتھ سنگھ	"

از
مولانا شوکت علی مرحوم

علی گڈھ کے کھلنڈرے

میں اپنے علی گڈھ کے "کھیلنڈروں" سے ایک مہینے کے لیے رخصت ہوا تھا، اور ان سے وعدہ کیا تھا کہ مہینہ ختم ہوتے ہی پھر اس "اولڈ بوائے" پیامبر کی معرفت نزدیک اور دور کے دوستوں سے ملاقات کروں گا۔ انکی سنوں گا، اپنی کہوں گا، غرض کسی نہ کسی طرح علی گڈھ کی یاد تازہ کرونگا۔ وعدہ تو یہ تھا مگر آج تین مہینہ بعد اس کا ایفا ہوتا ہے۔ ممکن ہے بعض اجنبی لوگ یہ خیال کرتے ہوں "لکھتے کیا خاک، سارا مسالا تو اول ہی مضمون میں ختم کر دیا تھا"، مگر میں علیگڈھ

تیراکی ایک فن ـــــــ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم تیرنے کی مشق کرتے ہوئے

کا مسالہ اس ۶ فٹ ۲ انچ کی لاش اور چھوٹے سے دل میں اسقدر جمع ہے کہ اگر کوئی طبیب حاذق سستی اور کاہلی اور لکھنے سے نفرت دور کرنے کی کوئی مجرب دوا دیدیں تو روزانہ بلاناغہ ایسے مضامین برسوں لکھوں اور رسالہ پھر بھی گاڑیوں باقی رہے۔ اصل یہ ہے کہ علی گڑھ کے محبت کرنے والے کے واسطے بڑا وسیع میدان ہے۔ دشواری اگر ہے تو یہ ہے کہ کہاں سے شروع کرے۔ ہمارا علی گڑھ ہمارا عالم خیال کا علیگڑھ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے "جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے"۔ مگر علی گڑھ کی میونسپلٹی کے حدود میں بھی ہم نے کافی اضافہ کر لیا تھا۔ اور دہلی، روہیلکھنڈ سے آنیوالے کیلئے تو راج گھاٹ سے شروع ہوجاتی ہے۔

ببرالا کا اسٹیشن چھوڑ کر ریل آگے بڑھی اور گنگاجی کے پل پر آئی، اسوقت "بول سری گنگا مائی کی جے" کے نعرے لگانے والوں میں ہم "کھلنڈروں" سے زیادہ کوئی پُرجوش نہ ہوتا ہوگا۔ کیونکہ اس جگہ سے ہماری قلمرو شروع ہوجاتی ہے۔ اور راج گھاٹ کا اسٹیشن مع اپنی بھیڑ اپنی کشمکش اور اپنے جاتریوں کے انبوہ کے ہمارا چھوٹا موٹا شملہ ہے۔ وہاں سے ہی تو ہم سوکھی ڈبل روٹیاں اور بہت سامکھن ساتھ باندھ کر زردہ کی نہر کا محو بصورت آبشار دیکھنے جاتے تھے۔

نہانے والوں کی کثرت کی وجہ سے راج گھاٹ ٹوٹا، کالج میں ایک اصطلاح ہوگئی ہے۔ اور جب کبھی کانفرنس یا کسی دوسرے جلسے کی شرکت کے لیے بہت سے مہمان باہر سے آتے ہیں تو "رات بڑا راج گھاٹ ٹوٹا" کہنا ہمارے لیے کافی ہوتا تھا۔ اتردلی اور ہردوا گنج تو گویا منٹو سرکل اور ممتاز بورڈنگ ہوس کی برابر تھے۔ ایسٹ انڈین سے آنیوالوں کے لیے علی گڑھ کی حد ایک طرف خورجہ اور دوسری طرف ہاتھرس ہوتی تھی۔ خورجہ آیا اور دوسری طرف کھلنڈروں کی یاد شروع ہوگئی۔ مسٹر محمد مصطفےٰ خاں مرحوم، مسٹر اختر محمد خاں ڈپٹی کلکٹر شاہجہاں پور، مسٹر سعید محمد خاں (سعیدو) مسٹر ظفر محمد خاں (ممجا) مسٹر رشید محمد خاں (ٹوٹی بابا) سب یہیں کے رہنے والے تھے۔ اور اب مسٹر ریاض الحسن (رفا) خاص الخاص کھلنڈرا وہاں براج رہا ہے۔ جب ہمارے لیے اس قدر میدان وسیع ہو تو پھر مضامین کی کیا کمی۔ پیارے "کھلنڈرو" میں اس تین مہینہ میں بیکار نہیں رہا۔ تمہاری اور تمہارے عزیز "اولڈبوائے" کی برابر تھوڑی بہت خدمت کرتا رہا۔ اس ننھے سے بچے کو ابتدا میں بڑے غور و پرداخت کی ضرورت تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اب عنقریب اپنے پاؤں کے بل کھڑا ہوجائے گا۔ اور تھوڑے دنوں بعد خود ہی نہیں دوڑے گا بلکہ ہم سب کو بھی

سا تھ دے گا اور قومی ترقی کی دوڑ میں ہمیں اعلیٰ جگہ دلائیگا۔
میں اس عرصے میں بہت غور سے دیکھتا تھا کہ علی گڑھ سے ان عجیب الخلقت کھیلنڈروں کے بارے میں پڑھنے والے کیا رائے قائم کریں گے۔ ایک دوست جو مجھے بہت عزیز ہیں اور حضرت خود بھی درجہ اول کے کھیلنڈرے تھے کہنے لگے ارے کم بخت یہ تو بتا کہ تیرے اس مضمون سے طلبار کیا اخلاقی سبق حاصل کریں گے۔ بھنگ کے پیالہ کی کورس کی آوازہ ۱۵ نمبر کے کمرے سے سوسائٹی تک جانا بھلا کونسا بڑا مستحسن امر تھا ہمارے مکرم حکیم برہم صاحب اڈیٹر مشرق جو اردو کی خدمت ایک زمانے سے مسلسل کر رہے ہیں۔ اور جن کے ہمارے درمیان ایک مشترک دوست کا بڑا رشتہ ہے۔ شکایت کرتے ہیں کہ لفظ "تقار" اور "کھیلنڈرا" غلط استعمال کیا گیا۔ اے "کھیلنڈرو" مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ شبلی اور بعض کھیلنڈروں کے نہ تو مجھے عربی آتی ہے نہ فارسی، نہ اردو اور نہ انگریزی بعض اوقات علی گڑھ اور پرانے اور نئے دوستوں کی یاد مست کر دیتی ہے۔ اور اس بے چینی کے عالم میں جو دل میں آتا ہے جس زبان میں قابو ہوتا ہے اس میں اپنا دل کھول کر کاغذ پر رکھ دیتا ہوں۔ اسپر حضرت انشا پرداز "خفا ہوں یا ناصح مشفق" برا کہیں، انہیں اختیار ہے، میں معذور ہوں ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

اگر میرے "کھیلنڈروں" کے حال سے ایک کے دل میں علی گڑھ کی یاد تازہ ہو گئی، ایک کو بھی وہ پیارا زمانہ یاد آ گیا، جب کہ ہمارے لیے دنیا و مافیہا میں سوائے کھانے، پینے، کھیلنے، لڑنے، سونے اور تھوڑا سا پڑھنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ ایک کو بھی اگر پرانے دوستوں اور کالج کے بھائیوں کا خیال آ گیا اور ان سے ملاقات کی آرزو پیدا ہوئی۔ ایک بھی اگر کچھ منٹوں کے لیے اپنی موجودہ زندگی کی کشمکش اور دقتوں کو بھول کر آدھ گھنٹہ کے لیے خواب دیکھنے لگا۔ ایک کو بھی اولڈ بوائز" کے اہم فرائض اور قوم کی ضروریات کا اندازہ ہو گیا تو میں خوش اور میرا خدا خوش، میری نجات کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ دفتر کے خطوط سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور کوئی خوش ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر میرے کھیلنڈرے تو ضرور خوش ہوئے ہیں۔ کوئی دنیا کی پریشانیوں میں پھنسا ہوا لکھتا ہے "ادے بجائے یہ مزہ دار خرافات تجھے اب تک کیسے یاد ہے۔ کالج چھوڑے زمانہ ہوا۔ پھول باسی ہو گئے، اس گلدستہ میں پھر تو نے کیسے تازہ پھولوں کی سی مہک پیدا کر لی" دوسرا لکھتا ہے کہ "اٹھارہ برس کے بعد کالج اور اس کی زندگی یاد دلا کے بے چین کر دیا" تیسرا لکھتا ہے "سوتے سے تو جگایا مگر کیوں جگایا؟ اس گہری نیند میں یہ تو فائدہ تھا کہ اپنی بے بضاعتی اور ناکارہ پن سے بے خبر تھے" بہت سے جیتے جاگتے مست کھیلنڈرے ہمت بڑھانے والے پیغام بھیجتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ یہ سلسلہ برابر جاری رکھ۔

مسلم یونیورسٹی کے طلبار ہاکی اور کرکٹ کے میدان میں
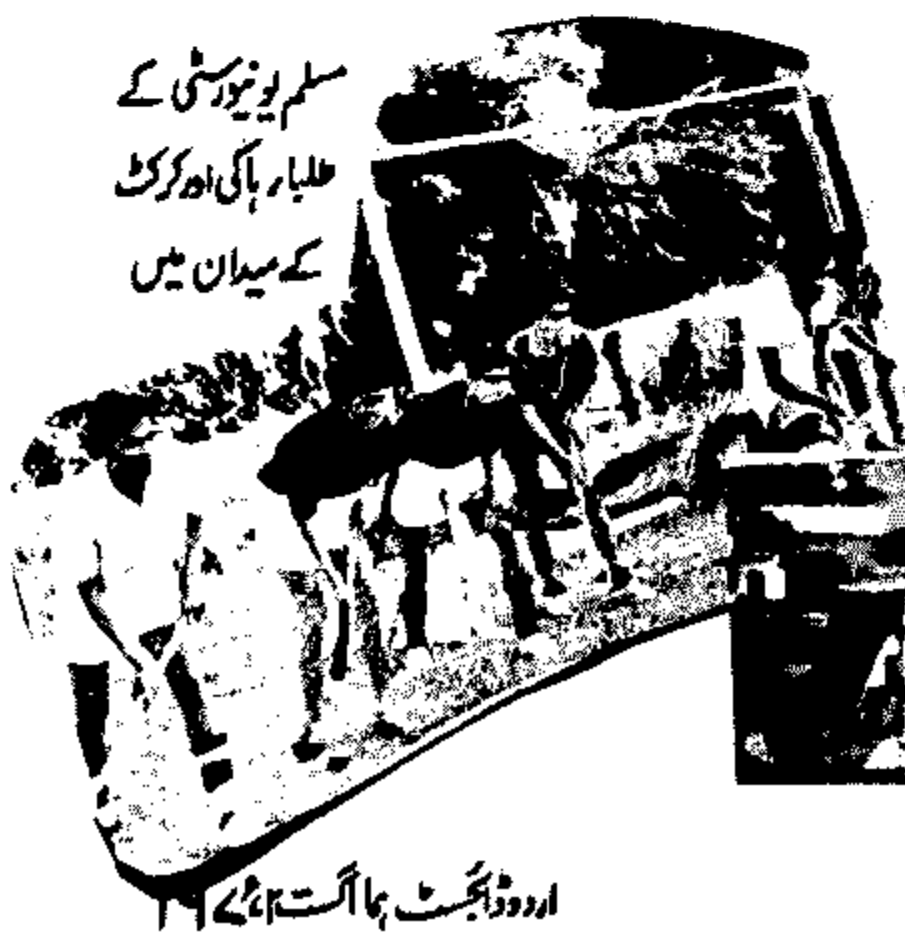
رہے ہے ۔ ؎

جب تک کہ نہ دل کی بیکلی جائے
او دائرے والے گت چلی جائے

"اے کھیلنڈرو" خدا تمہارا بھلا کرے، میرا خیال صحیح نکلا ہم سب میں جان ہے۔ علی گڑھ کی محبت کی چنگاری باوجود گزشتہ بے اعتنائیوں اور بے توجہیوں کے ابھی بجھی نہیں ہے۔ اور انشاء اللہ وہ بجھنے بھی نہیں پائے گی۔ اس اولڈ بوائز کے ذریعہ سے زندہ ہی نہیں بلکہ روز افزوں ترقی کر کے دلیں ایک مشعل کی طرح روشن ہو جائے گی۔ ہمارے دل کی کدورتیں دور کرے گی کہ علی قدر مراتب "مادر مہربان" کی خدمت کریں۔ "پیاری ماں" کو اس کی متمول اور غیر متمول اولادیں سب برابر ہوتی ہیں۔ بلکہ غیر متمول سے تھوڑی زیادہ محبت ہوتی ہے۔ غریب کی کمائی کے ایک پیسے سے ایسی ہی خوشی ہوتی ہے جیسی کہ امیر کے روپیہ سے ہمارا کوئی بھائی بے بضاعت اور ناکارہ نہیں ہے۔ الا وہ جو اپنے آپ کو خود ناکارہ بنا دے۔ مادر کالج کو اسوقت ہر ایک کی مدد کی ضرورت ہے۔ آؤ ہم سب اسکی اپنے "اولڈ بوائز ایسوسی ایشن" کے ذریعہ سے مدد کریں ہمکو خود ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔ جو کام میں نہیں کر سکتا ہوں تم کر سکتے ہو۔ جو تم نہیں کر سکتے ہو ہمارا کوئی اور بھائی کر سکے گا۔ "ناامیدی اور یاس" یہاں سے روانہ ہوں، مردہ دلی کے لیے دروازہ بند ہے۔ ٹھنڈا کمبل تو کیا برف کی سلیں کی سلیں بھی ہماری آگ کو نہیں بجھا سکتی ہیں۔ یہ علی گڑھ کے کھیلنڈروں کی محفل ہے۔ او کھیلنڈرو، تمہارا قصہ گو تمہارے دل بڑھانے والے پیاموں کا شکریہ ادا کرتا ہے ۔ ؎

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
داتا رکھے آباد ان ساقی تیری محفل کو

کس قدر لمبی تمہید ہو گئی "آمدم برسر مطلب" "ظہور حسین، کمال الدین، ظفر علی خاں اور غلام علی اور میں۔ ہم خاص یار تھے اس زمانے (۱۸۹۰ء) میں بھی پارک گلزار بنی ہوئی تھی۔ میر ولایت حسین صاحب انہیں کمروں میں رہتے تھے جہاں اب رہتے ہیں۔ میر صاحب کو اسوقت بھی زیادتی کام کی وجہ سے ذرا فرصت نہیں ملتی تھی۔ اس زمانے کے اسکول کے لڑکے بڑے شریر ہوتے تھے۔ اور ہم کالج والے بھی کچھ کم نہ تھے مگر میر صاحب تحمل اور چشم پوشی سے کام لے کر سب انتظام درست رکھتے تھے۔ ان کے قریب ہی موجودہ بیرسٹر مسٹر عبدالباقی صاحب ایم۔ اے رہتے تھے۔ ہمارے زمانہ میں اور اس سے پیشتر انکو "سید کلن صاحب" کہہ کر پکارتے تھے۔ موجودہ نام تو عبید بلفرعید کے واسطے رکھ چھوڑا تھا۔ اسکول میں ان کی پڑھائی کی بڑی تعریف تھی۔ اور انکے شاگرد انسے بڑی محبت کرتے تھے۔ مگر سب کو یہ شکایت تھی کہ چاہے کیسے ہی نظر بچا کر شرارت کی جاتی تھی، سید کلن صاحب ضرور دیکھ لیتے تھے۔ آگے بڑھکر بڑا کمرہ تھا۔ جہاں اب "ٹول ہوم" سر آدم جی پیر بھائی منزل" ہے۔ اور یہاں سے کالج کے طلباء کے کمرے تھے۔ بڑے کمرہ میں اس وقت کالج کا بلبل ہزار داستان مسٹر محمد داؤد مرحوم رہتا تھا۔ اور واقعی سارے کالج کی جان اسوقت ان کمروں میں تھی جو بڑے کمرے سے شروع ہو کر مسجد پر جا کر ختم ہوتے تھے۔ بڑے کمرے میں مسٹر داؤد مرحوم کے علاوہ مسٹر احمد حسین بی۔ اے مولانا طفیل احمد، مولانا احمد معظم (چریا کوٹی) رہتے تھے۔ اور آس پاس کے کمرے بھی اور زندہ دلوں سے بھرے تھے۔ مسٹر حبیب اللہ خاں قریب ہی رہتے تھے۔ ان کے پاس میرے عزیز دوست مسٹر مظفر علی خاں (سکریٹری میونسپلٹی بدایوں)، مسٹر محمود حسن خاں، بی۔ اے (مجنوں) مصنف گونڈہ اور مسٹر سید نظیر الدین (میاں صاحب) رہتے تھے۔ مسٹر قطب الدین (ٹنو) جو اب حیدر آباد دکن میں ہیں، اور ان کا چھوٹا بھائی فرید، حامد علی خاں مرحوم (ستائیس) اور میرا دوست نظیر حسین فاروقی (ریلیٹ نیشن) بھی انکے پڑوسی تھے۔ مسٹر نسیم بیگ چغتائی کا بھی اسوقت

علی گڑھ یونیورسٹی کرکٹ گراؤنڈ میں چند کیلنڈٹے اسی جگہ سے مولانا شوکت علیؒ نے کرکٹ کھیلتے ہوئے تاریخی چھکا مارا تھا

کالج چھوڑ چکے تھے مگر چونکہ علی گڑھ خاص میں ملازم تھے، اسوجہ سے کالج ہی میں قیام رکھتا۔ ماسٹر الطاف علی صاحب مع اپنے لڑکے اکرم علی اور سرفراز بخش (ٹینس) کے کونے کے کمرے میں تھے۔ جہاں اب ناصر خاں صاحب منعم عمارات رہتے ہیں۔ اس میں گرڈ کپتان احمد سعید خاں صاحب رہتے تھے۔ واقعی جیسا کالج کا بانی تھا ویسا ہی اس کو گرڈ کپتان ملا تھا عجیب و

غریب آدمی تھے۔ ان کے ساتھ ان کے لڑکے احسان حسین خاں مرحوم (گاڈفری)، حاجی حسین، عابد (مشہور کریکٹر کنور صاحب) حامد (کیٹ) رہتے تھے۔ اب آخری مسجد والی بارک کے شروع کے کمروں میں مسٹر محمد علی خاں وکیل، بجنور مسٹر محمد الرحمان سکنڈ ماسٹر ہائی اسکول لائل پور، جو ہمارے زمانے کے مشہور دوڑنے اور کودنے والے تھے۔ رہتے تھے۔ جن سے آج ۱۸

برس کے بعد "اولڈبوائے" کی بدولت پھر ملاقات کرکے دل
خوش ہوا۔ ان کے قریب ہی خواجہ غلام الثقلین صاحب اور
سید وزیر حسین صاحب وکیل رہتے تھے۔ اس کے بعد میرے
بڑے بھائی مسٹر ذوالفقار علی اور ان کی "رام پوری پلٹن" کے
تین کمرے تھے جس میں کا آخری کسرت اور ورزشی سامان اور
پہلوان لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ ہمارے قریب ہی کمال الدین
غلام علی، ظفر علی خاں، حامد علی بریلوی (جو اب ایڈنبرا سے اعلیٰ
ڈاکٹری ڈگری لاکر حیدرآباد میں افسر حفظانِ صحت ہیں) رہتے
تھے۔ انکے پاس مسٹر فضل حق خاں (چھتر پور) خان نثیر شاہ خان
خان علی احمد خاں (بستی دانشمندان جالندھر) مسٹر بہادر علی
مرحوم، مسٹر منیر حسین بی۔ اے (منیرا) منصف (جو ریاست
ممدوٹ میں ہیں) کا قیام تھا۔ جس طرح سب سے بڑے
اور شروع کمرے میں کالج کا بلبل ہزار داستان رہتا تھا۔
اسی طرح آخری کمرہ میں مسجد کے قریب اس زمانہ کے یوم
اول "نے حسن سے" خاندان بومیہ" کی ابتدا ہوئی تھی اپنا گھونسلہ
بنایا تھا۔ کیا بہ لحاظ علمی اور انتظامی قابلیتوں کے اور کیا بلحاظ
ورزش جسمانی، شاعری اور ہنسی مذاق کے۔ غرض ہر لحاظ
سے اس زمانے کی کنجی پارک چمن ہو رہی تھی۔ ہر طالب علم
تفریح اور دل بستگی کی تلاش میں اسی طرف رجوع کرتا تھا۔
سرداران کالج تک تو ہماری رسائی بعد کو جنگ کے پیالے
کی وجہ سے ہوئی۔ مگر ہم نے آپس میں ایسا سامان کر لیا تھا کہ
ہم کو کسی کی پروا نہ تھی۔ ۵۲ نمبر کے کمرہ کے آگے جو نیب ہے
اسکے نیچے اکھاڑہ کھودا تھا۔ مسٹر قسیم بیگ چغتائی تو کبھی کبھی آکر
زور کرتے تھے۔ اور واقعی اس زمانے میں کشتی خوبصورت
لڑتے تھے۔ مگر ہم لوگ شام کو کرکٹ کے بعد روز زور کیا
کرتے تھے۔ چھوٹے جوڑوں کی بھی کمی نہ تھی۔ احسان، حاجی،
عابد، حامد (کرکٹ)، محمد علی اور عزیز الحسن (مجو بانده) آپس
میں بڑی شہ زوریاں دکھاتے تھے۔ ظفر علی خاں اڈیٹر پنجاب
ریویو، اگر بھولے نہ ہوں تو ان کو کشتی میں میرا شاگرد ہونے کا
شرف حاصل ہے۔ ہمارا دن عجیب طور پر کٹتا تھا۔ علی الصباح
خدا کے خوف اور مسٹر آرنلڈ کے ڈر کے مارے ان کے ہمراہ
مسجد جا کر نماز فجر ادا کرتے تھے۔ اس کے بعد کمرہ بند کرکے
گھنٹہ بھر ڈنڈ مگدر سے شغل رکھتے تھے۔ اس سے فارغ ہو کر
چونکہ کرکٹ ٹور کا زمانہ آگیا تھا اس لیے تھوڑی سی کرکٹ
کی مشق اسٹریچی ہال کے پیچھے جال گاڑ کر کرتے تھے۔ اجنبی آدمی
ضرور پوچھے گا "ارے بھائی پڑھتے کس وقت تھے؟" ان
ضروری کاموں سے جب فرصت ملتی تھی تو پڑھنا بھی ہو
جاتا تھا۔ ہم "کھلنڈروں" پر بچپن کی پرانی مثل صادق
آتی ہے "نام کیا ہے؟ ٹھکر پارہ، کھاتے کتنا ہو؟ من دس
بارہ، پانی کتنا پیتے ہو؟ مشکا سارا، اور کام کتنا کرتے ہو؟
تھکا بچارہ۔ ہم تو نہتے بچارے" تھے پڑھ بھی لیتے تھے۔ ہاں
امتحان میں آج تک فیل نہیں ہوتے۔ ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک
کالج جاتے تھے اور شام کو کرکٹ یا فٹ بال کھیلتے تھے۔
کشتی کے بعد جو وقت بچتا تھا، اس میں کچھ تو پڑھنے میں
اور اس سے زیادہ "بھنگ" کے پیالے اور دلچسپی میں صرف
ہوتا تھا۔ کمال الدین، غلام علی، اور ظہور حسین اور
سب ___ کھیل کھیلتے تھے۔ مگر کشتی نہیں لڑتے تھے۔
ان غریبوں کو مگر چین نصیب نہیں تھا۔ ظفر علی خاں کے
"گودہ" میں درد ہوتا تھا۔ اس لیے بچارے کمال الدین
کو ان کے ہاتھ پاؤں دبانا پڑتے تھے۔ اور ظہور اور غلام
علی سے میں خدمت لیتا تھا۔ مگر ہم سب کی دن بھر کی کوفت
"بھنگ کا پیالہ" سو دور کر دیتا تھا جب کہ ہم چاندنی رات
میں پلنگوں پر لیٹ کر خوب پھیپھڑوں کے زور سے الاپتے
تھے۔ آس پاس کے سب دوست جمع ہو کر آواز ملاتے
تھے۔ میرا عزیز دوست سرفراز خاں باوجود اسکول کا طالبعلم
ہونے کے ہم میں شریک ہو جاتا تھا۔ آواز اس زور کی ہوتی

بھنگڑا
کنیڈی ہال
مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ
میں
یوم
جمہوریہ
کے
موقع
پر

تھی کہ سر تھیوڈور ماریسن صاحب بعض اوقات دوسرے دن صبح کو ہماری طرف دیکھکر اور مسکرا کر یہ کہدیتے تھے کہ رات چوکیداروں نے سونے نہیں دیا۔ کوئی پوچھے کہ اس سے کیا حاصل تھا؟ کچھ بھی نہیں، ہم ہٹے کٹے، تندرست نوجوان جانور تھے۔ جو کھیل دل میں آتا تھا کھیلتے تھے پھیپھڑے زبردست تھے۔ ہاتھ پاؤں میں طاقت تھی، دلمیں امنگیں تھیں، زمین سے آسمان کی طرف اڑنے کو دل چاہتا تھا۔ چلا کر، آپس میں لڑکر، فٹ بال میں ایک دوسرے پر وحشیانہ حملہ کرکے کریکٹ میں، گیندیں اور بلے اور بعض اوقات خود اپنے ہی ہاتھ پاؤں توڑ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔

اور کیا حاصل تھا؟ ہم سب میں کمال الدین کی زبان ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ اور پھر بھی ہر شخص اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی بات کا کوئی برا نہیں مانتا تھا، اور وہ واقعی ایسا شخص تھا کہ اس سے جس قدر محبت کی جائے بجا تھی۔

بڑے طالب علموں میں مولوی بہادر علی مرحوم بڑے ہنس مکھ تھے۔ اور ہر ایک کے لیے انکے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہا کرتی تھی۔ اگر موت نے اس قدر جلدی نہ کی ہوتی تو ان کی صلح کل ذات ہم سب کے لیے علی گڑھ میں بہت مفید ہوتی۔

مولوی بہادر علی مرحوم آگرہ کالج سے ایف۔ اے پاس کرکے بی۔ اے میں داخل ہوئے تھے۔ اور ریاضی ان کا خاص مضمون تھا۔ اس زمانے میں یہ عام خیال تھا کہ مسلمان علم ریاضی کے لیے بنائے ہی نہیں گئے ہیں اور علی العموم وہ اس مضمون میں کمزور ہوتے تھے۔ ہمارے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے اسکو غلط ثابت کردیا اور ان کے بعد سے تو بہت سے مسلمان علی گڑھ اور دوسرے کالجوں سے ریاضی میں اعلیٰ درجہ پاکر نکلے ہیں۔ اب تو خدا کے فضل سے مسلمان سب مضمونوں میں یکساں ہیں۔ اور ذرا دل لگاکر پڑھیں تو کسی قوم سے کیا، ہندوستان، کیا یورپ اور کیا امریکہ میں کم نہ رہیں۔

اس زمانے میں بی۔اے میں کسی کا ریاضی بمقابلہ فارسی یا عربی لینا ایک عجیب بات خیال کی جاتی تھی اور اس کے مسلمان ہونے پر شبہ ہوتا تھا۔ کمال الدین نے فوراً مولوی بہادر علی کا نام "بابو شوس بروزن گھوس" رکھدیا اور ان کو اسی نام سے پکار پکار کر دق کرتا تھا۔ تھوڑے دنوں میں ریاضی کے پروفیسر نہ ہونے کی وجہ سے مولوی بہادر علی نے مجبوراً ریاضی چھوڑ کر عربی بی لی اور سب سے اول۔ کمال الدین ہی کو جاکر یہ خوشخبری سنائی کہ "لے بھائی اب تو خوش ہوا۔ ریاضی چھوڑ کر عربی لے لی۔ اب تو بابو شوس نہیں رہا" کمال الدین حضرت کب چوکنے والے تھے فوراً بول اٹھے کہ اب تم "بابو کہل" ہو گئے۔ اور وہ جب تک کالج میں رہا اسی نام سے مولوی بہادر علی مرحوم کو پکارتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسکول میں ماسٹر مقرر ہو گئے۔ انکے تقرر پر انکے دوست مسٹر داؤد نے فوراً ایک نظم لکھ کر ان کو بھیجدی جو کالج میں از حد مقبول ہوئی اور ہر خاص و عام کی زبان پر تھی۔ بہادر علی مرحوم نہایت درجہ پابند صوم و صلوٰۃ تھے اور "صفاچٹ لوگوں" کی نگاہ میں انکی خوبصورت خشخاشی داڑھی ہمیشہ کھٹکتی تھی۔ اسی کی وجہ سے ان کا اول شعر میں مذاق اڑایا گیا ہے ؎

کہاں چھوٹی کسوٹ، کدھر استرا ہے
یہ پیشہ کہو کیا تمہارا برا ہے
بس اب درس و تدریس میں کیا دھرا ہے
بہادر علی بھائی زمانہ برا ہے

مرحوم خود اس کو سنکر پھڑک جاتے تھے، اور آخر وقت تک جبکہ وہ علی گڈھ میں قابلیت کے ساتھ وکالت کرتے تھے اور ہمارے کالج کے ٹرسٹی بھی تھے ان کے احباب ان سے ملتے وقت زمانہ کی شکایت کیا کرتے تھے "بہادر علی بھائی زمانہ برا ہے" بڑے کمرے "ٹول ہول" کے سامنے ہمیشہ جگمگتا رہتا تھا اور رات کو اکثر گانا ہوتا تھا۔ کالج کے "ٹان سین" مسٹر احمد حسین (ہیڈ ماسٹر اسٹیٹ اسکول اجمیر) کا وہ مسکن تھا جس وقت انہوں نے اپنی بلند اور زور دار آواز سے "نوفل کا دربار سجایا سب کھیلنڈرے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ اور سب نے مل کر داغ مرحوم کا دیوان کا دیوان دہرا دیا۔ بعض پرانے اشعار تو آپ بھی علی گڈھ کو یاد کرکے میرا دل دہرانے کو چاہتا ہے جو بہت حسب حال ہیں ؎

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا، نگاہ الفت کبھی نہ کرنا
تمہیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا
لے تو چلے ہیں حضرت دل تمہیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھکر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا
ہماری میت پر تم جو آنا تو چار آنسو بہا کے جانا
ذرا رہے پاس آبرو بھی، کہیں ہماری ہنسی نہ کرنا

"نوفل" کے دربار کے لقب کا بولنا تھا کہ چاروں درویش اور پانچواں میں آپہنچے، اور "بھنگ کا پیالہ" ساتھ لائے سرداران کالج کا حکم ہی تھا اور ہم بھی خوشی سے ان کی خدمت میں حاضر ہونا پسند کرتے تھے۔ ہمارے زمانہ میں کالج کے بڑے طلبار کا بہت اثر تھا، اور ہم چھوٹے ان کے حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔ مسٹر بیگ مرحوم خود ان کا بہت خیال کرتے تھے اور کالج کے معمولی انتظامات میں جن کا طلبار سے تعلق تھا انسے مشورہ لیتے تھے۔ ادھر "بھنگ" نے رنگ جمایا، ادھر "گلشن میں بہار آئی" کا غل تھا اور بلبلیں "نثار ترے صدقے، نازو ادا پر نثار" جہاں اس قدر بلبلیں رہتی ہوں وہاں "بوم" اور "بومنی" کا برا احوال کیوں نہ ہو۔ اسی لیے تھوڑا وقت انسے محبت آمیز شکوہ و شکایات میں گزرتا تھا۔ میرا عزیز دوست اور ہم درجہ مسٹر شکور بخش قادری مرحوم (سپرنٹنڈنٹ محکمہ نمک) "بوم اول" کا ہم عاشق ہونے کی وجہ سے "بومنی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

کینیڈی ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ڈرامہ "سقراط" کا ایک سین

ہائے کیسا آدمی مرگیا، اور کیسا جوان مرا، میرے خیال میں اس زمانہ میں اس سے زیادہ ہنس مکھ کالج میں کوئی نہ ہوگا۔ حد درجہ خلیق اور ملنسار تھا۔ آخر وقت تک جبکہ وہ ایک بڑے عہدے پر نہایت نیک نامی سے کام کر رہا تھا، ویسا ہی منکسر مزاج اور خندہ پیشانی تھا۔ مرنے سے کچھ دنوں پیشتر انسے انکے چھوٹے بھائی اور اپنے دوست مسٹر رزاق بخش قادری کے بنگلہ پر ملنے گیا۔ بہت کمزور ہوگئے تھے۔ رنگت اس دق کمبخت کی وجہ سے سیاہ ہوگئی تھی آواز بیٹھ گئی تھی، مگر ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی، پورے دو گھنٹہ تک پاس بٹھایا اور مجھ سے اور محمد علی سے پرانے تذکرہ کرتے رہے۔ افسوس ہم میں سے جو جاتا ہے جوان ہی جاتا ہے اور اپنے پیچھے ایک نوعمر غریب لڑکی اور کچھ ننھے منے بچے رونے کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ اس جلسہ کا میں جب خیال کرتا ہوں تو دل کو صدمہ ہوتا ہے کہاں ہے ہمارا بلبل ہزار داستان داؤد، کہاں ہے بہادر علی مرحوم جنکو ہم زمانہ کی برائی سے متنبہ کیا کرتے تھے۔ کہاں ہے

شکور بخش "بومی" جس کے ذکر سے ہم محفل میں سماں باندھتے تھے۔ کہاں ہے عبدالحکیم "بھوٹان" جس کی شان میں داؤد اور ہم سب مل کر نغمہ سنج ہوتے تھے۔ اور اپنی محبت اور یاد کے زور سے دہرہ دون سے علی گڑھ کھینچ بلاتے تھے ۔

جمع پھر یاں عیش کا سامان ہو
پھر یہی کمرہ ہوا در بھوٹان ہو

سب زندہ ہیں مگر شہر خموشاں میں ہیں اور غالباً وہ بھی ہمیں یاد کرتے ہوں گے۔ ہماری آنکھوں سے ہاں پوشیدہ ہیں، چھپے ہیں تو کیا ہیں؟ ہم بھی ایک نہ ایک دن ڈھونڈ کر انسے مل جائیں گے۔ عالم ارواح میں نہیں تو روز محشر تو ضرور ملاقات ہوگی۔ میں بھی کیا آدمی ہوں "کیلنڈردں" کا تو ذکر تھا اور یہ پہنچ گیا عالم ارواح میں ۔

در محفل خود راہ مدہ ہم چوں منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

داؤد مرحوم کا زیادہ کلام تو مجھکو یاد نہیں ہے کیونکہ

شاعری سے بالکل بے بہرہ ہوں، مگر قبلہ وکعبہ حالی کی مشہور غزل کے ایک شعر پر جو مصرع لگاتے تھے وہ یاد ہیں، جس سے مرحوم کی شوخیٔ طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

جب کرے قصد کسی چیز کا کوئی انساں
دیکھ لے پہلے کہ اس چیز کے ہے بھی شایاں
سنکے اوروں سے کہ وہ آتے ہیں داڑھی کے یاں
ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

خدا معلوم قبلہ وکعبہ نے اسکو سنکر کیا فرمایا ہوگا؟ ضرور اپنے کالج کے لڑکے کی ذہانت سے خوش ہوئے ہوں گے۔

کھیلنڈروں کی محفل میں کون کون شریک ہوتے تھے تقریباً وہ سب ہوتے تھے جو آجکل "اولڈ بوائز" میں ممتاز ہیں، اور شریک ہونیوالوں میں مولانا طفیل احمد صاحب، اور مسٹر حبیب اللہ کے نام خاص ذکر کے قابل ہیں۔ زمانہ حال کے "کھیلنڈرے" خیال کرتے ہوں گے کہ یہ لوگ تو کم از کم ہرگز ایسے "مجمع ناجائز" میں شریک نہ ہوتے ہونگے۔ جی حضور شریک ہی نہیں بلکہ بانی مبانی یہی حضرات ہوتے تھے ہم تو انکے ادنیٰ شاگردوں اور چیلوں میں تھے۔ مولانا طفیل احمد صاحب تو اول درجہ کے کھیلنڈرے تھے۔ کوئی کریکٹ ٹور ایسے نہیں چھوٹتا تھا فلالین کی سفید پتلون، فلالین کی سفید قمیص اور اسپر علی گڈھ کا پرانا نیلا کریکٹ کا کوٹ پہنے آگے آگے ہوتے تھے اور پیچھے پیچھے ڈریر بیگ ایک نماز کا مصلیٰ اور وضو کا لوٹا لیے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ حضرت اس حیثیت سے کریکٹ کھیلنے جاتے تھے بھوکے کیوں نہ مریں، کھانے کو ملے یا نہ ملے مگر کیا مجال کہ ظہر کی نماز قضا ہو جائے۔ میں نہیں بلکہ آگرہ کلب میں ڈیا گر ڈاکر ساری ٹیم کو نماز پڑھواتے تھے۔ مولانا کی طرح موجودہ کھیلنڈروں میں میرا دوست مسٹر شفقت حسین مشہور بولر کی مثال بھی اس معاملہ میں نہایت قابلِ تعریف اور لائق تقلید ہے۔ رہے حبیب اللہ خاں صاحب وہ تو ہم سب کے سردار تھے اور کم از کم جس قدر شرارتیں میں نے سیکھی ہیں اسکی ظاہری نہیں تو درپردہ سکھانے والے خانصاحب ہی تھے، وہ ہمارے استاد اور لیڈر تھے۔ بدقسمتی سے وہ ہم سے اب ذرا خفا ہیں، مگر انشاء اللہ وہ دن قریب آئیگا جب ہم اور وہ پھر ایک ہو جائیں گے اور سب کھیلنڈرے مل کر کالج کی ترقی کے سامان مہیا کرنے میں سرگرمی دکھائیں گے جیسے کہ بھنگ سے پیالہ کے دور چلانے میں۔ اے کھیلنڈرو! اب مجھے رخصت ہونے کی اجازت دو، تمکو چھوڑنے کو دل تو نہیں چاہتا ہے مگر اس پیام پر "اولڈ بوائز" کے لیے ابھی بہت کام کرنا ہے۔ آؤ ہم تم سب مل کر اسکو پروان چڑھائیں۔ یہ کچھ روپیہ کا بھوکا نہیں ہے۔ مگر ہاں تمہاری محبت کا بھوکا پیاسا ہے۔ اس کی یہ خواہش ہے کہ سب بھائی اسے پیار کریں، اسکے لیے خوبصورت خوبصورت کپڑے بنائیں۔ انپر گوٹہ کناری لگا کر اس کی زینت کا باعث ہوں ابھی تو وہ بچہ ہے اسے یہ چیزیں دل سے عزیز ہیں، اس کے لیے اچھے کھلونے دور، دور سے بھیجیں، اس کے سلانے کے لیے چھوٹی چھوٹی لوریاں بھیجیں، اس کے ہنسانے اور خوش کرنے کیلئے سب اس کے آگے اچھی اچھی نظمیں گا کر سنائیں۔ اور وہاں پڑھانے کیلئے بھی لائق استاد مقرر کریں، جو سارے دنیا کے علوم وفنون سے خوشہ چن کر اس کے سامنے رکھیں یہ کس کا ہے؟ اسکے لیے ابھی سے لڑنا نازیبا ہے بعض حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ شوکت اور اس کے معدود دوستوں کی جماعت نے اپنے دشمنوں کو زک دینے کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا ہے۔ جسکے ذریعہ سے ان کو بدنام کرکے اپنے لیے جھوٹی شہرت حاصل کریں گے۔ کھیلنڈرو جس کا جو جی چاہے خیال کرے۔ مگر زمانہ دکھا دیگا کہ یہ کمزور بچہ اولڈ بوائے، اپنے بڑے بھائیوں کی مدد سے ایک دن سارے اختلافات تھوڑی دیر میں مٹا

سرسید اور رفقاء
۱۔ سید حامد
۲۔ مجھو (ملازم)
۳۔ سید محمود
۴۔ سید زین العابدین
۵ ×
۶۔ مرزا ابنو آف بنارس
۷۔ ایم اے اللہ علی
۸۔ راجہ جے کشن داس
۹۔ سرسید
۱۰۔ رحمت اللہ بیگ
۱۱۔ رائے بدری بخش ڈپٹی کلکٹر

دیگا۔ ایک دوسرے کی بے اعتباری، جو ہماری بدقسمتی سے ہماری سب سے بڑی دشمن ہے۔ اسکو یہ ضرور قتل کرے گا جب ہمکو علی گڈھ کی چپہ چپہ زمین پیاری ہے۔ اس کا چھوٹے سے چھوٹا سنگ ریزہ عزیز ہے۔ اس کا آسمان، اس کا سورج، اس کا چاند، اس کے تارے، اس کا پانی، اس کے موجودہ طالب علم ہم کو پیارے ہیں تو پھر اس کے اولڈ بوائز نے کیا قصور کیا ہے۔ ہم میں اور ان میں بلا استثناء کوئی دشمنی اور عناد نہیں ہے۔

میراان کا معاملہ نا ظم
کچھ جدا جنگ و آشتی سے ہے

اس کم بخت بے اعتباری کا برا ہو کر اسنے اختلافات پیدا کردیئے ہیں جو انشاءاللہ یہ اولڈ بوائے ضرور دور کریگا جناب اڈیٹر صاحب میری اس بے خودی کے عالم میں لکھی ہوئی "بکواس" میں کوئی بات اس پیارے پیامبر کی شان کے نازیبا ہو تو میری معذوری پر غور کرکے آپ ضرور معاف کردیں گے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

شوکت علی از بنارس

ماخوذ از اولڈ بوائے۔ علی گڈھ
بابت ماہ دسمبر ۱۹۱۰ء جلد ۱ شمارہ ۴

مسلم یونیورسٹی کا اقامتی کردار

(سید محمد ضمیر اختر حسنی)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریز حکومت کا عتاب ہندوستانیوں پر ٹوٹا تو وہ ہندوستانی مسلمان تھے جو دوسری قوموں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ظلم اور بربریت کا شکار ہوئے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ جہاں ہندوستان میں بسنے والی دوسری قوموں نے خود کو حالات کے مطابق موڑ لیا تھا وہاں مسلمان قدیم روایات کا بوسیدہ لبادہ پہنے افسانوی شتر مرغ کی طرح اپنی گردنوں کو عظمت گزشتہ کے ریگزار میں چھپائے بیٹھے تھے۔ وہ انگریزی تعلیم کو نہ صرف نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ تعصب اور تنگ نظری سے اس کو کفر کا نام دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں دوسری قوموں کے لوگ تعلیم حاصل کر کے حکومت میں بڑے بڑے عہدے حاصل کر رہے تھے وہاں مسلمان قدیم نوابی خون کے جوش میں تعلیم سے دور بھاگ کر پستی کے عمیق غار میں گرتے جا رہے تھے۔

اس وقت میں سر سید احمد خاں نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ان کے ذہن میں اپنی قوم کو اس ذلت اور نکبت سے نکالنے کے لئے جدو جہد کے خطوط ابھرنے لگے۔ انہوں نے سوچا کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ نئی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

اس سلسلے میں سر سید نے اس دور کے نظام تعلیم پر نظر ڈالی جب کہ آبادی سے دور جنگلوں میں درسگاہ ہوتی تھی جہاں پر طلبا علم حاصل کرتے اور وہیں قیام کرتے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ قدیم نظام تعلیم ایک ایسا راستہ تھا جس پر چل کر ایک طالب علم نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا تھا بلکہ زندگی کا ہر پہلو ایک باقاعدہ کر اجاگر کرتا تھا۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ، آداب و اخلاق، کھانے پینے کے طریقے، غرض یہ کہ ہر چیز درسگاہ سے سیکھ کر واپس گھر لوٹتا تھا۔ اسی طرح کا نظام تعلیم کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں میں رائج تھا کہ طلبا ہوسٹلوں میں ایک ساتھ رہ کر تہذیب حاصل کرتے اور اسی کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کرتے اور جب ایک طالب علم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتا تو وہ ایک مکمل تعلیم یافتہ تہذیب

یافتہ انسان ہوتا۔

سرسید اسی طریقۂ تعلیم کو اپنے ملک میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لندن کا سفر کیا اور اس طریقۂ تعلیم کا بغور مطالعہ کیا۔ ان کی دانست میں قوم کی حالت صرف اسی وقت سدھر سکتی تھی جب ہندوستان میں ایسی درسگاہیں قائم کی جائیں جن کا کردار اقامتی ہوتا۔ لندن سے لوٹ کر سرسید نے ایک اقامتی درسگاہ کا خاکہ بنانا شروع کر دیا۔ سرسید کے خیالات جب عوام تک پہنچے تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ جو درسگاہ قائم کرنا چاہتے ہیں وہ کس قسم کی ہوگی سرسید نے جواب دیا ہم سے لوگ باصرار پوچھتے ہیں کہ مدرستہ العلوم مجوزہ میں جو لڑکے رہیں گے وہ کیونکر تربیت پائیں گے۔ ہم اس مدرستہ العلوم کو محمڈن یونیورسٹی یعنی دارالعلوم مسلمانی بنانا اور بالکل آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹی کی نقل اتارنا چاہتے ہیں جو لڑکے ان مکانات (ہوسٹلوں) میں سکونت اختیار کریں گے ان پر اسی طرح جس طرح کیمبرج اور آکسفورڈ کے کالجوں میں گرجا میں جانا اور نماز میں شریک ہونا ضروری ہے۔

اپنی اپنی مسجدوں میں جانا اور نماز میں شریک ہونا فرض ہوگا یعنی سنی لڑکوں کو پانچ وقت کی نمازوں میں حاضر ہونا اور نماز جماعت سے پڑھنا واجب ہوگا اور شیعہ لڑکوں کو صرف تین وقت اس لئے کہ وہ ظہر و عصر، مغرب و عشا ساتھ پڑھ لیں گے۔

جس قدر طالب علم آکسفورڈ، کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں ان کو ایک قسم کا کوٹ اور ایک قسم کی ٹوپی ملتی ہے تاکہ ایک قسم کا لباس سب کا ہو جائے۔ اس سے نہایت عمدہ فائدے ہیں جن کا بیان اس مقام پر ضروری نہیں۔

مدرستہ العلوم کے طالب علموں کو بجائے کوٹ کالے ایک کالے آستین چغہ، لال ترکی ٹوپی (بعد میں سیاہ شیروانی اور ٹوپی ہو گئی) دی جائے گی۔ تمام طالب علم جب مدرسے میں یا کتب خانے میں یا عجائب خانے میں یا اخباروں کے کمرے میں آئیں گے تو بغیر اس چغہ اور ٹوپی کے آنے کے مجاز نہ ہوں گے۔

لڑکوں کے پڑھنے اور کھیلنے اور کھانے اور سونے اور نہانے اور کپڑا بدلنے کے سب وقت معین ہوں گے اور ہر لڑکے کو اس وقت وہی کام کرنا ہوگا جو اس وقت کے لئے مقرر

سرسید ہال میں آج کی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چند طلبا اور منتظمین

ہے یہاں تک کہ جو وقت سونے کا ہے اگر طالب علم چاہے کہ میں اس وقت پڑھوں اور تھوڑی دیر کے بعد سوؤں تو وہ ایسا نہ کرسکے گا بلکہ اس کو ضروری ہوگا کہ سونے کے وقت پر سو رہے اگرچہ بالفرض نیند نہ آئے تو پلنگ پر آنکھیں بند کئے پڑا رہے۔

کھیلنے کے لئے متعدد قسم کے کھیل کے سامان موجود ہونگے اور جو کھیل جس کو پسند ہوگا وہ اختیار کرے گا۔ گھوڑے پر چڑھنا بندوق چلانا، تیرنا یہ سب کام بھی مناسب طور پر اور انداز پر سکھائے جائیں گے۔

الفاظ بد لڑکوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں ان کو بولنے کا سخت امتناع ہوگا یہاں تک کہ اگر کوئی لڑکا کسی کو جھوٹا کہہ بیٹھے گا تو وہ بمنزلہ دشنام سخت کے سمجھا جائے گا۔

تمام طالب علم ایک کمرے میں ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ تمام چیزیں کھانے کی وقتاً فوقتاً پکائی جائیں گی اور ہر موسم کا میوہ بھی لڑکوں کو مناسب طور سے دیا جائے گا اور ہر ہفتہ میں ایک خاص کھانا خود لڑکوں کی فرمائش سے پکایا جائے گا جس کو وہ خود اپنی کثرت رائے سے قرار دیں گے بشرطیکہ بہ لحاظ موسم کے وہ صحت کو مضر نہ ہو۔

لڑکوں کو صفائی سے رہنے کی تاکید ہوگی۔ کسی لڑکے کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ گوٹے اور کناری لگا ہوا یا بازار کا رنگا ہوا رنگین و نیم رنگ یا ایسا باریک جس میں سے بدن دکھائی دے کپڑا پہنے۔

کسی لڑکے کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ بہت بڑے بڑے بال جو کان کی لو سے زیادہ نیچے ہوں سر پر رکھے یا کاکلیں بنائے یا پٹیاں جمائے یا مسی لگائے یا انگوٹھی یا چھلے پہنے یا کسی انگلی پر مہندی لگائے۔

لڑکے جو تقصیر کریں گے ان کو کسی قسم کی سزائے بدنی یا ایسی سزا جس سے رفتہ رفتہ غیرت جاتی رہے، نہیں دی جائے گی۔

جھوٹ بولنا گو وہ کیسی ہی خفیف بات میں کیوں نہ ہو۔ ایک بہت بڑا جرم سوسائٹی کا سمجھا جائے گا۔ اسی طرح کسی کو جھوٹا کہہ بیٹھنا جرم سوسائٹی مانا جائے گا گو کہ اس شخص نے جھوٹ ہی کیوں نہ بولا ہو۔

خود لڑکے بھی باہم مل کر ایک کلب جس کا نام ان شاء اللہ تعالیٰ مثل کیمبرج کے کلب کے یونین کلب کہلائے گا، علمی باتوں اور دنیاوی علوم میں مباحثہ ہوا کرے گا اور قواعد اس کے بعینہٖ وہی ہونگے جو کیمبرج یونین کلب میں ہیں۔

(تہذیب الاخلاق بابت یکم رجب ۱۲۸۹ھ)

سر سید احمد خاں نے ایک اقامتی درسگاہ کا جو خواب دیکھا تھا آخر کار وہ پورا ہوا۔ انہوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کرتے وقت جن باتوں کا خاص خیال کیا تھا یہ تھیں کہ طلبا کو مذہبی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم بھی دی جائے تاکہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سماج کی بدلتی ہوئی قدروں میں اپنا مقام حاصل کر سکیں اور دوسری ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش ترقی کی دوڑ میں ساتھ رہیں۔ تعلیم کے بعد انہوں نے اقامتی زندگی پر بہت زور دیا۔ ان کی نظر میں اقامتی زندگی ہی ایک طالب علم کو اس قابل بنا سکتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوں، باہمی امداد کا جذبہ ان میں پیدا ہو اور ایک ساتھ مل کر وطن کی ترقی میں قدم بڑھائیں۔

درسگاہ کی اقامتی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے ہوسٹلوں میں رہنے والے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "اے عزیز طالب علمو! مجھ کو اور تم کو اور تمہارے استادوں تمہارے ماں باپ، تمہاری قوم کو اس بات سے نہایت خوشی ہوگی کہ تم دور دراز فاصلہ اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیل علوم کے لئے جمع ہو، مختلف علوم کو پڑھتے اور مختلف مصنفوں کے عمدہ خیالات، عمدہ مسائل علمی، عمدہ معقولات اخلاق سے لطف اٹھاتے ہو۔ تمہارے استاد تمہارے

یوم سرسید کے موقع پر بانیٔ درسگاہ کے مزار پر چادر چڑھاتے ہوئے طلبار اور وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم

ساتھ پدرانہ محبت اور شفقت رکھتے ہیں اور ہر طرح تمہاری بہتری و ترقی کے خواہاں ہیں۔ وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے جو بڑے بڑے عالموں اور مصنفوں نے تصنیف کی ہیں سبق دیتے ہیں مگر آج میں تم کو ایک ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے۔ اس کے حروف بہت بڑے اور مجسم ہیں مگر ان کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے۔ اس کے معنی بھی بہت آشکارا ہیں مگر ان کا سمجھنا کچھ آسان نہیں اس کے پڑھنے کے لئے اس کے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔

"اس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے؟ خود تمہارے ساتھیوں کا اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ پس تم کو سمجھنا ہے کہ اس کتاب کو کیونکر پڑھو اور اس کے معنی کیونکر سمجھو۔

"اے عزیزو! اس کتاب کا نام ہے "کالج لائف یا نئی زندگی"۔ یہی اصلی کتاب ہے اور اسی کا پڑھنا اور اسی کا سمجھنا اصلی فائدہ اور اصلی مقصود زندگی اس کالج کا ہے۔ اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح رکھا اور دل میں قدر نہ کیا تو تمہاری آئندہ زندگی وہ ہوگی جس کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہیے ورنہ اسکی زندگی اور موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔

"اب مجھ کو یہ بتانا ہے کہ تم کالج لائف سے کیونکر فائدہ اٹھا سکتے ہو اور اس کو کیونکر گزارنا چاہیے؛ سب سے اول اور تمام برکتوں کی جڑ تمہارا آپس میں سلوک اور محبت سے رہنا ہے۔ تمام طالب علم ہندوستان کے ہوں یا پنجاب کے، پورب کے ہوں یا پچھم کے، اتر کے ہوں یا دکھن کے۔ جب وہ

سب تمہاری عاقل ماں (کالج) کی گود میں پڑے ہیں تو وہ سب تمہارے بھائی ہیں۔ اگر تم نے ان کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبت ایکدوسرے کے ساتھ نہ برتی تو تم نے اس پہلے اصول کو کہ تم سب ایک عاقل ماں کے بچے ہو، توڑ دیا۔

"بورڈنگ ہاؤس ایک کل ہے قوم کو قوم بنانے کی اگر اس کے پرزے درستی سے چلتے ہیں تو وہ اپنا کام کرے گی ورنہ کسی کام کی نہیں۔ تم اس کل کے پرزے ہو اور اس لئے اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے تم ہو۔ تمہارا درست اور کام کے قابل رہنا سب سے مقدم ہے۔

"تمہارا کھانا پینا، رہنا سہنا، آپس میں ہر وقت ملنا سوسائٹی میں شریک رہنا، کھیلوں کو آپس میں مل کر کھیلنا لٹریری جلسوں میں شریک رہنا، یہ سب باتیں اس لئے ہیں کہ آپس میں محبت اور دوستی ایک دوسرے کی ہمدردی ہو جو بنیاد قوم کے قوم بننے کی ہے۔ پھر اگر تم نے اس میں قصور کیا تو تمام قوم کا مظلمہ تمہارے سر ہوگا اور تم پر افسوس ہوگا کہ جس عمارت کی تم خود ایک اینٹ ہو اسی عمارت کو تم برباد کرنا چاہتے ہو۔" (مقالات سرسید صفحہ ۷۵ تا ۷۸)

سرسید نے بار بار اقامتی زندگی پر زور دیا ہے اور اسی اقامتی کردار کے ساتھ اس درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی تھی ۱۹۲۰ء میں اسی مخصوص کردار کے ساتھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہندوستان کے مختلف صوبوں سے ہی نہیں بلکہ دنیا کے کونے کونے سے طلباء علم کی پیاس لے کر آتے ہیں اور اس بحر بیکراں سے سیراب ہوتے ہیں۔ یہاں طلباء کے قیام کے لئے دس ہال ہیں۔ جن میں آٹھ ہال سرسید ہال — وقار الملک ہال، سرشاہ سلیمان ہال، آفتاب ہال، محسن الملک ہال، راس مسعود ہال، ہادی حسن ہال اور پروفیسر حبیب ہال طلباء کے قیام کے لئے اور عبداللہ ہال و سروجنی نائیڈو ہال طالبات کے لئے آغوش مادر جیسا سکون بہم پہنچاتے ہیں۔ ہر ہال متعدد ہوسٹلوں پر مشتمل ہے۔

ہر ہال میں ایک کتب خانہ، مسجد، طعام گاہ، کلب (کامن روم)، مختلف کھیلوں کے کلب اور ہر وہ چیز موجود ہے جس کی کسی انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ عبداللہ ہال اور سروجنی نائیڈو ہال میں پردہ نشیں خواتین کے لئے وہ تمام اشیاء موجود ہیں جس کی بدولت وہ ہر آسائش حاصل کر سکتی ہیں۔ دوسرے ہالوں کے مقابلہ میں یہاں کچھ سختیاں ہیں مگر یہ تمام سختیاں اسی قسم کی ہیں جیسی کہ عام طور پر اپنی لڑکیوں کے لئے والدین ضروری سمجھتے ہیں۔

اپنی اقامت گاہوں میں طلباء ہر طرح سے آزاد نہیں ہیں بلکہ گھر کی طرح یہاں پر بھی ان پر کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ مثلاً اگر وہ اقامت گاہ سے باہر جاتے ہیں تو ان پر فرض ہے کہ شب کے دس بجے تک واپس لوٹ آئیں۔ ورنہ سزا پا جانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بہت ضروری کام ہو تو وارڈن سے اجازت لینی ضروری ہے۔ چھٹیوں میں اپنے گھروں کو جانے سے قبل وارڈن کو اطلاع کرنی ضروری ہے اور گھر سے واپس آکر بھی آمد کی اطلاع ضروری ہے۔ یہاں پر طلباء و طالبات کے ساتھ بالکل اسی طرح سلوک کیا جاتا ہے جس طرح گھروں پر ان کے والدین کرتے ہیں۔ مگر گھر اور ہوسٹل کی زندگی میں ذرا سا فرق ہے۔ وہ یہ کہ گھر پر اکثر والدین سب سے بڑے بچے کو یا پھر سب سے چھوٹے بچے کو دوسرے تمام بچوں کے مقابلہ میں زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ گو سینیرٹی اور جونیرٹی کا ماحول یہاں پر بھی ہے مگر اس قسم کا ہرگز نہیں کہ عزیز بچے کو لاڈ پیار سے اور درمیانی بچوں کو لاپرواہی سے بگاڑ دیا جائے۔ یہاں پر سینیرس کو زیادہ اہمیت ضرور دی جاتی ہے مگر بالکل اس طرح جیسے کہ ایک خاندان کا بڑا زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ورنہ تمام طلباء

کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا ہے۔ ایسا سلوک جس کے بارے میں سرسید احمد خاں نے فرمایا تھا ۱۸۹۶ء "ہمارے ساتھ علی گڑھ چلو اور ہمارے کالج کے ان پیارے عزیز بچوں کو دیکھو جو بطور بورڈر کے وہاں رہتے ہیں جن کی صورت دیکھ کر ہمارے دل میں پیار آتا ہے۔ جن کے خیال سے ہماری روح خوش ہوتی ہے ان کو جو محبت ہمارے ساتھ ہے اس کا تماشہ دیکھو۔ باپ سے زیادہ ہم سے محبت کرتے ہیں۔ ہماری خفگی سے زیادہ کوئی چیز ان کو رنج دینے والی نہیں ہوتی۔ ہماری جھڑکی، ہمارا طمانچہ، ہمارا ہاتھ کی سختی سے ان کو عبرت اور نصیحت ہوتی ہے۔ مگر وہ اس کو ایسی ہی عزت سے قبول کرتے ہیں جیسے بیٹا اپنے باپ کی تادیب و تنبیہ کو۔ ایسا بورڈنگ ہاؤس البتہ ہماری قوم کے بچوں کو تربیت دینے کے قابل ہو سکتا ہے۔"

(لیکچر بمقام پٹنہ ۲۸ جنوری ۱۸۸۳ء)

مسلم یونیورسٹی کے ماحول میں ہر مذہب و ملت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہاں پر ایک ہی کمرے میں ہندو، مسلم، سکھ اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے طلباء ایسی محبت سے رہتے ہیں کہ ذرا بھی احساس نہیں ہوتا ہے کہ ان کے مذہبی عقائد جدا جدا ہیں۔ ایک باورچی خانہ کا پکا ہوا کھانا ایک ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔ ان میں کسی طرح کا چھوت چھات کا احساس یا اختلاف نہیں ہے۔ سرسید نے قوموں کو یکجا کرنے کا جو خواب دیکھا تھا

۷۲-۱۹۷۱ء میں مسلم یونیورسٹی میں طلباء کی کل تعداد ـــــ ۸۹۲۵

مسلم یونیورسٹی اس خواب کی تعبیر ہے۔ قومی یکجہتی کا جو ماحول مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہے اس کی مثال نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے کسی بھی ملک میں ملنی مشکل ہے۔

مسلم یونیورسٹی ایک ایسا سانچہ ہے جو ایک طالب علم کو اپنے اقامتی کردار سے مکمل انسان بنا کر باہر نکالتا ہے۔ اسی ماحول میں رہ کر دلوں کی عداوت، فرقہ پرستی، نفرت و دشمنی دور ہو جاتی ہے اور طالب علم کی روح کو ایک ایسی نئی روشنی حاصل ہوتی ہے جو اس کے دل میں محبت، وطن دوستی اور خدمت خلق کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ جب طالب علم ایک ساتھ رہ کر ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کے شعار کو اپناتے ہیں اور قوم کے آہنی ستون بن کر باہر نکلتے ہیں تو اس آدم کی حقیقی اولاد کے روپ میں نظر آتے ہیں جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود قومی یکجہتی کے اس حسین و جمیل چمن کو اگر کوئی فرقہ پرستی کا گڑھ کہے تو اس کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

سرسید کے زمانہ میں علیگڑھ اسکول میں طلباء کی تعداد

	۱۸۷۵ء	۱۸۷۶ء	۱۸۷۷ء	۱۸۷۸ء	۱۸۷۹ء	۱۸۸۰ء	۱۸۸۱ء	۱۸۸۲ء	۱۸۸۳ء	۱۸۸۴ء
ہندو	۰	۶	۱۲	۴۱	۳۰	۴۰	۵۷	۵۲	۵۳	۷۷
مسلمان	۶۶	۸۹	۱۱۳	۱۳۳	۱۵۵	۱۳۲	۱۸۶	۱۷۹	۱۹۲	۱۹۳

محمد اکرام اللہ خاں

جسے سب سے کم سمجھا اور جانا گیا اسکا نام ہے

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ اس کو ملک کے اندر جو ایک مقام ملا ہوا ہے وہ اس کے نام یا کسی مخصوص کردار کی وجہ سے نہیں بلکہ "سوچنے، سمجھنے، پرکھنے کی آزادی اور ہر چیز کے ہر پہلو کو جاننے کی بے لاگ خواہش" کی وجہ سے ہے۔

جہاں تعلیم کے اونچے معیار اور کردار کی بلندی کی توقع کی جاتی ہے، اس کی عزت کی جاتی ہے اور اسے بڑھاوا دیا جاتا ہے۔

جہاں ہر طبقے اور ہر فرقے کے ہر فرد کے لئے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

اور جہاں دنیا بھر کے مختلف ممالک کے رہنے والے مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف مذاہب میں یقین رکھنے والے طلبا، ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں اور ایک ہی میز پر کھانا کھاتے ہیں۔

جو انسانیت، کشادہ دلی، عقل و فہم، آزادیٔ ضمیر

ذاکر حسین انجینیرنگ کالج، مسلم یونیورسٹی

یونیورسٹی پالی ٹکنک کالج علی گڈھ

اور سچائی جیسے بلند اقدار کی آئینہ دار ہے۔

جو اپنے اسلامی ہونے پر اور ہندوستانی ہونے پر فخر محسوس کرتی ہے۔ جو ہندوستانی کلچر کی آفاقیت اور سیکولر نظریات کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

اور جس کے بارے میں ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن، ڈاکٹر پی بی۔ گجیندر گڈکر اور ڈاکٹر ڈی۔ ایس کوٹھاری جیسی عظیم شخصیتوں نے ان الفاظ کا اظہار کیا ہے۔

" یہ میری دلی خواہش ہے کہ یہ یونیورسٹی علم کی عظیم بلندیوں کو چھوئے، اخلاقی رہنما ثابت ہو اور آپ میں سے ہر شخص علیگڈھ کا گریجویٹ ہونے میں فخر محسوس کرے۔ یہ میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ یہ یونیورسٹی پوری دنیا میں اپنی بلند تعلیم اور اخلاق کی وجہ سے ممتاز ترین حیثیت حاصل کرے "

(ڈاکٹر رادھا کرشنن ۱۹۶۰ء)

یونیورسٹی کانووکیشن (تقسیم اسناد کی تقریب) سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر پی۔بی۔ گجیندر گڈکر نے کہا کہ "اب تک انہوں نے کم از کم پندرہ یونیورسٹیوں کے کانووکیشنوں سے خطاب کیا ہے لیکن انہوں نے کہیں بھی اتنی بڑی تعداد میں طالبعلموں کو اتنی شائستگی، تہذیب اور خاموشی سے اتنے لمبے عرصے تک بیٹھے ہوئے نہیں پایا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ علیگڈھ کے طالبعلموں کا کردار ملک کے دوسرے طالبعلموں کے لئے ایک سبق ہے۔ اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ علیگڈھ ہی اس وقت جبکہ پورے ملک کی یونیورسٹیاں ہنگاموں اور تشدد کا گڑھ بنی ہوئی تھیں، پوری خوبی کے ساتھ کام چل رہا تھا۔

یونیورسٹیوں کو آزادی دینے کا اصول ایک عمدہ اصول ہے لیکن اگر کوئی یونیورسٹی سب سے زیادہ آزادی کی مستحق ہے تو وہ ہے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی "۔ (سٹیٹسمین۔ ۲۹ جنوری ۱۹۶۹ء)

محمد اکرام اللہ خاں
پبلک ریلیشنز آفیسر
علی گڈھ
مسلم یونیورسٹی
علی گڈھ
(یوپی)

"یہ آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ آپ اس یونیورسٹی سے تعلق رکھتے ہیں جس نے تعلیم کے میدان میں پچھلے پچاس برسوں میں عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ یونیورسٹی کا ماضی عظیم ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل عظیم تر ثابت ہوگا علیگڑھ جیسی عظیم یونیورسٹی کے مستقبل پر اعتماد ہمارے ملک کی عظمت کا اظہار ہے۔" (ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری ۱۹۶۲ء)

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے وقت کی نبض کو پہچانا اور ماڈرن تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ "ہمارے چاروں طرف کی دنیا تیزی سے بدل رہی ہے" اور اس لئے وہ چاہتے تھے کہ "ہمارے ذہن بھی اپنے آپ کو ان تبدیلیوں کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہوجائیں۔"

آج سے سو سال پہلے انہوں نے سائینٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے دوسری زبانوں کی بہترین سائنسی کتابوں کے اردو ترجموں کی ضرورت پر زور دیا اور اس کے لئے تحریک شروع کی۔

دسمبر ۱۸۶۵ء میں سرسید نے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی نکالا۔

"سائینٹفک سوسائٹی کا ایک اہم مقصد ہندوستان میں پیداوار کے بہتر طریقوں کا تعارف کرانا ہے۔ جس سے ملک کے عام لوگوں کی حالت بہتر بن سکے۔"

سائنسی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ایک خط میں لکھا۔

"سوسائٹی کا ایک اہم مقصد ہندوستان کے باشندوں کو میکانکس کی تعلیم دینا ہے۔ ایک ایسا علم جس کے ذریعہ وہ یورپ کے نئے اوزاروں اور ایجادات کا استعمال سیکھ جائیں گے اور جن کا استعمال ہندوستان کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔"

سرسید نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور انہیں زندگی کی حقیقتوں سے آشنا کرایا۔ انہوں نے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورنیٹل کالج کی بنیاد رکھی اور یہی کالج ۱۹۲۰ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔

جب کالج کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا تب انہوں نے کہا

"آج ہم جو بیج بو رہے ہیں کل وہ ایک بڑا درخت بن جائے گا، جس کی شاخیں برگد کے درخت کی طرح زمین میں نئی اور مضبوط جڑیں پھیلیں گی۔ یہ کالج ایک وقت میں شاید جو یونیورسٹی میں تبدیل ہوجائے اور اس کے طلبا ملک کے اس کونے سے اس کونے تک ـــــــ آزادانہ علمی جستجو، کشادہ دلی، برداشت، اور اونچے اخلاق کو پھیلانے کا ذریعہ بنیں۔"

علیگڑھ کالج میں طلبا کی تعداد

	۱۸۸۰ء	۱۸۸۱ء	۱۸۸۲ء	۱۸۸۳ء	۱۸۸۴ء	۱۸۸۵ء	۱۸۸۶ء	۱۸۸۷ء	۱۸۸۸ء
ہندو	۷	۸	۱۳	۱۳	۲۳	۳۰	۲۷	۲۳	۳۰
مسلمان	۸	۸	۱۴	۱۴	۳۴	۱۹	۲۲	۱۹	۳۹

(افتخار عالم، تاریخ مدرستہ العلوم علی گڑھ ص ۱۲۵)

ماضی کی کھڑکیاں کھولنے پر ہمیں پتہ لگتا ہے کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی تمام سالانہ رپورٹیں مندرجہ ذیل الفاظ سے شروع ہوتی تھیں۔

"یہ کالج ایک قومی ادارہ ہے جو مسلمانوں نے اپنی قوم کی تعلیمی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے قائم کیا ہے۔ اس ادارے کا اہم مقصد مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنا اور مغربی سائنس وادب کی تعلیم دینا ہے لیکن اس ادارے کا کردار کیتھولک ہے (یعنی سکولر) اور یہ تمام طبقوں اور قوموں کے لئے کھلا ہوا ہے، ہندوؤں کو بھی وہی درجہ حاصل ہے جو مسلمانوں کو۔"

(سال ۱۸۸۵-۸۶ء کی سالانہ رپورٹ سے اقتباس جسے منیجنگ کمیٹی کے اعزازی سکریٹری سید احمد نے پیش کیا۔)

جناب ایشوری پرساد یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ تھے جناب جے۔ سی۔ چکرورتی اور پنڈت وشنو شنکر کا شمار یونیورسٹی کے پہلے ممتاز ترین استادوں میں ہوتا تھا۔ پہلا سپاسنامہ مہاراجا آف پٹیالہ کو پیش کیا گیا۔ مہاراجا بنارس، مہاراجا پٹیالا اور راجا جے کشن داس نے یونیورسٹی کو بڑے بڑے عطیے دیئے جنہیں شکریے کے ساتھ قبول کیا گیا۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام دسمبر ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ اس کے بعد سے یونیورسٹی تمام میدانوں میں تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ پچھلے چار برسوں میں ترقی کی رفتار بہت ہی تیز رہی ہے اور اسی زمانے میں یونیورسٹی میں بہت سے قابل ذکر اضافے ہوئے ہیں۔

پورے ملک اور پوری دنیا کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی نے بھی اس سال دو سو سالہ برسیاں اور ایک پانچ سو سالہ برسی منائی۔ فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کی سو سالہ برسی بہت دھوم دھام سے منائی گئی جس میں دنیا بھر میں رہنے والے اردو کے قدر دانوں نے حصہ لیا۔ گاندھی شتابدی کی تقریبات تمام سال چلتی رہیں۔ اور گورو نانک کی پانچ سو سالہ برسی بھی بہت

مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم غیر ملکی طلباء کی تعداد ۷۱-۱۹۷۰ء

	مرد	عورت	کل
تھائی لینڈ	۱۱۳	۲۰	۱۳۳
ملیشیا	۳۵	۵	۴۰
تنزانیہ	۲۱	۲	۲۳
ایران	۴۷	۴	۵۱
صومالیہ	۸	—	۸
ماریشس	۹	۲	۱۱
کینیا	۸	۲	۱۰
عراق	۱	—	۱
جنوبی یمن	۲	—	۲
حبشہ	۶	۱	۷
نیپال	۱	—	۱
زمبیا	۳	۱	۴
جزائر فجی	۳	۱	۴
ویسٹ انڈیز	—	۱	۱
رہوڈیشیا	۵	۱	۶
یوگنڈا	۱۱	—	۱۱
اردن	۱۱	—	۱۱
افغانستان	۴	—	۴
جنوبی افریقہ	۲	—	۲
لبنان	۱	—	۱
سنگاپور	۲	—	۲
بحرین	۲	—	۲
نائیجیریا	۲	-	۲
فلسطین	۲	—	۲
انگولا	۱	—	۱
کانگو	۱	—	۱
عدن	۱	—	۱
زنجبار	۱	—	۱
		میزان	۳۵۲

احمدی نابینا اسکول مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایک تقریب

ہی جوش وخروش کے ساتھ منائی گئی۔

ان چار برسوں میں لنگوسٹک اور سوشیولوجی کے دو نئے ڈیپارٹمنٹ قائم کئے گئے، آرٹ فیکلٹی کو دو حصوں یعنی سوشل سائنسز اور آرٹس میں تقسیم کیا گیا، بزنس مینجمنٹ میں پوسٹ گریجویٹ کورس اور ڈاکٹر آف یونانی میڈیسن کا تین سالہ کورس شروع کیا گیا، کپڑوں کے ڈیزائن، کپڑوں کی سلائی اور الیکٹرونک انجینئرنگ میں پروڈکشن کے نئے شعبوں کا اضافہ کیا گیا، میڈیکل کونسل آف انڈیا نے ایم، بی، بی ایس کے کورس کو مان لیا۔ بی، ایس، سی کی ڈگری کو بحریہ میں الیکٹریکل اور میکینکل انجینئرنگ میں داخلے کے لئے قبول کیا جانے لگا۔ یہ سب مسلم یونیورسٹی کی موجودہ ترقی کے چند نمونے ہیں۔

جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کے لیے شاندار عمارت تعمیر کی گئی، اس میں اسپتال اور ۳۲۵ طلبا کا ہوسٹل تعمیر کیا گیا۔ لڑکیوں کے پولی ٹیکنک اور علم الحساب کے شعبوں کے لئے علیحدہ عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اس کے علاوہ ۲۶۰ لڑکیوں کے لئے اور ۸۵۰ لڑکوں کے لئے علیحدہ ہاسٹل تعمیر کئے گئے۔ سرسید احمد خاں کے گھر کی مرمت کی گئی۔ اس کے علاوہ آرٹ فیکلٹی میں اضافی تعمیرات کا کام بھی مکمل ہو چکا ہے۔ یہ سب وہ کام ہیں جن کے لئے یونیورسٹی جتنا بھی فخر

مسلم یونیورسٹی میں طلبا کی اقامت گاہیں

ایس ایس ہال۔ آفتاب ہال۔ وی ایم ہال۔ سلیمان ہال۔ ایم۔ ایم ہال۔ راس مسعود ہال۔ یادر حسن ہال۔ محمد حبیب ہال۔ این آر ایس سی ہال عبداللہ ہال۔ سروجنی نائیڈو ہال۔

محسوس کرتے کم ہے۔

پچھلے چند برسوں میں یونیورسٹی کی عظیم ترقی کا اندازہ ان چند اعداد و شمار کو دیکھ کر ہوتا ہے۔

	سنہ ۱۹۴۷ء	سنہ ۱۹۷۰-۷۱ء
اساتذہ کی تعداد	۲۳۰	۷۵۵
ریسرچ اسکالر	۳۱	۳۴۵
طالبعلموں کی مجموعی تعداد	۳,۶۱۳	۷۲۳۲
لائبریری کا بجٹ	۳۰,۰۰۰ روپے	۸,۹۰,۰۰۰ روپے
لائبریری میں کتابوں کی تعداد	۷۵,۲۹۰	۳,۸۶,۴۸۱

(۳۱ مئی ۱۹۷۰ء تک)

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد مندرجہ ذیل شعبوں اور نئے تعلیمی مرکزوں کا اضافہ کیا جا چکا ہے۔

فیکلٹیز:۔ قانون، کامرس، طب (میڈیسن) تھیولوجی اور سوشل سائنس (سماجی علوم)

مولانا آزاد لائبریری

سنہ ۱۹۷۲ء

کتابوں کی کل تعداد	۴۲۵۶۵۱
قلمی نسخے	۲۲۵۰
ممبر شپ	۷۰۰۰
سالانہ بجٹ سنہ ۱۹۷۱-۷۲ء	۲۷۵۰۰۰ روپے

سنٹرز اور انسٹی ٹیوٹ:۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، عام تعلیم کا سنٹر، تاریخ کی اونچی تعلیم کا مرکز، مغربی ایشیا کے علوم کا مرکز۔

ڈیپارٹمنٹ:۔ سوشیولوجی، لائبریری سائنس، اپلائیڈ سائنس اور لنگوسٹکز۔

یونیورسٹی کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہاں کا اقامتی کردار ہے۔ اس طرح طلباء کو نہ صرف پڑھنے کا بلکہ

مسلم یونیورسٹی کے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج میں سالانہ جلسہ کے موقع پر "شام ادب"
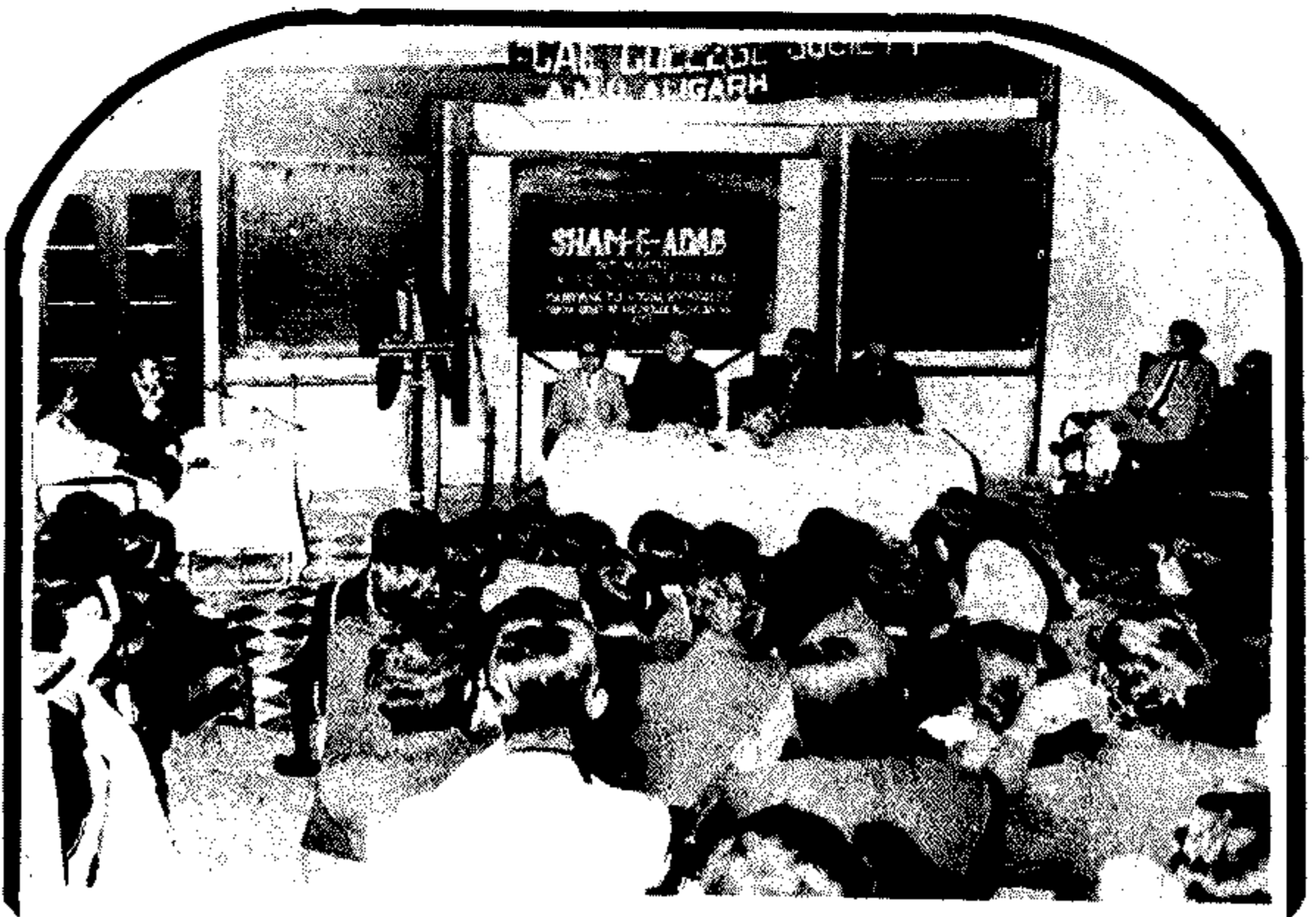
سرسید کی موت پر یوروپین لیڈی کا مرثیہ

منجملہ ان بے شمار مرثیوں اور نوحوں کے جو اس حادثہ عظیم (سرسید کی وفات) پر لکھے گئے چند اشعار ایک یوروپین فاضل لیڈی نے بھی انگریزی زبان میں ترتیب دیئے ہیں چونکہ لٹریری دنیا میں شاید یہ پہلی ہی مثال ہے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان کی موت پر انگلستان کی ایک شریف لیڈی ایک نظم بطور مرثیہ کے اپنی زبان میں لکھے اسلئے ہم اس لطیف سونٹ (مرثیہ) کا ترجمہ اس مقام پر لکھتے ہیں — "ایک تناور درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اسکی سایہ دار شاخیں جو چاروں طرف دور تک جھومتی تھیں، صحت بخش شبنم ان سے ٹپکتی تھی اور انھوں نے کثرت سے بیج بکھیرے تھے، ان کے سایہ میں بنجر زمین اصلاح پاگئی" — "بیج پھوٹ نکلے، شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے اور خوبصورت نونہالوں نے جو طاقت اور حسن سے آراستہ تھے اس ویران ریگستان کو گلزار بنادیا۔ روؤ! اب شاہانہ درخت کے لئے کہ اجل نے اس کو گرادیا ہے" — "غم کرو مگر امید کے ساتھ! کیونکہ اس کی ہری بھری کھیتیاں جو اس کی سالہاسال کی محنت کا ثمرہ ہیں اس کی قبر کے گرد لہلہا رہی ہیں۔ جن نونہالوں کو اس نے اپنی چھاؤں میں پرورش کیا تھا وہ پھول رہے ہیں اور چہک رہے ہیں۔ یہ نونہال بھی اسی کی مانند زندہ رہیں گے تاکہ کسی ویرانہ کو گلزار بنا جائیں۔"

"حیات جاوید" حصہ اوّل ص ۲۷۵-۲۷۶

ایک ساتھ رہنے کا موقع ملتا ہے۔ زیادہ تر استاد اور دوسرے آفیسر بھی یہیں رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے طالبعلموں اور استادوں کے درمیان برادرانہ اور دوستانہ رشتے قائم ہیں۔ استاد اپنے طالبعلموں سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے ہیں اور طالبعلم اپنے استادوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔

یہاں صرف ٹکنیکل اور دنیاوی تعلیم پر ہی زور نہیں دیا جاتا بلکہ لڑکے کی اخلاقی اور روحانی تعلیم پر بھی پورا پورا دھیان دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے اندر اخلاقی اصول، انسان دوستی اور برداشت کا مادّہ پیدا کرسکے جو تمام مذاہب کی بنیادی تعلیم ہیں۔

اس کے علاوہ ہماری بہت سی ایسی قدریں ہیں جنہیں قائم رکھنے کے لئے ہم ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں۔ بہت سے میلے اور فنکشن کرائے جاتے ہیں۔ جب تمام طلباء ۲۶ جنوری یا ۱۵ اگست کو کندھے سے کندھا ملاکر قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں، یا عید ملن اور ہولی ملن کا تہوار مناتے ہیں، تب قومی ایکتا اور مل کر رہنے کا جذبہ تمام فضا کو رنگین بنا دیتا ہے۔

جس طرح ہم گنگا اور جمنا کے سنگم پر سرسوتی کو نہیں دیکھ پاتے اسی طرح ہم یونیورسٹی کے سب سے زیادہ خوبصورت پہلو میں "بلند اخلاق اور کشادہ دلی" کو نہیں دیکھ پاتے، اور جس پر سب لوگوں کی نظر جاتی ہے وہ ہے اس کا "اقلیتی کردار" یا جو کچھ بھی ہم اسے کہیں۔

اس لئے ہماری خواہش ہے کہ یہ مختلف رنگوں کے خوشبودار گلاب جو یونیورسٹی کی عمدہ آب و ہوا میں پرورش پارہے ہیں، غلط فہمی اور تعصب کی گرم ہواؤں کا شکار ہوکر پامال نہ ہوجائیں۔

کالج کی صدائیں

سنہ ۱۹۶۳ء میں سوشلسٹ رہنما اشوک مہتہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر

(از، محمود احمد صاحب، متعلم مدرسۃ العلوم علیگڈھ)

کالج کی زندگی بھی آج کل ایک عجیب قسم کے ہلچل میں گزرتی ہے۔ بہت سے پڑھنے کے شوقین اس شور و شغب سے گھبرا کر جنگل کا راستہ لیتے ہیں تاکہ وہاں اس سے محفوظ رہ کر اپنی پڑھائی میں مصروف رہیں۔ برخلاف اس کے بہت سے ایسے ہیں جو کالج کی زندگی کا لطف اس غل غپاڑہ میں سمجھتے ہیں اور اس میں حصہ لینا کالج لائف کے مقاصد کا ایک بہترین مقصد خیال کرتے ہیں۔ حسن اتفاق سے "پریسیڈنٹ صاحب خوانچہ کمیٹی" کے خطوط کا فائل میرے ہاتھ لگ گیا تھا جسکو میں ہدیۂ ناظرین کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلحاظ دلچسپی وہ اپنے طرز کا نرالا خط تھا۔ جس کا اندازہ خود ناظرین کریں گے۔

جناب پریسیڈنٹ صاحب! وینڈرس کمیٹی — تسلیم!

جناب کو معلوم ہے کہ آجکل تھرڈ ایر کے طلباء اپنے لئے کسی نہ کسی

اشوک مہتہ یونیورسٹی کے ذمہ داروں کے ساتھ

پوزیشن کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ کچھ لوگ کرکٹ، ہاکی یا فٹ بال کی کپتانی کے لئے کوشش کر رہے ہیں یا اس کی خواہش میں ہیں تو دوسرے ڈائننگ ہال، مناظرہ یا ہاؤس کی سینیئر مانیٹری کی فکر میں ہیں کچھ لوگ ان تمام کھیلوں کے سکریٹری بننے کی خواہش کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کچھ نہیں تو ٹینس کی سکریٹری شپ کا انتظار کر رہے ہیں اور زیادہ تر حصہ ایسا ہے جو اس انتظار میں ہے کہ دیکھئے ان کی قسمت ڈائننگ ہال، مسجد یا ہاؤس

ثقافتی کردار کا نمونہ

سرسید ہال

مسلم یونیورسٹی کے ذمہ داران اور عہدہ داران (جو اساتذہ اور طلبار پر مشتمل ہیں)

میں سے ان کو کس طرف لے جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے معزز و معتبر عہدوں کے لئے وہی لوگ تجویز ہوں گے جن کے حقوق بہت زیادہ ہوں۔ اس لئے کالج کے موجودہ عہدوں سے تو مجھ کو بالکل مایوسی ہے مگر بحیثیت کالج کے ایک ممبر ہونے کے میں ان حقوق کو بخوبی محسوس کرتا ہوں جو کالج کے مجھ پر واجب ہیں اور اس لئے کالج کی خدمت کا ایک ایسا ذریعہ منتخب کرنا چاہتا ہوں جس سے لوگوں کے حقوق کبھی پامال نہ ہوں اور میں بھی اس بارِ گراں سے سبکدوش ہو جاؤں جو کام کہ میں نے اپنے لئے پسند کیا ہے۔ وہ کالج کی صداؤں کی نگرانی کرنے کا ہے میرا خیال ہے کہ اس عہدہ سے میں نہ صرف اپنے لئے اقتدار و پوزیشن حاصل کروں گا بلکہ اس سے میں کالج کے طلبار کی اُن عام شکایتوں کو بھی رفع کر سکوں گا جو خوانچہ والوں یا اور ایسے ہی شور کرنے والی جماعت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ میں جناب کے روبرو وہ اسکیمیں پیش کرتا ہوں جو اس فرقہ بی ذرع کے بارے میں میرے دماغ میں منڈلا رہی ہیں اور اس سے جناب پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ عہدہ مذکور کے لئے مجھ سے زیادہ کوئی بھی موزوں نہیں ہے آخری فیصلہ جناب کی رائے پر چھوڑتا ہوں۔

جناب والا! قریب قریب ہر جگہ جہاں بھی پھیری والوں کا دور دورہ ہے۔ اس قسم کی صدائیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو کہ منہ سے نکلتی ہیں۔ اور دوسری وہ جو کسی باجے سے۔ بدقسمتی سے کالج کی چہار دیواری کے اندر صرف اول الذکری سے کام لیا جاتا ہے اور آخر الذکر کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ یہ چنداں معیوب نہ ہوتا اگر منہ سے نکلی ہوئی صدائیں سریلی اور دلکش ہوتیں مگر افسوس ہے قصداً سُروں سے اجتناب کیا جاتا ہے اور اکثر غلط سُر نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ماہرانِ فن موسیقی جن کی تعداد یہاں کثرت سے ہے اور فن مذکور کے مداح جو کہ قریب قریب سب ہیں اس فن پر ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر کس قدر بگڑتے ہوں گے۔ میں ان کے محسوسات کو مدنظر رکھ کر ان لوگوں کی صدائیں پہلے خود سنوں گا اور جس وینڈر کی آواز کان کے پردے پر برا اثر ڈالنے والی ہوگی اس کو احاطہ کالج میں گھسنے کی اجازت نہ ہوگی یا کم از کم اپنے پڑوسی کی مدد سے جو تال و سر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور جو کہ اپنے زمانہ کے تان سین ہیں۔ ایسے لوگوں کی آوازیں سنبھالنے کی کوشش

کروں گا اور اسبات کا خاص لحاظ رکھوں گا کہ ہر ایک وینڈر کا سُر اس کے مال کی مناسبت سے ہو۔ میٹھی چیزیں فروخت کرنے والوں کا سُر میٹھا اور نمکین چیزیں فروخت کرنیوالوں کا سُر نمکین ہو۔ جس وینڈر کے پاس دونوں طرح کی چیزیں ہوں اس کی صدائیں دونوں طرح کے سُر ہوں گے مگر شرط یہ ہوگی کہ جس قسم کی چیز زیادہ ہوگی اسی طرح کا سر لمبا اور دوسری طرح کا سر چھوٹا ہو۔ یہ بھی خیال رکھا جائے گا کہ تازہ مال کے

کروں۔ لہٰذا یہ سب سے زیادہ مقدم فرض ہوگا کہ جس قدر انگریزی چیزیں بھی کالج کے اندر فروخت ہونے کو آئیں ان کا ایک نہایت موزوں اردو نام رکھ دیا جاوے۔

عاشقانِ اردو کو کس قدر گراں گزرتا ہوگا جبکہ ٹینس کے بلے درست کرنے والا نہایت بے ترتیبی سے کہتا ہوا گزرتا ہے بلّا راکٹ بلّا مرمت باٹ والا۔ راکٹ والا۔ بلّا۔ باٹ والا یہ حرکت اگر صرف ایک ہی تک محدود

واسطے زوردار آواز میں اور باسی مال کے لئے ہلکی آواز میں سُر نکلے۔ ایسا کرنے سے کمرہ کے اندر بیٹھے ہی بیٹھے خوانچہ کے کل حالات معلوم ہو سکیں گے۔ اگر یہاں ان لوگوں کی حالت ٹھیک نہ ہو سکی تو مجبوراً لکھنؤ سے ایسے پھیری والے بلا لئے جائیں گے جو کہ اس فن کے استاد ہیں کیونکہ وہاں کی آب و ہوا تو نہ معلوم کتنے اور پیدا کرے گی مگر اس علی گڑھ میں جہاں انگریزی کی بو حد درجہ سما گئی ہے ایسے لوگوں کا خود بخود پیدا ہونا مشکل نظر آتا ہے اس انگریزی کی بو ہی نے تو تمام چیزوں کے نام انگریزی میں تبدیل کر دیئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انڈے کی مٹھائی کو ایگ نوگ اور ناریل کی مٹھائی کو کوکونٹ سے موسوم کیا جاتا ہے میں نے اردو آب و ہوا میں پرورش پائی ہے اور اس عمر کو پہنچا ہوں۔ میں نہایت ناشکر گزار ہوں گا اگر میں اس کے حقوق کو پوری طور پر تسلیم نہ کروں اور اس کی خدمت کی انجام دہی میں کوتاہی

ہوتی تو کچھ ہرج نہ تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر بھی اس پیشہ والے ہیں سب نے اپنی پنچایت کر کے اس اوٹ پٹانگ بولی کا انتخاب کیا ہے۔ مجھ کو ہمیشہ خوف رہتا ہے کہ کہیں اردو کی اس بے ادبی کو دیکھ کر کوئی جلے تن طیش میں نہ آجائیں اور اس کو زد و کوب کر بیٹھیں۔ جس سے کہ کالج کی شہرت کو صدمہ پہنچے۔ شکر ہے کہ ابھی تک اس کی کوئی نظیر قائم نہیں ہوئی۔ مگر ہر چیز کی احتیاط لازمی شے ہے اور جلد سے جلد اس بولی کا سنبھالنا ضروری ہے۔ یہ سچ ہے کہ چونکہ اس کا پیشہ کھیل سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا اس کی صدا بھی کھلونا کی شکل میں نکلے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو زبان ہی دنیا میں ایک زبان ہے جو اس قسم کی بے سر و بے پاؤں کی بولیوں کے لئے تختہ مشق بنائی جاوے۔ میں اس مناسبت کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دوں گا اور اس کی جگہ ایک ایسی زبان دوں گا جو

بذاتِ خود ایک کھلونا ہوگی۔

جناب والا! صبح کے وقت نہایت خوشنما وردی پہنے ہوئے مکھن والا مکھن چاہئے صاحب کی صدا لگاتا ہوا گزرتا ہے۔ میں نے اس قوم کے صرف اسی ایک شخص کو اپنی آواز کے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ صنعتِ لہجہ سے اپنی صدا کو شعر کی صورت میں نکالتا ہے۔ میرا فرض ہوگا کہ اس کو بتلاؤں کہ شاعری میں صرف صنعتِ لہجہ ہی ایک ایسی صنعت نہیں ہے جس سے کہ اشعار بنتے ہیں بلکہ اور بھی بہت سی صنعتیں ہیں اور اگر ان کا لحاظ رکھ کر اشعار بنائے جائیں تو بہت بھلے معلوم ہوں گے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ شاعروں کی یہاں کمی نہیں اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ان تک جس قدر میری رسائی ہے کسی دوسرے کی نہیں۔ ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھا کر اس کی صدا میں وہ حلاوت پیدا کی جا سکتی ہے کہ جو سنے خوش ہو اور دل بہلے۔ برخلاف اس کے کس قدر ناگوار ہوتا ہے جب مونچی جونتا سلے گا صاحب جونتا کی صدا لگاتا ہوا نکلتا ہے۔

جناب والا! اگر اس کے لہجہ پر غور کیا جاوے تو بدتہذیبی مترشح ہوتی ہے۔ اگر الفاظ کے مخارج کو دیکھا جاوے تو غلط۔ اگر آواز کا خیال کیا جاوے تو کرخت۔ غرض کسی لحاظ سے بھی اس کی صدا قابلِ سماعت نہیں ہے۔ بعض افراد بدتہذیبی کی انتہا کر دیتے ہیں جبکہ لفظ جوتا پر بلا وجہ زیادہ زور دے بیٹھتے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ آج میرے برابر حروف کا ٹھیک مخرج جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ میں آسانی سے ان لوگوں کو حروف کے اصلی مخرج بتلا سکوں گا اور ساتھ ہی ادب بھی سکھلاؤں گا۔ ان کے لہجہ کی اصلاح کر دوں گا۔ مجھ کو یقین ہے کہ میری اس کارروائی سے ان کی آواز ملائم پڑ جائے گی اور بغیر بارج ہوئے یہ لوگ گزر جایا کریں گے۔ یہ تعجب ہے کہ نان خطائی والا جو اکثر کالج کے حدود میں — نان خطائی — چلاتا ہوا پھرتا ہے۔ بورڈنگ میں گھسنے نہیں پاتا ورنہ کالج کے ہسپتال میں ماہر امراض کان کی ضرورت پڑ جاتی۔ اپنی صدا کے نکالنے میں ایڑی تک کا زور صرف کر دیتا ہے۔ میں دل میں کہا کرتا تھا کہ کاش اس کو اقتصادیات کے علم سے واقفیت ہوتی تو وہ سمجھتا کہ اس کی محنت اس کے نفع سے کہیں زائد ہوتی ہے۔ میں نے ایک دفعہ اس سے اس قدر زور سے آواز نکالنے کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ میری آواز کو بچے دور سے سن کر اپنی اپنی ماؤں سے پیسے مانگنے لگتے ہیں اور میرے ان کے پاس پہنچنے تک وہ دروازہ پر پیسے لئے تیار رہتے ہیں اور اس طرح میں اپنا بہت سا وقت بچا سکتا ہوں۔ جواب اس قدر معقول تھا کہ مجھے اپنے خیالات کی غلطی تسلیم کرنا پڑا۔ مگر چونکہ بورڈنگوں کے اندر کسی کی مائیں نہیں بیٹھی ہیں اس لئے کرخت آواز کے ساتھ اس کا یہاں آنا گوارہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ نامناسب ہے کہ آواز کی کرختگی اس کی اچھی اور خستہ نان خطائیوں کو شائقین کے منہ سے الگ رکھے۔ لہٰذا ہلکی آواز کی شرط کے ساتھ اس کو اندر آنے کی اجازت ملنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس شرط پر خود وہ تیار ہے کیونکہ اکثر بارکوں کے پیچھے اپنے منہ ہی منہ میں اپنی صدا کے ساتھ گشت کرتا ہوا پایا گیا ہے۔

فیرنی کے پیالے والے کا بھی ایک خاص وقت معین ہے۔ ہمیشہ ساڑھے بارہ بجے دن کو شیر برنج کی صدا لگاتا ہوا تیزی

سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ ہدایت اللہ مسلم یونیورسٹی کے طلباء اور وائس چانسلر ڈاکٹر علیم کے ہمراہ سرسید احمد خانؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے

سے گزرتا ہے۔ مجھ کو اس کے سانس پر کس قدر رشک آتا ہے جبکہ ایک ہی سانس میں اس کو دس دس کمرہ طے کرتا ہوا دیکھتا ہوں تیز رفتاری بھی غضب کی ہے۔ جب آواز دو چار پانچ کمرہ آگے سے لوٹتا ہے اس کی لمبی سانس اس کی صدا کو کبھی صاف طور سے معلوم نہیں ہونے دیتی۔ اگر اس کو کسی کمرہ پر بیع و فروخت کی گفت و شنید کے لیے بیچ بیچ میں سانس توڑنا پڑتا ہے اس کا قول ہے کہ میں "شیر برنج" کہتا ہوں مگر کوئی بھی اس صدا کو نہیں سمجھتا اور اکثر نئے حضرات صرف اس کے پیچھے چلنے والے مزدور کے ٹوکرے سے اس کے مال کا پتہ معلوم کرتے ہیں مزدور بہت زیادہ سمجھدار ہے اور اگرچہ اس کو تیز چلنا پڑتا ہے مگر اس بات کی احتیاط رکھتا ہے کہ مالک سے پانچ کمرہ پیچھے چلتا ہے تاکہ مالک کے ساتھ اس کو بھی اس قدر نہ لوٹنا پڑے جتنا کہ وہ لوٹتا ہے یہ سب سمجھتے ہیں کہ اس شخص کی آواز بہت اصلاح طلب ہے۔ یہ اپنے گاہکوں کو غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیتا اور ان کے ارادہ کرتے کرتے چو بیس گھنٹہ کے لئے اوجھل ہو جاتا ہے جناب والا! اس کی رفتار اور آواز سنبھالنے کا فرض بھی میں اپنے اوپر ہی لوں گا۔

جناب والا! اس قدر لکھنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اب موقعہ ہے کہ آپ کی توجہ اس زبردست شخصیت کی طرف رجوع کراؤں جو آج تمام خوانچہ والوں کی ناک اور سچ تو یہ ہے کہ سب کی لاج رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ کالج اس صیغہ میں کبھی کا بدنام ہو چکا ہوتا۔ کمال کسی تعریف کی ضرورت نہیں رکھتا۔ "پان بیڑا پان" کی صدا کس قدر صاف اور کس قدر بھلی معلوم ہوتی ہے کہ سننے والے دل سے تعریف کرتے

ہیں۔عام لوگوں کے لئے سوائے آواز کی خوبی کے اور کوئی دلچسپی
پیدا نہیں کرسکتا مگر اپنے گاہکوں کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ
کرتا ہے اور ان کے خوش کرنے کے لئے طرح طرح کے کرتب
کرتا ہے کبھی وہ کسی پیادہ پلٹن کا سپاہی بنکر قواعد کرتا ہے
اس کے لئے کسی جمعدار کی بھی ضرورت نہیں۔کیونکہ اس کا کام
بھی بولی بول کر خود ہی کرتا جاتا ہے۔کبھی کسی بڑے اکھاڑے کا
پہلوان بنکر طرح طرح کے ڈنڈ اور داؤں پیچ دکھلاتا ہے اور کبھی
انگریزی کی اے۔بی۔سی۔ڈی شروع سے آخر تک فرفر سناجاتا
ہے۔اتنی سمجھ بھی رکھتا ہے کہ موقع اور محل کو پہچانے اور اپنی تمام
حرکات اسی وقت کرتا ہے جبکہ اس کو علم ہو جاوے کہ اسکا گاہک
ان سے خوش ہوگا۔اکثر لگاتار محنت کے بعد اس نے دماغ کو
فرحت پہنچانے میں بہت بڑا کام کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کھانی
نے چھوٹوں بڑوں سب میں ہر دلعزیزی اختیار کی ہے۔
ہر دلعزیزی کے اعتبار سے غلام حسین کا نمبر بھی کسی طرح کم
نہیں ہے۔اگرچہ اس میں کھانی کے اوصاف میں سے ایک
وصف بھی نہیں۔تاہم اس میں ایک دل ہے جس کی وجہ سے
اس نے دوسرے کے دلوں میں گھر کر رکھا ہے۔اس کا ہر ایک
شخص پر اعتبار ہے اور اگرچہ بعض اوقات اس کو نقصان اٹھانا
پڑا ہے مگر زبان پر کبھی شکایت کو نہیں لاتا اور اپنے پرانے
بنائے ہوئے اصولوں پر برابر کاربند ہے۔یہ باتیں اس کی زندگی
ہی تک ہیں کیونکہ جو بچہ اس کے ساتھ پھرا کرتا ہے اور جو آئندہ
اس کا جانشین ہوگا بڑا کوتاہ دل ہے اور اگر کوئی اس کے خوانچہ
میں ہاتھ ڈال دے تو رو دیتا ہے۔غلام حسین اور کھانی دوسرے
خوانچہ والوں کے لئے مثالیں ہیں کہ کس طرح ایک شخص ہر دلعزیزی
اختیار کرسکتا ہے اور گاہکوں میں ہر دلعزیزی خوانچہ والوں کے
لئے نہایت مفید ہے۔

ملائی والے سے مجھ کو جس قدر نفرت ہے اتنی کسی شخص
سے نہیں۔یہ بات ضرور ہے کہ اس کا برف گرمیوں میں بہت ہی
زیادہ لطف دیتا ہے مگر جاڑوں میں اس کی آواز بھی سردی
کا اثر کرجاتی ہے اور بیمار ڈالنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔
گرمیوں کے دنوں کے علاوہ جب کبھی بھی وہ برف فروخت کرتا
ہوا پایا جاوے تو ہمارا فرض ہے کہ فوراً ہی اس کے مال کو تلف
کردیں مجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ ہمارے اچھے ارادوں
کا لحاظ رکھ کر کوئی قانونی کارروائی ہم پر نہ ہوسکے گی۔جناب والا
قبل اس کے کہ اس عریضہ کو ختم کروں اس گندی کے بارے میں
اپنے خیالات ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو اکثر "تیلنل بیلا
چنبیلی" کہتا ہوا بڑی تکلیف کے ساتھ اپنے تھکے ہوئے اعضا
کو گھسیٹتا ہوا چلتا ہے۔اگر اس کا کہنا ٹھیک ہے کہ اس کی عمر کا
ایک بڑا حصہ کالج میں تیل بیچتے ہوئے گزرا تو کالج کا یہ فرض
ہے کہ اپنے پرانے کاروباری کی اس کی ضرورت کے وقت مدد
کرے اور اس کے رہنے کو کالج کے احاطہ ہی میں کوئی دکان
بہت ہی سستے کرایہ پر دے دے۔تاکہ باقی حصہ زندگی بھی وہ
کالج ہی میں تیل بیچ کر کاٹے۔

جناب والا! اس قدر لکھنے کے بعد میں اپنے آپ کو آپ کی
خدمت کے لئے پیش کرتا ہوں۔یہ سچ ہے کہ مندرجہ بالا کام
بہت آسان معلوم ہوتے ہیں مگر ان لوگوں کے لئے جو ظاہرا بہت
کچھ ہیں لیکن دل لگا کر کام کرنے کا سبق ان کے استاد نے ان کو
نہیں سکھایا۔اس میں کا ہر ایک جزو ایک مہم عظیم ہے اور تمام
کام اسی وقت سرانجام پاسکتے ہیں جبکہ کام کرنیوالے ظاہری نام
نمود کو چھوڑ کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوجاویں۔آخر میں
مجھ کو امید ہے کہ جناب والا! میری عرضداشت کو قبول فرماویں
گے ۔۔۔۔۔ میں ہوں جناب کا تابعدار ۔۔۔۔۔ "بوالہوس"

(ماخوذ:۔از علی گڑھ منتھلی بابت ماہ دسمبر ۱۹۱۵ء)

(جلد نمبر ۱۳۔شمارہ نمبر ۱۲)

علم کے اس سوتے کے بارے میں

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رائے

"آج مغربی تعلیم ہماری زندگی کا ایک جزو بن چکی ہے اور ہم قدرتی طور پر جب بھی تعلیم کے بارے میں سوچتے ہیں ہمارا اشارا اس کی طرف ہوتا ہے۔ آج ہمارے لئے ان تکالیف، مشکلات اور مخالفت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے جو ان لوگوں کو پیش آئیں جنھوں نے جدید تعلیم کو ہم تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ انھوں نے نہ صرف ایک نئی راہ پر ایک نئے سفر کا آغاز کیا تھا بلکہ انھیں ہر ہر قدم پر انجانی رکاوٹوں کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ انھیں بھی ان تمام طاقتوں کا سامنا کرنا پڑتا جو ہر دور میں ہر جگہ نئی تبدیلیوں اور ترقی کی مخالفت کرتی رہی ہیں۔ لوگوں کے ذہن سیکڑوں برس پرانے رواج اور جہالت کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ زنگ خوردہ اعتقاد اور بوسیدہ جذبات کسی بھی قسم کی تبدیلی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مذہب کے دشمنوں نے اس جنگ میں مذہب کو اپنا سب سے خطرناک ہتھیار بنا لیا۔ علم، عقل و دانش اور مذہب میں کہیں بھی کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے سامنے اس کو اسی شکل میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ یہ نعرہ لگایا گیا کہ نئی تعلیم مذہب کے خلاف ہے اس لئے نئی تعلیم حاصل کرنا اپنے مذہب سے دور ہٹنا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو

وہ (سرسید) ہندوؤں کے خلاف یا فرقہ پرست نہیں تھے، انہوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ مذہبی اختلافات کو کوئی سیاسی یا قومی اہمیت نہیں دینی چاہئے انہوں نے کہا۔ کیا تم سب ایک ہی ملک میں نہیں رہتے ہو؟ یاد رکھو کہ لفظ ہندو اور مسلمان محض مذہبی امتیاز کی نشانی ہیں ورنہ ہمارے ہندوستانی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ (تلاش ہند)

علم کو ان رکاوٹوں کا مقابلہ مختلف اوقات میں مختلف ملکوں میں کرنا پڑا ہے۔ یورپ ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں صدی میں اس دور سے گزرا جب کہ مشرق میں یہ دور ۱۹ ویں صدی میں شروع ہوا۔ ہندوستان کے ہندو اس دور میں پہلے داخل ہوئے اور جلد ہی اس سے گزر گئے۔ مسلمانوں میں یہ دور دیر میں شروع ہوا اور اس کے ختم ہونے میں بھی زیادہ وقت لگا۔ لیکن آخر میں تبدیلی چاہنے والی اور ترقی کی طرف بڑھنے والی طاقتوں کو فتح حاصل ہوئی اور علم دشمن طاقتوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے بلا کسی ہچکچاہٹ کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس نئی روح کو پھونکنے میں سب سے بڑا ہاتھ اس یونیورسٹی کے روح رواں کا تھا۔ حق و باطل کی یہ جنگ یہاں علی گڑھ میں لڑی گئی اور علی گڑھ نئی طاقتوں کی فتح کی جیتی جاگتی نشانی بن گیا۔

"سرسید نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی نہیں بلکہ ایک علمی و سماجی مرکز قائم کیا تھا جو نئے زمانے کی نئی روح سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ اور اس مرکز کی مرکزی شخصیت خود سرسید تھے جن کے چاروں طرف اس وقت کے چند بہترین عالم جمع ہو گئے تھے۔ شاید ہندوستان کا کوئی دوسرا اخبار یا رسالہ ایک پوری نسل پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوا جیسے کہ سرسید کا "تہذیب الاخلاق"۔ سرسید نے اس رسالے کی اشاعت انگلینڈ سے واپسی کے بعد شروع کی۔ اس میں زیادہ تر وہ اور ان کے رفقا ہی لکھتے رہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس رسالے ہی کے ذریعے جدید اردو کی بنیاد پڑی ۔۔۔ اس اردو کی بنیاد جو مشکل سے مشکل جدید خیالات کو بہت آسانی سے ادا کرنے میں کامیاب رہتی ہے۔ شاید اس وقت کوئی بھی ایسا پڑھا لکھا مسلمان نہیں ہوگا جو اس رسالے سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید دور کے سب سے عمدہ اردو مصنفوں اور شاعروں نے یہیں پرورش پائی۔ یہاں اسلامی فکر نے ایک نیا انداز ایک نیا موڑ اختیار کیا۔ حالاں کہ جدید اردو شاعری لاہور میں پیدا ہوئی لیکن اسے بڑھنے اور ترقی کرنے کا ماحول یہیں ملا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں نئے انداز کی غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ یہاں اردو تقریر کو ترقی کرنے کا پہلا پلیٹ فارم ملا۔ اس وقت کے اور آنے والے وقت کے زیادہ تر اچھے مقرر یہیں کی پیداوار ہیں۔"

(انگلش سے ۔۔۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۸ء کو کانووکیشن سے خطاب کرتے ہوئے)

اللہ اکبر اللہ اکبر

پروانہ ردولوی

بھیکم پور سے گزر کر جب ہم وکٹوریہ گیٹ کے سامنے جا کر رکے اس وقت میرے ذہن میں علی گڑھ کے "قومی شاعر" مجاز کے ترانہ کے یہ مصرعے گونج رہے تھے ؎

جو ابر یہاں سے اٹھے گا
وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا
ہر کوہِ گراں پر برسے گا

ایسا لگتا تھا کہ مجاز وکٹوریہ گیٹ کی آخری چھت پر کھڑا ہوا چلا چلا کر یہ ترانہ سنا رہا ہے اور اس احساس نے میرے سازِ دل کے ہر تار کو جھنجھوڑ دیا، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "واقعی یہاں سے اٹھنے والا ہر ابر سارے جہاں پر برستا رہا ہے اور برسے گا۔ واقعی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صرف ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک ہے، ایک بحرِ بے کراں ہے جس سے اپنے اور پرائے سب سیراب ہوتے ہیں، ایک منارۂ نور ہے جس کی کرنیں زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں اور واقعی مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے دل کی دھڑکن ہے جس نے مسلمانوں کو صدقے کی روٹیوں پر زندگی بسر کرنے سے روکا اور قومی زندگی میں برابر کا حصہ دار بنایا۔"

آج اسی یونیورسٹی پر چاروں طرف سے ایک یلغار سی ہو رہی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کی شدھی کی جائے کوئی کہتا ہے کہ اسے سیکولر بنایا جائے اور کسی کا مطالبہ ہے کہ اسے ایک قومی ادارہ بنا دیا جائے، کچھ لوگ یونیورسٹی کو پاکستانی ادارہ بھی کہتے ہیں لیکن میں نے اپنے دو روزہ قیام کے دوران تعلیم کے اس گہوارہ میں جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سنا اس کی بنا پر یہی کہوں گا کہ مسلم یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی ہی رہنا چاہیے — کیونکہ ہندوستان کی یہی ایک واحد یونیورسٹی ہے جس نے ہندوستان میں سب سے پہلے سیکولرزم کا عملی تصور پیش کیا۔ جو ہندوستان میں پاکستان کا اڈہ نہیں بلکہ قوم پروری اور وطن نوازی کا مرکز ہے، جو اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک قومی ادارہ ہے اور جس کی ہر اینٹ اور جس کی خاک کا ہر ذرہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ خدا کے لیے تعصب، تنگ نظری اور نفرت کی عینکیں اتار کر مجھے دیکھو اور مجھ سے انصاف کرو۔

جو ابر یہاں سے اُٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا ہر کوہِ گراں پر برسے گا

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر
اردو ڈائجسٹ ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء

نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر انصاف پسند انسان کا فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے جو قربانی بھی دیجائے کم ہے۔

میں نے اپنے قیام کے دوران مسلم یونیورسٹی کے چپہ چپہ کو دیکھا، مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس کے سبزہ زار رو رہے ہیں، اس کا اسٹریچی ہال نالہ و شیون میں مصروف ہے اس کی مسجد اپنی حرمت کے تحفظ کی ضمانت طلب کر رہی ہے، اس کا سرسید ہال کسی بوڑھے فقیر کی طرح سر جھکائے ہوئے سسکیاں بھر رہا ہے، اس کے باغیچوں کے پھول گل چینوں کے خوف سے کانپ رہے ہیں، اس کی کلیاں کھلنے سے پہلے ہی مرجھا رہی ہیں اور اس کا باغبان مصلحت پسندی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ۔ ۔ ۔

کوئی دل کی بات کھل کر نہیں کہتا، ایکٹ کے مخالفین بھی چپ ہیں اور اس کے حامیوں کی زبان بھی بند ہے بقول شاعر ؂

آئینہ حیران، درباں دم بخود احباب چپ
جسکو دیکھو بزم جاناں میں وہی خاموش ہے

لیکن کہیں کہیں یہ خاموشی ٹوٹی بھی، سرسید احمد کے عاشق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر خلیق احمد نظامی نے جنہیں سرسید احمد کی ذات اور تحریک سے دلی لگاؤ ہے کھل کر ایکٹ کی حمایت کی۔ دوسری طرف یونیورسٹی یونین کے سکریٹری عارف محمود خاں نے کہا "ایکٹ نے نہ صرف مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو ختم کیا ہے بلکہ اس کے ذریعہ یونیورسٹی کی خود مختاری کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے، اور وہ دن دور نہیں جب یونیورسٹی مرکزی وزارت تعلیم کا ایک شعبہ بن کر رہ جائے گی۔" انہوں نے مطالبہ کیا کہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو باقی رکھنے کے لیے اس کا انتظام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں رکھا جائے ۔۔۔۔۔

علی گڑھ کالج کے مشہور قومی رہنما علی برادران جنہوں نے تحریکِ خلافت چلائی

اگر تاج محل ایک بادشاہ کی اپنی ملکہ سے غیر فانی محبت کا شاہکار ہے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک فقیر منش انسان کی اپنی ملت، اپنی قوم اور اپنے ملک سے محبت کی لافانی یادگار ہے۔ اس یادگار کو باقی رکھنا صرف مسلمانوں ہی کا

میں نے عارف محمود سے کہا "آپ کے جذبات نیک ہیں آپکے خیالات پرکشش ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ کوئی سرسید نہیں جو ایک خاکہ بنائے اور اپنوں اور پرایوں کی شدید مخالفت کے باوجود اس خاکہ میں عمل کا رنگ بھرے ـــــ کاش ہندوستان کوئی اور سرسید پیدا کر سکتا، کوئی اور محسن الملک آتا اور وہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے نئی راہیں تلاش کرتا" ملاقاتوں کے اس سلسلہ میں ایک اور طالب علم لیڈر جاوید حبیب سے بھی ملا بظاہر وہ بھی ایکٹ سے بے چین اور مضطرب ہیں، وہ بھی اس کے جوں کے توں نفاذ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور جب وہ اپنے مخصوص انداز میں ایکٹ پر رک رک کر بحث کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اس ایکٹ کے ذریعہ جمہوری قدروں کو تباہ کر دیا گیا ہے تو ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن انہیں امید ہے کہ ایکٹ کے مخالفوں کا حلقہ وسیع ہونے کے ساتھ ہی حکومت اس میں مزید ترامیم کر کے اسے قابل قبول بنانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

لوگوں سے ملاقاتیں کرتا ہوا میں حافظ سعید احمد خان آف چھتاری کی کوٹھی پر پہنچا۔ موصوف تھوڑی دیر بعد ہی دہلی جا رہے تھے، ان کے صاحبزادہ ابن میاں نے ہم لوگوں سے دل کھول کر باتیں کیں لیکن ان کا بھی یہ اصرار تھا کہ سب باتیں صیغۂ راز میں رہیں۔ "آف دی ریکارڈ" باتوں کو یہاں قلم بند کردوں تو عہد شکنی ہوگی۔ لیکن اتنا ضرور کہونگا کہ وہ بھی ایکٹ سے مطمئن نہیں نظر آرہے تھے خاص طور پر کورٹ میں معطیان کی نمائندگی ختم کیے جانے کی وجہ سے وہ خوش نہیں تھے۔ ان سے تقریباً نصف گھنٹہ کی ملاقات بڑی دلچسپ رہی، موصوف نے ہماری درخواست پر صرف زیارت کے لیے نواب صاحب چھتاری کو باہر آنے کی زحمت دی۔

مسلم یونیورسٹی کا پہلا گریجویٹ

ایشوری پرساد یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ تھے۔ اور جے، سی، چکرورتی، پنڈت وشنو شنکر کا شمار یونیورسٹی کے پہلے ممتاز ترین استادوں میں ہوتا تھا۔

نواب صاحب چھتاری کی عمر اب تقریباً ۸۴ سال ہے۔ ان کی روایتی مونچھیں سفید ہو چکی ہیں لیکن سر کے بال ابھی تک سیاہی مائل ہیں، قوت بصارت پر زیادہ آنچ نہیں آئی ہے لیکن سماعت کی قوت کافی متاثر ہو چکی ہے۔

علی گڑھ کالج اولڈ بوائز کے بانی
مولانا محمد علی جوہر

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی ؒ علیگ

وہ یونیورسٹی کے موجودہ چانسلر ہیں لیکن چانسلر کا عہدہ "صرف نمائشی" ہے اس لیے یونیورسٹی کے نظم و نسق میں اب ان کا کوئی دخل نہیں رہ گیا ہے، ہاں کسی زمانہ میں یونیورسٹی کے ہر شعبہ میں ان کی بات سنی جاتی تھی اور اس پر عمل بھی ہوتا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ اب انہوں نے خاموشی کی راہ اختیار کرلی ہے اور اس اصول پر عمل کرنے لگے ہیں کہ ایک خموشی ہزار بلائیں ٹالتی ہے لیکن ان کی یہ خاموشی میرے لیے سوہان روح بن گئی ـــــ اگر کوئی سرکاری افسر موقع پرست انسان، ترقی اور خطابات کا خواہاں اپنی ملت پر آنے والی تباہی کو دیکھکر خاموش رہے تو اس کی خاموشی قابل فہم ہوگی لیکن نواب صاحب چھتاری کیطرح کا انسان جس نے اپنے خون اور پسینہ سے مسلم یونیورسٹی کی تعمیر میں حصہ لیا ہے جسنے گزشتہ پچاس برسوں میں ہر موڑ پر اپنی رائے کا اظہار بے باکانہ کیا ہے اس کی خاموشی کھٹکتی ہے اور کھٹکے گی کیونکہ انکے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ؎

ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اور چندروزہ زندگی کے سکون کے لیے خموشی کو رہنما بنانا نہ ان کے لیے مفید ہوگا نہ ملت کے لیے ـــ ان سے مل کر میں سوچنے لگا کہ مستقبل کا مورخ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی پر ۱۹۷۲ء کے ایکٹ کی شکل میں گرنے والی بجلی کی تباہ کاریاں قلم بند کرے گا تو وہ یہ بھی لکھے گا کہ نواب صاحب چھتاری زندہ تھے لیکن انہوں نے اس ایکٹ

مولانا ظفر علی خاں علیگ مرحوم

کی اچھائی یا برائی میں ایک لفظ بھی نہ کہا ۔۔۔۔ اور آئندہ کی نسلیں ان کے اس سکوت کو طرح طرح کے معنی پہنائیں گی ۔۔۔۔ نواب صاحب سے مل کر تشنگی اور بڑھ گئی ۔۔۔۔ جس پیاس کو بجھانے کے لیے میں علی گڑھ آیا تھا اس کی شدت نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ اب میری پیاس کون بجھائے گا، پانی موجود ہے لیکن کوئی نہیں پلاتا ۔۔۔۔ افسوس ملت اور سربراہانِ ملت پر یہ وقت آگیا ہے کہ ان کے لبوں پر مصلحتوں کی مہریں ثبت ہو گئی ہیں ان کی آنکھوں میں آنسو ہیں، ان کے دل رو رہے ہیں، اور ان کے سینوں میں اضطراب کا بحر بے کراں لہریں مار رہا ہے لیکن وہ خاموش ہیں ۔۔۔۔ اور اپنے

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں علیگ

اضطراب کو ظاہر نہیں کرتے، کیا وہ ہمیشہ خاموش رہیں گے؟ یہ سوال لے کر میں نواب صاحب سے رخصت ہوا۔ اور خود کو مولانا آزاد لائبریری کی وسعتوں میں گم کر دیا۔

لائبریری میں میں نے اپنا زیادہ وقت سرسید روم اور وقار الملک لائبریری میں گزارا۔ سرسید روم کے نگراں فرخ جلالی سے ملاقات نہ ہو سکی لیکن ان کی عدم موجودگی میں چارٹوں، نقشوں، تصاویر اور سرسید مرحوم کی میز، کرسی اور صوفہ سیٹ نے مسلم یونیورسٹی کی پوری تاریخ بیان کر دی۔ وقار الملک کی لائبریری کی سیاہ پردوں میں لپٹی ہوئی الماریاں ماحول کو سوگوار بنائے ہوئے تھیں۔ جب لائبریری کے نگراں نے ان پردوں کو ہٹایا تو شیشہ کی تابوت نما الماریوں میں علم و فن کی ان گنت نعشیں بکھری

ڈاکٹر سر محمد اقبال علیگ مرحوم

کالج کی طرف روانہ ہو گیا اور میڈیکل کالج کے مختلف شعبوں کو دیکھتا ہوا اسٹریچی ہال واپس آ گیا ـــــ اسٹریچی ہال سے ملحقہ مسجد نے مجھے صدا دی "اللہ اکبر اللہ اکبر" نماز جمعہ کا وقت تھا، ہزاروں طلباء مسجد پہنچ چکے تھے، نماز سے پہلے میں نے سرسید احمد کی قبر پر حاضری دی، جن کے پہلو میں ان کے بائیں جانب ان کے بڑے صاحبزادے سید محمود اور دائیں جانب ان کے رفیق محسن الملک کی قبریں ہیں،

راس مسعود، اور ڈاکٹر ضیاالدین بھی سرسید کے پہلو ہی میں ابدی نیند سو رہے ہیں، محمود منزل کے ان باسیوں پر ہر وقت رحمت باری کی بارش ہوتی رہتی ہے میں چاہتا تھا کہ جو پیاس اب تک کسی سے نہ بجھ سکی تھی وہ یہاں بجھاؤں، جن سوالوں کا جواب اب تک کسی نے نہ دیا تھا وہ ان سے پوچھوں ـــــ اور ان سے کہوں کہ جس قوم کو آپ نے اپنی کوششوں سے سربلندی عطا فرمائی تھی وہ پھر ڈوب رہی ہے، اور تنکوں کا سہارا بھی نہیں مل پا رہا ہے۔ گھر کے چراغ گھر کے تیل ہی سے گھروں کو آگ لگا رہے ہیں اب ملت کیا کرے؟ پوری قوم خاموشی سے ڈوب رہی ہے کیونکہ بولے تو زبان کٹتی ہے۔ بس آپ کے علی گڑھ میں کردار کے غازیوں کی جستجو میں آیا تھا لیکن یہاں تو گفتار کے بھی غازی نہیں ملے ـــــ!

میں بڑی دیر تک سرسید احمد خاں کی قبر کے سامنے کھڑا رہا ـــــ ۱۸۵۷ء کی خونریزی کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ ماضی کی تاریخ کے اوراق وقت کی تیز ہواؤں سے اڑنے لگے۔ بہادر شاہ کی جلاوطنی، درختوں سے لٹکتی ہوئی شاہزادوں کی نعشیں، شاہزادیوں کے پاؤں کے چھالے اور ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور محتاجی کے مرقع آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے ـــــ پھر مسلمانوں کی عظمت کے ملبہ سے
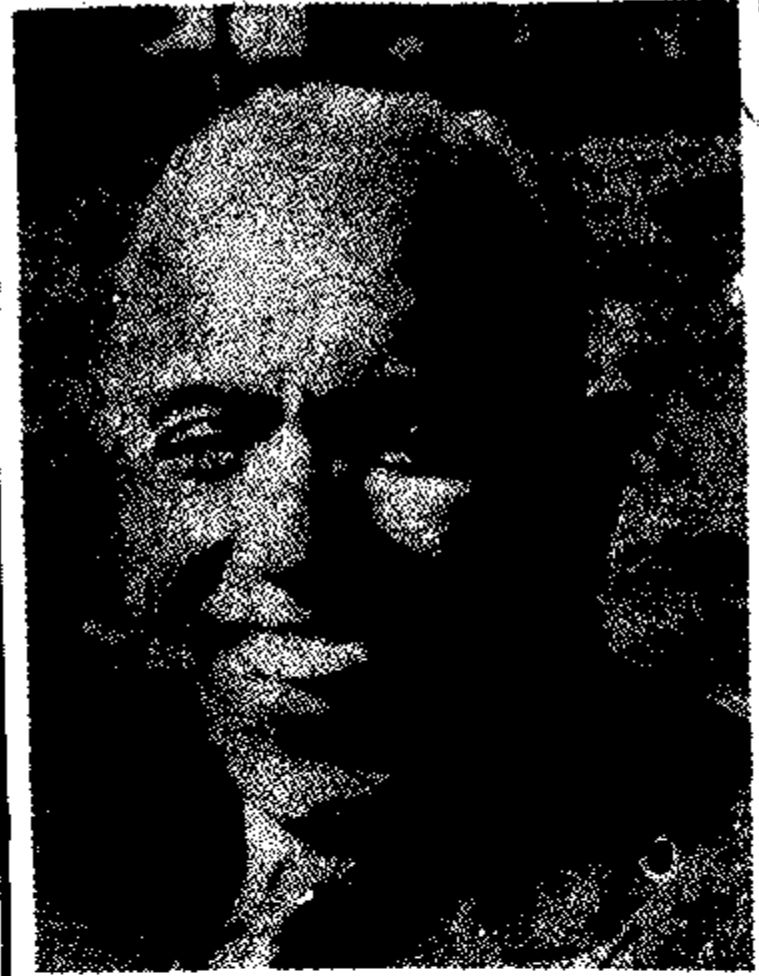
ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیت
شیخ محمد عبداللہ علیگ

ہوتی نظر آئیں ـــــ یہ کرتے پر لکھا ہوا قرآن شریف ہے، یہ حضرت علیؓ کے ہاتھ سے لکھا ہوا قرآن کا نسخہ ہے، یہ اورنگ زیب عالمگیر کی تحریر میں قرآن کا نسخہ ہے، یہ ناریل کے پتوں پر لکھی ہوئی ایک قدیم کتاب ہے، قدیم مخطوطات کے اس قبرستان میں گیتا، رامائن، قرآن مجید صدیوں پرانے طغرے، مثنویاں اور فرمان دفن ہیں ـــــ یہ انمول، ادبی خزانہ آزاد ہندوستان میں شاید اب کسی کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکے گا۔ کیونکہ اب علم دفن کے سانچے بدل چکے ہیں اور علم و ادب کے اس گہوارہ کی بنیادوں کو کچھ اس طرح بدلنے کی کوششیں ہو رہی ہیں کہ آنے والے زمانہ میں چند "سرپھروں" کے علاوہ ان کا کوئی اور قدر دان نہ رہ جائے گا۔

علم دفن کے اس قبرستان سے نکل کر میں میڈیکل

ایک دیوانہ اٹھا۔ یہ تھا سید احمد خاں اور اب میں عالم تصور میں سید احمد خاں سے مخاطب تھا ــــــ "سید صاحب غدر کے بعد آپ کے احساسات کیا تھے؟" اور مجھے جواب ملا "غدر کے بعد مجھکو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال واسباب کے تلف ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ میں نے قومی بہتری کے دو اصول مستحکم طور پر قائم کر لیے ایک تعلیم دوسرا انگریزوں سے اصلی اتحاد اور دوستی ۱۸۵۸ء میں ایک اسکول مرادآباد میں قائم کیا جہاں اس زمانے میں کسی قسم کے اسکول کا وجود نہ تھا، پھر میں غازی پور گیا جہاں میں نے ایک اسکول قائم کرنے کی بنیاد ڈالی جس میں اردو انگریزی عربی، فارسی پڑھائی جادے۔ ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اسی زمانہ میں گورنمنٹ نے اضلاع شمال ومغرب کے طالب علموں میں سے سید محمود کو لندن میں جاکر تعلیم پانے کو منتخب کیا۔ مجھے موقع ملا کہ میں بھی لندن جاؤں اور تعلیم وتربیت کے ان طریقوں سے واقف ہوں جن طریقوں سے انگلش قوم نے ایسے اعلیٰ درجہ کی ترقی پائی میں وہاں گیا، وہاں رہا اور جو دیکھا سو دیکھا ــــــ اور جو سوچا وہ سوچا ــــــ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا رائے ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو، دور دراز کا سفر اختیار کیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں۔ جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوب صورت شخص کو دیکھا مجھکو ہمیشہ اپنی ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت

ڈاکٹر سید محمود مرحوم، جنہیں علی گڑھ میں تعلیم کے دوران لڑکے "محمود قوم" کے نام سے پکارتے تھے

رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ مگر اپنی قوم کو دین ودنیا دونوں کے اعتبار سے ایسے پست وتاریک گڑھے میں گرا ہوا پایا جس سے نکلنا محال معلوم ہو رہا تھا۔ مگر ہمت نہیں ہاری!"

"مدرسہ قائم کرنے کا خیال آپ کے دل میں کب پیدا ہوا؟" میں نے دوسرا سوال کیا اور جواب ملا ــــــ "لندن ہی میں میں نے مدرسہ کے قائم کرنے کی اور تعلیم کی تمام تجویزوں کو پورا کیا جہاں تک کہ جس نقشہ پر آپ اس کالج (جو اب یونیورسٹی ہے) کی عمارتوں کو بنتا ہوا دیکھتے ہیں یہ بھی لندن ہی میں قرار پا چکا تھا۔ لندن ہی میں اس کام کو جو نہایت اہم تھا شروع کرنے کے تین طریقے قرار دیئے ہندوستان میں پہنچ کر ان کے مطابق میں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ دوسری تجویز کے مطابق ایک کمیٹی قائم

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں اکیڈمک جلوس کا ایک منظر

ہوئی اور کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" اس کا نام رکھا۔ ۱۸۷۲ء میں چندہ جمع کرنے کے لیے بمقام بنارس ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کا نام محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی رکھا گیا۔ دسویں جنوری ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں کمیٹی نے متعدد تجویزیں منظور کیں (۱) علی گڈھ میں جو زمین پرانی چھاؤنی فوج کی بے کار پڑی ہے تعمیر مدرسہ کے لیے گورنمنٹ سے لی جاوے (۲) سکریٹری کو اجازت دی گئی کہ اگر زمین مل جائے تو اس میں تعمیر مدرسہ کا خرچ نہ ہو بلکہ اس کی آمدنی یا چندہ خالص تعمیر کا صرف کیا جاوے۔

۱۹ر مارچ ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں سکریٹری نے اطلاع دی کہ گورنمنٹ نے اس زمین کے دینے کا وعدہ کرلیا ہے۔ ۲ر مئی ۱۸۷۵ء کے اجلاس میں اس کمیٹی نے جو بنارس میں تھی، تاریخ افتتاح مدرسہ ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء روز سالگرہ ملکہ معظمہ قرار دی چنانچہ میں خود اور بعض ممبران اس تاریخ پر علی گڈھ میں آئے اور مدرسہ کھولا اسی وقت میں نے پنشن لینے کا قصد کیا اور اواسط ۱۸۷۶ء میں علیگڈھ میں آگیا اس وقت طالب علموں کی تعداد قلیل تھی اور کوئی بورڈنگ ہاؤس نہ تھا مگر رفتہ رفتہ ہر ایک چیز میں ترقی ہوتی گئی۔ اسکول جو ۱۸۷۵ء میں انٹرنس تک پڑھائی کے لیے کھولا گیا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں ایف اے کی پڑھائی تک اور ۱۸۸۱ء میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کی پڑھائی تک ترقی کر گیا۔" اسکول کی بنیاد کا مختصر حال سننے کے بعد میں نے سرسید کی روح سے پوچھا "آپ کی زندگی میں مسلم یونیورسٹی کا خواب پورا نہ ہو سکا لیکن بعد میں آپ کے اس خواب کو آپکے رفقاء نے پورا کر دکھایا لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ کے ذہن میں مسلم یونیورسٹی کی مذہبی حیثیت کیا تھی ——— "

تھوڑے سکوت کے بعد تصورات کی دنیا میں ایک آواز گونجی ——— "مدرسۃ العلوم کے طلبا کے دائیں ہاتھ میں فلسفہ ہوگا اور بائیں ہاتھ میں نیچرل سائنس اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر"۔ اس جواب نے سارے بدن کو جھنجھوڑ دیا اور میں نے آخری سوال کر کے رخصت ہونے کا ارادہ کیا میں نے پوچھا "مسلم یونیورسٹی کے مستقبل کے متعلق آپ کا کیا خیال تھا"؟ اور مجھے جواب ملا ——— "میں اپنے دوستوں کو کئی مرتبہ بطور وصیت کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد مدرستہ العلوم کا جو حال ہو سو ہو مگر ایسا نہ کرنا کہ قوم کے ہاتھ سے نکلکر اور لوگوں کے قبضہ میں چلا جائے، بری طرح یا بھلی طرح ہماری قوم ہی اس کی چلانے والی ہو"۔ میں عقیدت سے سر جھکا کر واپس ہونے کیلئے مڑا مگر میرے ذہن میں ایک اور آواز گونجی یہ آواز تھی سید محمود مرحوم کی میں ٹھٹھک کر رک گیا اور بغور اسی آواز کو سننے لگا ——— "بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگران حال رہے اور کسی قسم کی مداخلت گورنمنٹ کی اس دار العلوم میں نہ ہونی چاہیے"۔ اسی کے ساتھ ایک اور آواز بلند ہوئی ——— "ہماری یونیورسٹی مثل مسلمانوں کی پرانی یونیورسٹیوں کے شاہنشاہ وقت کی طرف سے نہ ہوگی بلکہ وہ ایک قومی درس گاہ ہوگی، قوم کی ضروریات کے مطابق قوم کی طرف سے ہوگی"۔ اسکے ساتھ ہی ایک اور آواز گونجی، "اللہ اکبر اللہ اکبر ———" اس آواز نے سارے جسم میں بجلی کی ایک رو سی دوڑا دی اور میں آنکھوں سے آنسوؤں کو صاف کرتا ہوا نماز جمعہ کے لیے مسجد کے صحن میں آگیا۔ ★

بدرالدین طیب جی

سابق سفیر ہند، سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی

بنارس ہندو یونیورسٹی اور علیگڈھ مسلم یونیورسٹی جیسے قومی اداروں کا وجود (جنہیں حکومت امداد دینے کا فیصلہ کرے)، ہمارے سیکولرازم کو معنیٰ اور مقصد عطا کرنے کی اولین شرط ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہاؤس کی ایک یادگار تصویر جس میں آپ سابق وائس چانسلر بدرالدین طیب جی اور انکے خاندان کے افراد کو بھی دیکھ سکتے ہیں

یہ ہیں سرسید

(صابر علی)
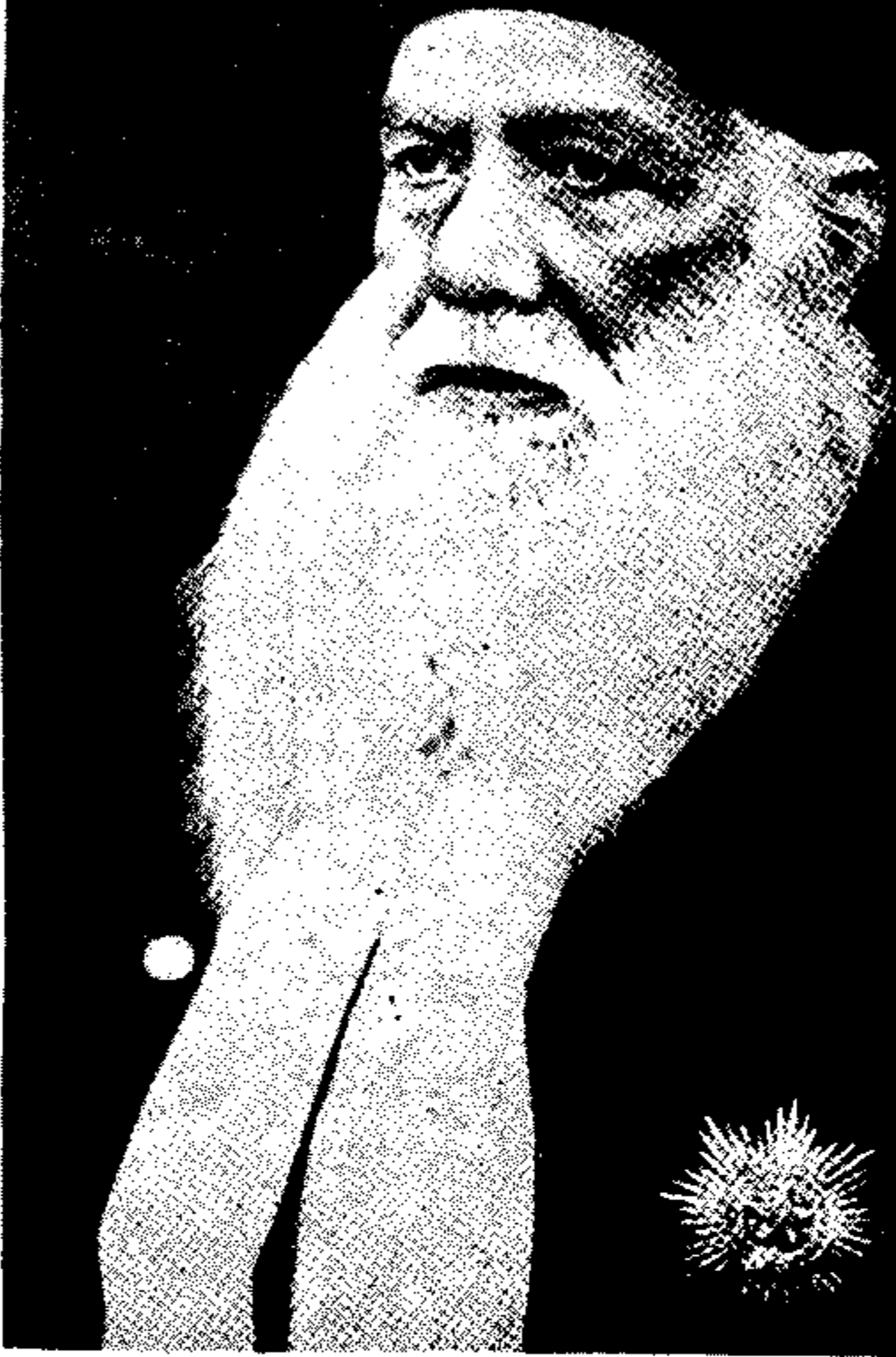
سید احمد خاں ۵ رذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد عرب سے پہلے ہرات میں اور پھر وہاں سے اکبر اعظم کے زمانے میں ہندوستان آکر آباد ہو گئے۔ سید احمد خاں کے دادا، سید ہادی شاہ عالم کے دربار کے امراء میں شامل تھے۔ سید احمد خاں کے والد سید متقی کا بھی دربار شاہی میں بڑا رسوخ تھا۔ اکبر شاہ ثانی ان کو "بھائی متقی" کہہ کر پکارتے تھے۔ بادشاہ کو ان پر اتنا

اعتماد تھا کہ انھوں نے ان کو وزارت کی پیش کش کی مگر سید متقی نے معذرت کرتے ہوئے اپنے بجائے سید احمد کے نانا خواجہ فرید الدین کا نام پیش کر دیا۔

سید احمد خاں کی والدہ عزیز النسا بیگم خواجہ فرید کی سب سے بڑی بیٹی تھیں، وہ صرف قرآن مجید اور فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں لیکن بچوں کی تربیت میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی کردار نے سید احمد خاں کی زندگی اور انداز فکر پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ایک مرتبہ سید احمد خاں نے کسی

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر مرحوم جن کے دربار سے سر سید علیہ الرحمۃ کو "جواد الدولہ عارف جنگ" کا خطاب ملا تھا

یونیورسٹی کا پہلا سپاسنامہ

پہلا سپاسنامہ مہاراجا پٹیالہ کو پیش کیا گیا۔
مہاراجا بنارس، مہاراجا پٹیالہ اور راجا جے کشن داس نے یونیورسٹی کو بڑے بڑے عطیے دیئے تھے۔

ملازم کے تھپڑ مار دیا، اس پر ان کی والدہ نے فوراً ان کو گھر سے باہر کر دیا اور تین دن کے بعد اس شرط پر واپسی کی اجازت دی کہ ملازم سے معافی مانگیں۔

۱۸۳۸ء میں والد کے انتقال کے بعد سید احمد خاں کو معاش کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر کچھ کم بائیس سال کی تھی۔ سلطنت کی زبوں حالی ان کے پیش نظر تھی اس لئے انھوں نے یہی مناسب خیال کیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کر لی جائے۔ سب سے پہلے سید احمد خاں نے عدالت میں کام کیا ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اس زمانے میں دلی میں صدر امین تھے۔ سید احمد خاں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کو اپنی کچہری میں پریکٹس کی اجازت دے دیں۔۔۔ انھوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ اور پھر کام سیکھنے کے بعد ان کو کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ ابھی سید احمد خاں نے بہت تھوڑے ہی دنوں کام کیا تھا کہ مسٹر سر رابرٹ دلی میں جج ہو کر آئے۔ سید احمد خاں کو وہ پہلے سے پہچانتے تھے۔ اس لئے یہ جب ان سے ملنے کو گئے اور ان سے نوکری کی درخواست کی تو انھوں نے ان کو عدالت میں سیشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا لیکن جب سید احمد خاں نے اس کام کو مشکل جان کر انکار کر دیا تو کمشنری کے دفتر میں ان کو نائب منشی کا عہدہ تفویض کر دیا گیا۔

اس کے بعد دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کی منصفی خالی ہوئی اور وہ ۲۴ دسمبر کو مین پوری کے منصف مقرر ہو گئے۔ مگر ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء کو وہاں سے تبدیل ہو کر فتحپور سیکری آ گئے۔ سید احمد خاں یہاں چار سال تک منصف رہے۔

۱۸۴۶ء میں جب وہ مین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور سیکری آئے تو چند روز کے لئے دلی بھی آئے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ان کے دادا کا خطاب ان کو ملنا چاہئے۔ بادشاہ نے منظور کر لیا، لیکن سید احمد خاں کے دادا کا خطاب صرف جواد الدولہ تھا اور یہی خطاب احسن اللہ خاں نے لکھ کر پیش بھی کیا تھا، لیکن بادشاہ نے اس میں عارف جنگ کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا۔ اس طرح آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دربار سے۔۔۔۔ جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ کا خطاب انھیں ملا۔

سید احمد خاں کو لکھنے پڑھنے کا شوق ابتداء ہی سے تھا۔ "آثار الصنادید" ان کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اپنی دلی کی منصفی کے زمانے میں لکھی تھی، جس میں دلی کی تاریخی عمارتوں کا حال تحریر کیا ہے۔ یہ کام انھوں نے جس محنت اور جانفشانی سے کیا اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ قطب مینار کے اکثر کتبوں کو پڑھنے کے لئے انھوں نے

پارٹھ تک بند ھوائے۔ اس کتاب کا ترجمہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے انگریزی میں کیا اور سید احمد خاں کو سوسائٹی کا آنریری فیلو بھی مقرر کیا۔ ۱۸۶۱ء میں اس کتاب کا فرانسیسی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن بڑے اہتمام سے دلی اور کراچی سے شائع .... ہو چکے ہیں۔

جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہوئی تو سید احمد خاں اس وقت بجنور میں تھے۔ وہاں انھوں نے قریباً بیس انگریزوں کی جان بچائی۔ بغاوت کے دوران میں ان کو ضلع بجنور کا انتظام بھی سپرد کیا گیا تھا۔ انھوں نے امن و امان قائم کرنے کی ہر چند کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ بالآخر خود بھی بھاگ کر میرٹھ پہنچے وہاں ان مصیبتوں کا حال سن کر جو اُن کے خاندان پر پڑی تھی دہلی گئے۔ ان کے سارے قریبی رشتہ دار مارے جا چکے تھے۔ خود ان کی والدہ اصطبل میں روپوش تھیں۔ ان کو کئی دن تک پینے کو پانی نہ ملا۔ سید احمد خاں ان کو میرٹھ لائے۔ مگر وہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکیں اور چند ہفتوں میں رحلت فرما گئیں۔ اس وقت سید احمد خاں کی عمر ۴۰ سال تھی۔

بغاوت کے بعد سید احمد خاں کو خیر خواہی کے صلے میں حکومت نے ایک بہت بڑا تعلقہ دینا چاہا جس کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ سے اوپر تھی مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔ انگریزوں کی طرف سے عام ہندوستانیوں خصوصیت سے مسلمانوں پر جو ستم ڈھائے گئے تھے ان کا سید احمد خاں پر بڑا گہرا اثر پڑا وہ خود کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے میں قبل از وقت

مزار مبارک سرسید علیہ الرحمۃ

بوڑھا ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کی اس بغاوت کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات میں اور تیزی آگئی۔ انھوں نے انگریزی تعلیم کی شدت سے مخالفت شروع کر دی۔ سید احمد خاں جو کہ حالات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سب سے پہلے انگریزوں کو مسلمانوں سے جو بدگمانی ہے اس کو دور کرنا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف ترغیب بھی دی جائے تاکہ اُن پر علم کے دروازے وا ہو سکیں، جن توہمات میں وہ اسیر ہیں اس سے رہائی پائیں

بال کرشن گوکھلے

گوکھلے جب ۱۹۰۵ء میں ایم اے او کالج آئے تو طلباء نے ان کا اتنا پرجوش استقبال کیا کہ ان کی گاڑی اسٹیشن سے خود کھینچ کر لائے۔ گوکھلے نے یہ منظر اور یہاں کے لڑکوں کا قومی جذبہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب میں ایک مسرور آدمی کی طرح مروں گا۔ کیونکہ مجھے اطمینان ہوگیا کہ میرے ملک کی آزادی یقینی ہے۔" (۵ فروری ۱۹۰۵ء)

اور نکبت و افلاس دور ہوکر ان کی معاشی حالت بہتر ہو جائے۔

چناں چہ رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کی تحریر کا یہی مقصد تھا۔ اس میں یہ ظاہر کیا کہ بغاوت کی ذمہ داری ہندستانیوں پر نہیں بلکہ خود انگریز ذمہ دار رہے ہیں۔ انگریز ہندستانیوں سے خود کو اتنا دور رکھتے تھے کہ ہندستانیوں کے مسائل سمجھنے کا ان کو موقع ہی نہ ملتا تھا۔ اور جب بھی رعایا اور حکومت کے درمیان خلیج پیدا ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ بغاوت ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

جب اس رسالے کا ترجمہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو ایک محشر بپا ہوگیا۔ سکریٹری امور خارجہ سیسل بیڈن نے مطالبہ کیا کہ حکومت کو غلط کار کہنے والے باغی کو گرفتار کیا جائے۔ لیکن پارلیمنٹ نے اس کو منظور نہیں کیا۔ ایسے حالات میں جب کہ ذرا سے شبہ میں پھانسی کی سزا دینی ایک عام بات تھی۔ یہ سید احمد خاں جیسے ہی جری اور حق گو کا کام تھا کہ بغاوت کے متعلق حکومت کو مورد الزام بنائے۔

سید احمد خاں کی بیوی کا انتقال ۱۸۶۱ء میں مراد آباد میں ہوا جنھوں نے دو بیٹے سید حامد، سید محمود اور ایک صغیر سن بیٹی امتہ العزیز چھوڑی تھی۔ اس وقت سید احمد خاں کی عمر ۴۴ سال اور قوائے جسمانی نہایت عمدہ تھے۔ ان کے احباب نے اصرار کیا کہ دوسری شادی کر لیجیے لیکن انھوں نے شادی نہیں کی اور اپنی بقیہ زندگی کو قومی خدمات کے لئے وقف کر دیا۔

سید احمد خاں نے اس وقت مسلمانوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کی نفرت کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں تھی۔ لیکن بغاوت کے بعد تو ان کی یہ نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس نفرت کو دور کرنے میں بڑی مشکلات حائل تھیں مگر سید احمد خاں نے تمام مشکلات اور دشواریوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ان کے پائے ثبات کو کوئی لغزش نہیں آئی۔

۱۸۶۴ء تک سید احمد خاں غازی پور میں تعینات تھے وہاں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس کا کام انگریزی علوم کی کتابوں کا اردو میں منتقل کرنا تھا۔ وہیں انھوں نے ایک مدرسہ بھی کھولا جو بعد کو وکٹوریہ ہائی اسکول کہلایا۔ سن مذکور میں ہی سید احمد خاں غازی پور سے تبدیل ہوکر علی گڑھ آ گئے۔ اور پھر وہاں آکر انھوں نے ہندوستان کے واسطے، مسلمانوں کے واسطے اور علی گڑھ کے واسطے جو کچھ کیا اسے میں یہاں نہیں بیان کروں گا۔ کیوں کہ اس سے آپ اور ہم سب واقف ہیں۔

بیگ کمیٹی کی سفارشات کا خلاصہ

(ماخوذ)
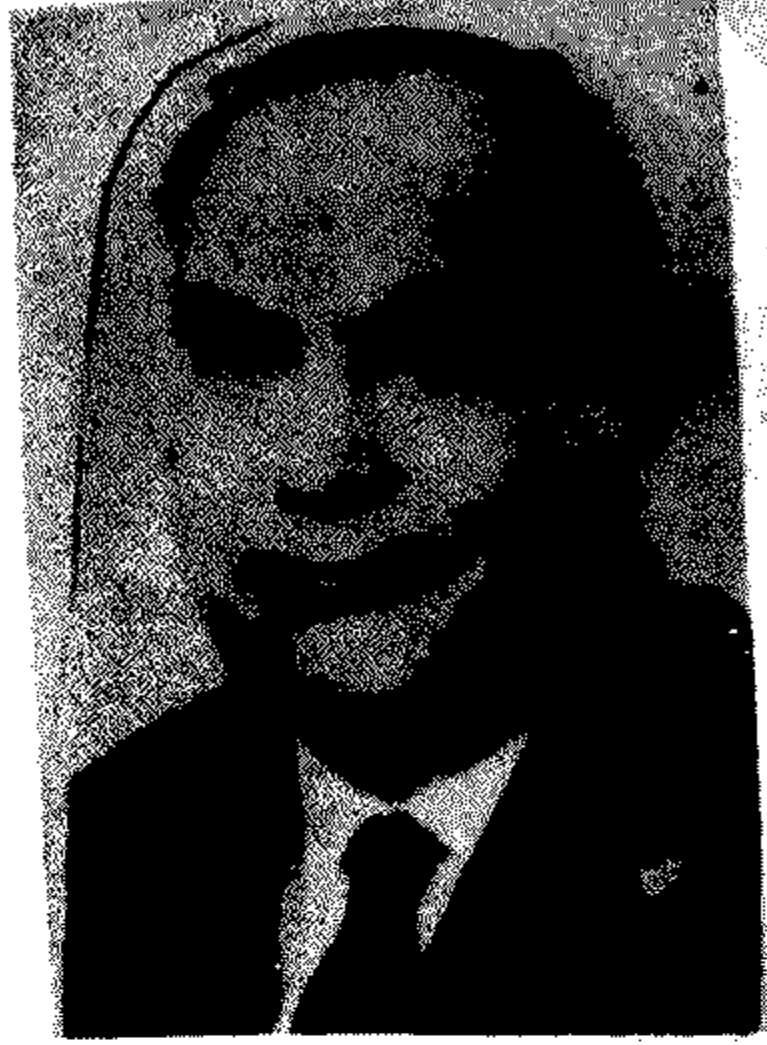
وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے مرکزی وزیر جناب فخرالدین صاحب کو اس سلسلے میں مجاز کر دیا اور انہوں نے پورے مسئلے پر غور کرنے کے لئے علی ظہیر، ہمایوں کبیر، سید دین عبیدالرحمٰن خاں شیروانی، جسٹس خلیل احمد، جسٹس بشیر احمد، پروفیسر ایم۔ ایم بیگ اور ظفر احمد صدیقی صاحبان پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی۔ کمیٹی نے ستمبر ۶۸ء میں اپنی سفارشات مسلم وزیر کو پیش کر دیں۔

اس فخرالدین کمیٹی جسے بیگ کمیٹی بھی کہتے ہیں کی سفارشات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) ۱۹۵۱ء کے ایکٹ میں کم سے کم مداخلت کی جائے صرف ایسی ترمیمات کی جائیں جن کا کیا جانا اشد ضروری ہے یکساں قانون بنانے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ یونیورسٹی کی اصل حقیقت اس کا مخصوص کردار ہے۔

(۲) ایکٹ کی دفعہ ۱ میں حسب ذیل ضمنی دفعہ بڑھائی جائے۔

باوجود کسی عدالتی فیصلہ، ڈگری یا آرڈر کے علی گڑھ

مرکزی وزیر فخرالدین علی احمد

مسلم یونیورسٹی مسلمان اقلیت کی قائم کردہ سمجھی جائے گی، اور اس کا نظم و نسق دستور کی آرٹیکل ۲۹، ۳۰ کے مطابق ہوگا۔

(مندرجہ بالا سفارش، رپورٹ کی روح کی حیثیت رکھتی ہے سپریم کورٹ کے فیصلہ اور ۱۹۶۵ء کے بعد سے مرکزی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اقامتی ہالوں کے پرووسٹ

برائے سال ۷۲-۱۹۷۱ء

ڈاکٹر منیر احمد، سرسید ہال، مسز حمید الہاشمی
آفتاب ہال۔ پروفیسر مسعود حسن سلیمان ہال۔ ڈاکٹر
ایس آفتاب زیدی، وقار الملک ہال۔ ڈاکٹر
کمال الدین محسن الملک ہال۔ ڈاکٹر مسز رضیہ خان
عبداللہ ہال۔ مسز سکینہ حسن، سروجنی نائیڈو ہال۔
ڈاکٹر ایس کے جوہری، ہادی حسن ہال۔ ڈاکٹر حبیب
رسول، راس مسعود ہال۔ پروفیسر عبدالماجد صدیقی،
محمد حبیب ہال۔ ڈاکٹر ہرش رائے زادہ این آر
ایس سی۔

حکومت کے طرز عمل نے مسلم یونیورسٹی کے حقیقی کردار کے بارے میں شکوک پیدا کر دیئے ہیں۔ ان کے پیش نظر یونیورسٹی ایکٹ میں اس کی وضاحت ضروری ہوگئی۔ اس قسم کی وضاحت کوئی نئی بات نہیں۔ ہائی کورٹ کے فیصلوں کے بعد مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے بار بار اصل قانون میں اس قسم کی دفعہ کا اضافہ کیا ہے۔)

(۳) کمیٹی نے تیسری اہم سفارش دفعہ ۱۲ الف کے سلسلہ میں کی تھی۔ مجوزہ بل میں یونیورسٹی کو اختیار دیا گیا تھا کہ ۱۵ میل کے اندر کالجوں یا تعلیمی اداروں کا الحاق کر سکتی ہے یا انہیں یونیورسٹی کے مراعات کا مستحق قرار دے سکتی ہے۔
کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ دفعہ ۱۲ الف منسوخ کر دی جائے۔ اس سے یونیورسٹی کا تعلیمی و اقامتی کردار ختم ہو جائیگا۔

(۴) مجوزہ بل میں وزیٹر کے اختیارات میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا گیا تھا کمیٹی نے ان کو کم کرنے کی سفارش کی تھی وائس چانسلر کی تقرری کے سلسلے میں بھی کمیٹی نے مثبت سفارشات کی تھیں۔

(۵) دفعہ ۸ کی رو سے یونیورسٹی کے عہدیداران، وائس چانسلر، چانسلر وغیرہ۔ کسی بھی فرقہ کے ہو سکتے ہیں۔ کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے پیش نظر یہ صحیح نہیں ہے۔ یونیورسٹی کے عہدے داران مسلمان ہی ہونے چاہئیں۔

(۶) مسلم یونیورسٹی کورٹ کی تشکیل کے بارے میں کمیٹی نے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر اس پر اصرار نہیں کیا تھا کہ کوئی غیر مسلم کورٹ کا ممبر نہ ہو۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کی نمائندگی کو بھی مان لیا تھا مگر کمیٹی نے یونیورسٹی کورٹ کی تشکیل کے سلسلے میں جو تجویز پیش کی تھی اس میں اس بات کو ملحوظ رکھا تھا کہ ہر حال میں یونیورسٹی کورٹ میں غلبہ مسلمانوں کے نمائندوں کا رہے۔ یونیورسٹی کورٹ کی تشکیل کے سلسلے میں کمیٹی نے علاوہ دیگر چیزوں کے حسب ذیل سفارشات کی تھیں:

(الف) رجسٹرڈ گریجویٹس کے ۱۵ نمائندے۔
(ب) اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ۲۵ نمائندے۔
(ج) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تین نمائندے یونیورسٹی کورٹ میں لئے جائیں۔
(د) اس کے علاوہ کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ریاستی مجالس قانون ساز کے ۱۶ نمائندے لئے جائیں۔ جن کو مسلمان ممبران اپنے میں سے منتخب کریں۔ اس کے لئے پورے ملک کو چار منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر منطقہ کے چار ممبر ہوں۔ پانچ ممبران پارلیمنٹ جنہیں مسلمان ممبران پارلیمنٹ اپنے میں سے منتخب کریں۔ لئے جائیں۔
کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ایگزیکیوٹیو کورٹ کے منتخب کردہ اراکین ۸۰ ہونا چاہئیں۔ جو یونیورسٹی کے ملازم نہ ہوں ـــــــ

علیگڈھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۲ء نے اس قانون کی جگہ لی ہے جو ۱۹۶۵ء میں اس یونیورسٹی کے لئے ہنگامی طور پر وضع کیا گیا تھا۔ یہ ایکٹ گجندر گڈکر کمیٹی کی رپورٹ میں شامل ان سفارشات پر مبنی ہے جو اس نے یونیورسٹیوں کے انتظام و انصرام سے متعلق سرکار کو پیش کی ہیں۔ اس ایکٹ میں علی گڑھ یونیورسٹی کو بڑی حد تک خودمختاری دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس ایکٹ میں بڑی لچک موجود ہے۔ سابق ایکٹ کی صرف چند دفعات ہی میں ترمیم کی گئی ہے۔ اس یونیورسٹی کے لئے جو قانون بنایا گیا ہے اس میں زیادہ تر تبدیلیاں ایسی ہیں جن کا تعلق قواعد و ضوابط سے ہے جنہیں کسی قدر تبدیلی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ (پھر بھی اگر کسی وقت یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل یہ محسوس کرتی ہے کہ تعلیمی مفاد یا یونیورسٹی کے مفاد کی خاطر قواعد و ضوابط کی کسی دفعہ کو بدلنا یا کسی نئی دفعہ کا اضافہ کرنا ضروری ہے تو کونسل اپنی تجاویز یونیورسٹی کے وزیٹر یعنی بھارت کے راشٹرپتی کو منظوری کی غرض سے پیش

کرسکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یونیورسٹی کے تعلیمی فروغ کی
خاطر جب کبھی بھی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہوگی تو وہ ایکٹ میں
ترمیم کئے بغیر جس کے لئے کہ پارلیمنٹ کی منظوری کی ضرورت ہے
لائی جا سکتی ہیں۔) آج کے دور میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ
دنیا کے بیشتر حصوں میں تعلیمی رجحانات اور انداز فکر کے جو تقاضے
رونما ہوئے ہیں انہیں کے پیش نظر موجودہ ایکٹ میں لچک پیدا
کی گئی ہے۔ چنانچہ ذیل میں ترمیم شدہ ایکٹ کی چند اہم خصوصیات
بیان کی گئی ہیں۔

تاریخی کردار:۔ اس ایکٹ میں یونیورسٹی کے تاریخی کردار
کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے
مستقبل کی تعمیر کے لئے جدید تعلیمی خیالات و نظریات کو بروئے کار
لایا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے آغاز میں یہ عبارت
شامل ہے "تعلیمی اور اقامتی ادارے کی حیثیت سے علی گڑھ
میں ایک مسلم یونیورسٹی کا قیام ضروری ہے اور سوسائیٹز رجسٹریشن
ایکٹ ۱۸۶۰ء (۱۸۶۰ء کی دفعہ ۲۱) کے تحت رجسٹر شدہ محمڈن
اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن نامی
دونوں ایسوسی ایشنوں کو توڑنا ہے اور مذکورہ یونیورسٹی کو ان
دونوں سوسائٹیوں اور مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے تمام
حقوق اور املاک منتقل کر دینی ہیں۔"

اسی ایکٹ کی دفعہ چار کا تعلق محمڈن اینگلو اورینٹل
کالج علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے توڑنے اور
یونیورسٹی کی تمام املاک کے منتقل کرنے سے ہے۔ ۱۹۲۰ء کے
ایکٹ کے آغاز کی عبارت یا دفعہ چار کو اس نئے ایکٹ میں بالکل
جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں یونیورسٹی کے
قیام سے متعلق جو اغراض و مقاصد پیش کئے گئے تھے انہیں
بدستور باقی رکھا گیا ہے۔

یونیورسٹی کے اختیارات:۔ یونیورسٹی کے قیام کا ایک مقصد
مشرقی علوم اور اسلامیات کو فروغ دینا اور اسلامی دینیات
و مذہبیات کی تعلیم دینا نیز اخلاقی اور جسمانی تربیت دینا ہے جیسا
کہ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے سیکشن ۵ (۲) میں مذکور ہے یونیورسٹی
کا یہ حق بدستور باقی رکھا گیا ہے۔ مزید براں ایک اور کلاز کا اضافہ
کیا گیا ہے جس سے یونیورسٹی کو مذاہب، تہذیب اور بھارت کی
ثقافت کے مطالعوں کو فروغ دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ بات
گجندر گڈکر کمیٹی کی ایک مخصوص سفارش پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں
یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ یونیورسٹی پہلے ہی عربی، فارسی، سنسکرت
یا پراکرت اور پالی ایسی کلاسیکی زبانوں کی تعلیم دیتی ہے۔ اس
یونیورسٹی میں اردو، ہندی اور دیگر جدید بھارتی زبانوں مثلاً
تامل، تیلگو، ملیالم اور بنگالی کی تعلیم پر کافی توجہ دی جا رہی ہے۔
یونیورسٹی ہذا میں تاریخ کا شعبہ اور متعدد دیگر شعبے بھارتی
تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں کی تعلیم دے رہے ہیں
اور وہ اپنی توجہ بالخصوص اس موضوع پر صرف کر رہے ہیں کہ
بھارت کی مشترکہ ثقافت کے فروغ میں مسلمانوں کا کیا حصہ رہا
ہے۔ لہٰذا اگر اس ایکٹ میں مذاہب اور بھارت کی تہذیب و
ثقافت کے مطالعے پر زور دیا گیا ہے تو یہ عین مناسب ہے۔

شعبہ دینیات کے دو حصے ہیں۔ ایک کا تعلق شیعہ دینیات
سے ہے اور دوسرے کا سنی دینیات سے۔ یہ دونوں شعبے بدستور
قائم رہیں گے اور دینیات کی تعلیم اور تحقیق کی خدمت انجام دیتے
رہیں گے۔ شعبہ عمرانیات میں ایک شعبہ اسلامی تعلیمات کا بھی
ہے جس میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کے نصابات پڑھائے
جاتے ہیں۔

یونیورسٹی کے موجودہ اختیارات میں کچھ اور اہم اضافے
درج ذیل ہیں:۔

(۱) یونیورسٹی کی مسجد کے گرد ۲۵ کلومیٹر کے احاطے میں
تحقیق و تعلیم کے لئے خاص مراکز، خصوصی لیبارٹریاں اور دیگر
ایسے یونٹ قائم کرنا جو یونیورسٹی کی رائے میں اس کے مقاصد کی
تکمیل کے لئے ضروری ہوں گے۔

(ب) گجندر گڈکر کمیٹی اور ایجوکیشن کمیشن کی سفارشات کے مطابق تعلیمات کے کسی بھی شعبے کو ایک خود مختار شعبہ قرار دینا۔

(ج) دیگر یونیورسٹیوں، اداروں یا تنظیموں میں کام کرنے والے اساتذہ کو یونیورسٹی میں کسی مقررہ مدت کے لئے بطور استاد مقرر کرنا۔

ان اختیارات سے یونیورسٹی کو اپنی تحقیقی سرگرمیوں اور پروگراموں کو بڑھانے اور طریق تعلیم اور امتحان کے طریقوں میں مزید اصلاح و بہتری لانے میں مدد ملے گی۔

یونیورسٹی کو کچھ اور اضافی اختیارات بھی دیئے گئے ہیں جو عام نوعیت کے ہیں۔ ان کا تعلق یونیورسٹی کے ملازمین میں ڈسپلن کو بڑھانے اور مرکزی سرکار کی منظوری سے یونیورسٹی کے لئے املاک کے حصول وانتظام اور روپیہ ادھار لینے سے ہے۔

یونیورسٹی کا اقامتی کردار ۔ یونیورسٹی کے سابق ایکٹ سیکشن ۱۲ (الف) میں یہ مذکور ہے کہ یونیورسٹی کی مسجد کے ۱۵ میل کے اردگرد واقع کالجوں اور اداروں کو یونیورسٹی اپنے ساتھ ملحق کرسکتی ہے تاہم یونیورسٹی نے اپنے ساتھ کسی کالج کا الحاق نہیں کیا۔ موجودہ ایکٹ میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہے کہ یہ دفعہ نکال دی گئی ہے۔ ایسا گجندر گڈکر کمیٹی کی سفارشات کے مطابق ہی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ تعلیمی اداروں کو وحدانی اور اقامتی کردار کو برقرار رکھنے کا تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بڑی حد تک جواز موجود ہے۔ وحدانی اور اقامتی کردار کی حامل یونیورسٹی میں تعلیمی انداز نظر کا فروغ اور نئے نئے تجربات بڑی آسانی سے ہوسکتے ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ اس طرح سے امتحان کے نظام میں بڑی اصلاح ہوسکے گی اور طلبہ کے کام کا مسلسل جائزہ لیا جاسکے گا۔ وحدانی اور اقامتی طرز زندگی کا فروغ اسی قسم کے اداروں میں ہوسکتا ہے۔

اس سیکشن کے نکال دینے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو یقینی طور پر اعلیٰ تعلیم کے ایک مرکز کی حیثیت سے فروغ دیا جاسکے گا اور یہ ادارہ اس قسم کے غیر صحت مندانہ دباؤ سے محفوظ رہ سکے گا جس کا اکثر غیر اقامتی اور الحاق کرنے کا حق رکھنے والی یونیورسٹیاں شکار ہوجاتی ہیں۔

وزیٹر کے اختیارات ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وزیٹر کے اختیارات کم وبیش وہی ہیں جیسا کہ دیگر مرکزی یونیورسٹیوں میں ہیں۔ البتہ اس ضمن میں دو تبدیلیاں قابلِ ذکر ہیں۔

(ا) وزیٹر کو پہلے یونیورسٹی سے متعلق کسی بھی معاملے کے بارے میں تحقیق کرانے کا اختیار حاصل تھا۔ لیکن اب یہ اختیار محدود کردیا گیا ہے اور اب وزیٹر یونیورسٹی سے متعلق صرف ایسے امور کی تحقیقات کراسکتا ہے جن کا تعلق یونیورسٹی کے انتظامی امور اور مالیات سے ہوگا۔

(ب) وزیٹر کی طرف سے کسی معائنہ یا تحقیقات کے ارادے کی اطلاع پانے پر یونیورسٹی کو یہ حق ہوگا کہ اگر وہ اس سلسلے میں کوئی عرضداشت پیش کرنا مناسب سمجھے تو کرسکے اور وزیٹر کو اس درخواست پر اس سے قبل کہ وہ کوئی معائنہ یا جانچ کرائے غور کرنا ہوگا۔

اس امر کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ وزیٹر ایسے دیگر اختیارات کو بھی بروئے کار لائے جو قواعد وضوابط کی روشنی میں استعمال کئے جاسکتے ہوں۔ (چونکہ یونیورسٹی کی ایگزیکیٹو کونسل کو نئے قواعد وضوابط وضع کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے اس لئے اب تو یہ طے کرنا یونیورسٹی کا کام ہوگا کہ کن امور کے سلسلے میں وزیٹر کو مزید اختیارات دیئے جانے چاہئیں۔)

یونیورسٹی کے افسر ۔ پہلے یونیورسٹی کے چانسلر کا انتخاب کورٹ کیا کرتی تھی۔ اب (قواعد وضوابط میں) یہ درج کیا گیا ہے کہ اس کی تقرری ایگزیکیٹو کونسل کے سفارش کردہ پینل میں سے، جو تین افراد سے کم لوگوں پر مشتمل نہیں ہوگا۔ وزیٹر کیا کرے گا۔ چانسلر یونیورسٹی کے بہترین مفادات میں اپنے اخلاقی اختیا

اصلی باگ مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ رہی تو

اگر اس کی اصلی باگ مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ رہی تو ایسے چارٹر سے کچھ فائدہ نہیں جو ہم کو ہمارے اصلی اختیار سے محروم کردے کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ گاڑی ہرگز نہیں چلے گی جس میں دو عملی ہوگی اور ہمارا اصل مقصد حاصل نہ ہوگا تاوقتیکہ ہم کو ہماری قومی ضرورتوں کے موافق انتظام کرنے کا موقع نہ ملے گا۔

(شیخ محمد عبداللہ مرحوم)

کا استعمال کرنے کے قابل ہونا چاہیے اور کسی گروہ یا گٹ کے ساتھ اس کا کسی بھی قسم کا تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ موجودہ حالات میں وزیٹر کے ذریعے تقرری بہترین حل ہے۔ چانسلر کو کوئی انتظامیہ ذمہ داری یا اختیارات سونپنا بھی مناسب نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہ وضح کیا گیا ہے کہ وہ کورٹ کا ممبر نہیں ہوگا۔ پرو چانسلر کی تقرری بھی وزیٹر ہی کیا کرے گا اور چانسلر کی عدم موجودگی میں وہ ڈگریاں عطا کرنے کے لئے منعقدہ یونیورسٹی کی کانوکیشنوں کی صدارت کیا کرے گا۔

وائس چانسلر کی تقرری کے طریقۂ کار اور اس کے اختیارات و فرائض کو ضوابط میں درج کر دیا گیا ہے البتہ قانون میں اس بات کا خاص طور پر انتظام کیا گیا ہے کہ وائس چانسلر یونیورسٹی کا سب سے بڑا ایگزیکٹو اور اکیڈمک آفیسر ہوگا اور یونیورسٹی کے معاملات کی عام نگرانی اور کنٹرول کرنے کا کام اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ لہٰذا اس قانون کی رو سے یونیورسٹی کے کام کاج کو چلانے کی ذمہ داری اس پر ڈال دی گئی ہے اور ماسوائے ترمیم کے اس میں تبدیلی نہیں کی جا سکے گی۔

خزانچی کا عہدہ ختم کر دیا گیا ہے اور اسکی جگہ اب ایک فنانس آفیسر ہوا کرے گا۔ یونیورسٹی کے اخراجات کے لئے اب تقریباً ۹۹ فیصدی رقم چونکہ سرکاری خزانہ سے ملتی ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں روپیہ پیسہ ہو اس کی تقرری باقاعدہ طور پر کی جانی چاہیے اور وہ ایگزیکٹو کونسل کے کنٹرول کے اندر ہونا چاہیے۔ ایک منتخب خزانچی کا عہدہ ایک فرسودہ عہدہ بن کر رہ گیا تھا کیونکہ جب یونیورسٹی کی آمدنی کی رقوم کو جمع کرنے کی ذمہ داری کورٹ پر تھی تو وہ چندہ دینے والوں کے نمائندوں پر مشتمل تھی اور یہ واجب بھی تھا کہ یونیورسٹی کی اکاؤنٹس پر جانچ اور اس کے مالی امور پر کسی ایسے شخص کا اختیار ہو جو کورٹ کی طرف سے چنا گیا ہو۔

یونیورسٹی کی اتھارٹیاں:۔ اسٹوڈنٹس کونسل کے نام سے ایک نئی اتھارٹی اس ایکٹ میں شامل کی گئی ہے اس کونسل کو طلباء کے تعلیمی کام سے متعلقہ معاملات مثلاً نصابات کے ڈھانچے، تعلیم کے طریقے، یونیورسٹی کی مشترکہ زندگی اور یونیورسٹی میں معاون نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے بارے میں ایگزیکٹو کونسل اور اکیڈمک کونسل سے سفارشات کرنے کا اختیار ہوگا۔ ڈسپلن (نظم و ضبط)، بہبود، کھیل کود، ادبی اور شعبہ جاتی سوسائٹیوں، ہوسٹلوں کے انتظامات وغیرہ سے متعلقہ تمام ضابطوں کو اسٹوڈنٹس کونسل کے سامنے اسکی رائے حاصل کرنے کے لئے رکھا جائے گا۔

اس مد کے تحت ایک اور اہم تبدیلی کا تعلق کورٹ کے اختیارات سے ہے۔ گجندر گڈکر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں تجویز کیا ہے کہ کسی یونیورسٹی میں درجہ وار تنظیم کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یونیورسٹی اپنی کارپوریٹ باڈی کے ساتھ اسی صورت میں بہترین طریقہ سے کام کر سکتی ہے جبکہ ہر متعلقہ شعبہ ہر حلقہ

پر فیصلہ کرنے کے عمل سے وابستہ ہو۔ لہذا ایک اعلیٰ گورننگ باڈی مقرر کرنا کسی یونیورسٹی کے بہترین مفادات میں نہیں ہوگا اس کے برعکس ایک ایسا ادارہ قائم کرنا حق بجانب ہو سکتا ہے جس میں اساتذہ اور طلبا نیز ایسے لوگ شامل ہوں جو طلبا کے یونیورسٹی چھوڑنے پر ان کے امکانی آجر بن سکتے ہوں تاکہ وہ تعلیم کے نصاب اور اس سمت کے بارے میں، جو یونیورسٹی کو اختیار کرنی چاہیے، اپنا مشورہ دے سکیں۔ سابق طلبا کے نمائندے بھی شامل ہونے چاہئیں کیونکہ یونیورسٹی کے مستقبل اور بہبود کے ساتھ ان کا جذباتی لگاؤ ہونا ایک قدرتی بات ہے اور وہ مفید مشورہ دینے کے لئے اپنے تجربہ کو ہمیشہ استعمال کر سکتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے ایکٹ میں کورٹ کو درج ذیل اختیارات دیئے گئے ہیں:۔

(ا) یونیورسٹی کی اہم پالیسیوں اور پروگراموں کا وقتاً فوقتاً جائزہ لینا اور یونیورسٹی کی بہتری اور ترقی کیلئے اقدامات تجویز کرنا۔

(ب) یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ، سالانہ حساب کتاب اور اس کی آڈٹ شدہ رپورٹوں پر غور کرنا اور ان کے بارے میں ریزولیوشن پاس کرنا۔

(ج) مشورہ کے لئے جو بھی معاملہ اس کے پاس بھیجا جائے اس کے بارے میں وزیٹر کو مشورہ دینا اور

(د) قواعد وضوابط میں مندرج دیگر فرائض کو انجام دینا۔

کورٹ کو دیئے گئے نئے اختیارات کی روشنی میں یونیورسٹی ایگزیکٹو کونسل کا نام بدل کر پرنسپل ایگزیکٹو باڈی رکھا جا رہا ہے کیونکہ سارا مدعا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک غیر مرکزیت ہونی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ تال میل پیدا کرنے کی غرض سے کسی نہ کسی شخص کو ایگزیکٹو معاملات میں اعلیٰ ترین اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔

کونسل کو حاصل اکیڈمک اختیارات کو غیر مرکوز کر کے انہیں فیکلٹیز (شعبہ جات) ڈیپارٹمنٹ آف اسٹڈیز، بورڈ آف اسٹڈیز وغیرہ کو دے دیا گیا ہے۔ اب یہ کونسل یونیورسٹی کا سب سے بڑا اکیڈمک ادارہ ہوگی اور اسے مختلف فیکلٹیوں (شعبہ جات) کے درمیان تال میل پیدا کرنے اور یونیورسٹی کی اکیڈمک پالیسیوں پر عام نگرانی کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

اب تک فنانس کمیٹی یونیورسٹی کی ایک اتھارٹی تھی۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ تمام مالی معاملات ایگزیکٹو کونسل کے دائرہ اختیار میں ہونے چاہئیں۔ لہذا فنانس کمیٹی کو یونیورسٹی کی ایک اتھارٹی کی بجائے ایگزیکٹو کمیٹی کی ایک ذیلی کمیٹی بنا دیا ہے

قواعد وضوابط اور آرڈی نینسوں کی تشکیل۔

قواعد وضوابط اور آرڈی نینس تیار کرنے کے طریقہ کار میں مکمل تبدیلی کر دی گئی ہے۔ اب ایگزیکٹو کونسل کو وزیٹر کی رضامندی سے نئے یا مزید قواعد وضوابط مرتب کرنے یا موجودہ قواعد وضوابط میں ترمیم کرنے یا انہیں منسوخ کرنے کا اختیار حاصل ہوگا جن معاملات کے بارے میں قواعد وضوابط اور آرڈی

اسلامی کیرکٹر بدلنا نہیں چاہئے

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو اسلامی تہذیب کا مرکز بتائی جاتی ہے، اس کے اسلامی کیرکٹر کو بدلنا نہیں چاہئے اسلام نے دنیا کی تہذیب میں ایک نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کے مطالعے کے لئے ہندوستان کی ہر بڑی یونیورسٹی میں خاص شعبہ کھولا جانا چاہئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو خاص طور پر اس کا مرکز رہنا چاہئے۔ (ڈاکٹر گوپال سنگھ)

نینس تیار کیے گئے ہیں ان کی فہرستوں میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

اضافی دفعات:۔ ایکٹ میں درج ذیل اہم دفعات بھی شامل کی گئی ہیں:۔

(ا) اساتذہ اور افسروں کے ماسوائے یونیورسٹی کے ملازمین کے لئے ایک ثالثی ٹریبونل مقرر کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

(ب) یونیورسٹی کے کسی افسر یا اتھارٹی کے فیصلوں کے خلاف یونیورسٹی کے ملازموں اور طلباء کو ایگزیکیٹو کونسل کے پاس اپیل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

(ج) کسی ایسے طالب علم یا کسی امتحان کے کسی ایسے امیدوار کو جس کا نام یونیورسٹی کے رجسٹر سے کاٹ دیا گیا ہو اور جسے ایک سے زیادہ برسوں کے لئے یونیورسٹی کے امتحانات میں بیٹھنے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہو، ایگزیکیٹو کونسل سے اپیل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

(د) نیک نیتی سے کی گئی کارروائی کے لیے یونیورسٹی کے افسروں اور ملازموں کو قانونی چارہ جوئی سے تحفظ دلانے کا انتظام کیا گیا ہے۔

قوانین:۔ (ا) یونیورسٹی کی کورٹ، یونیورسٹی کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس میں تعلیمی برادری کے مختلف شعبوں سے تعلقات رکھنے والے اصحاب، جن میں یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسیاں وضع کرنے والے افراد، اساتذہ، طلبا اور سماج کے دوسرے طبقوں کے نمائندے شامل ہوتے ہیں یونیورسٹی کی موٹی موٹی پالیسیوں اور پروگراموں میں تبادلہ خیالات اور نظر ثانی کرنے، اس کی اصلاح اور ترقی کی تدابیر تجویز کرنے نیز یونیورسٹی کی سالانہ رپوٹ اور سالانہ حساب کتاب پر اظہار خیال کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً مل بیٹھتے ہیں۔ بنیادی طور پر کورٹ کی بحث یونیورسٹی کو سماج کی ضرورتوں اور تقاضوں کا احساس دلاتی ہے۔ لہٰذا کورٹ کو بحث و مباحثہ ہی تک محدود ہونا چاہیے اور اسے یہ اختیار نہیں دیا جانا چاہیے کہ اگزیکٹو اور اکیڈمک کونسلوں یا یونیورسٹی کی دوسری تعلیمی باڈیوں کے فیصلوں کو رد کر دے۔

ترمیمی قانون مجریہ ۱۹۷۲ء ایک سو بیس اراکین کی ایک کورٹ فراہم کرتا ہے اس میں ایکس آفیشو اراکین مثلاً وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر اور فیکلٹیوں کے ڈین اسٹوڈنٹس کونسل کا چیرمین اسٹوڈنٹس ویلفیر کا ڈین، لائبریری انچارج تین پرووسٹ، پراکٹر اور تمام سابق وائس چانسلر شامل ہوتے ہیں۔ شعبوں اور کالجوں کی نمائندگی کے لئے اس میں زنانہ کالج، طبیہ کالج اور پولی ٹیکنک کے پرنسپل اور شعبوں کے ۱۹ سربراہ ہوں گے۔ یہ نمائندگی سینارٹی کے مطابق مختلف فیکلٹیوں کو باری باری مناسب طور پر دی جائے گی۔ شعبوں کے سربراہوں اور پرنسپلوں کے علاوہ پانچ ریڈر اور پانچ لیکچرار باری باری تقدم کے اعتبار سے یونیورسٹی کے ٹیچروں کی نمائندگی کریں گے۔ ترمیمی قانون میں ایک نہایت اہم تبدیلی طلباء کے ۱۵ نمائندوں کی شمولیت کے معاملے میں کی گئی ہے۔ اسٹوڈنٹس یونین کا صدر اور سکریٹری، اسٹوڈنٹس کونسل کا سکریٹری، اسٹوڈنٹس کونسل کی طرف سے چنے ہوئے دو اشخاص، تعلیمی امتیاز حاصل کرنے والے طلبا پر مشتمل الیکٹورل کالج کی طرف سے چنے ہوئے پانچ طلبا اور کلچرل کمیٹی، سوشل سروس کمیٹی اور گیمز کمیٹی پر مشتمل الیکٹورل کالج کے چنے ہوئے پانچ طلبا کے نمائندے ہوں گے۔ اس طرح ان تینوں عناصر میں جن پر کوئی بھی یونیورسٹی مشتمل ہوتی ہے معقول توازن رکھا گیا ہے۔ اس میں ذہین طلباء کے نمائندے ہوں گے۔ غیر نصابی سرگرمیوں، امتیازی حیثیت پانے والوں مثلاً کھلاڑی یا مختلف ثقافتی سرگرمیوں یا سماجی خدمات میں حصہ لینے والے طلباء کے نمائندے ہوں گے۔ مزید براں ان کے نمائندے ہوں گے جو طلباء کے جذبات کی نمائندگی کرنا

چاہتے ہیں۔ تاہم یہ احتیاط برتی گئی ہے کہ نام نہاد پیشہ ور طلبا کو نہ گھسنے دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے یہ پابندی رکھی گئی ہے کہ ایسا کوئی بھی طالب علم مذکورہ بالا کسی بھی زمرے میں طلبا کی نمائندگی کرنے کا مجاز نہیں ہوگا جسے ہائی اسکول یا اس کے برابر کا امتحان پاس کئے آٹھ سے زیادہ سال گزر چکے ہوں یا پری یونیورسٹی یا اس کے برابر کا امتحان پاس کئے سات سے زیادہ سال گزر چکے ہوں یا وہ اس کورس کے لئے جس کا وہ طالب علم ہے مقررہ مدت سے ایک سال سے زیادہ مدت لگا چکا ہو۔

بیرونی عناصر میں پندرہ نمائندے ہوں گے جن کا انتخاب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڑھ کی روایات کے مطابق کرے گی۔ پارلیمنٹ کے دس نمائندے ہوں گے۔ ان میں سے چھ کو لوک سبھا کا اسپیکر اور چار کو راجیہ سبھا کا چیرمین نامزد کرے گا۔ مزید تین نمائندے علمی کام کرنے والوں اور خاص مفاد مثلاً صنعت، تجارت، ٹریڈ یونین، بینک کاری اور صحافت کے نمائندے ہوں گے جنہیں وزیٹر نامزد کرے گا۔ ایک خاص گنجائش یہ رکھی گئی ہے کہ ان بیس اراکین میں سے کم از کم پانچ ہندوستان کے ثقافتی اور تعلیمی اداروں کے نمائندے ہوں گے۔ گجندر گڈکر کمیٹی کی سفارشات کے مطابق اس زمرے کے افراد کو وزیٹر نامزد کرے گا اور کہ وہ چنے نہیں جائیں گے کیونکہ اس معاملے میں یہ پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ صنعت، زراعت، بینک کاری اور تجارت وغیرہ میں ممتاز حیثیت رکھنے والے اصحاب اس قسم کے لوگ نہیں ہوتے جو کسی حلقے سے امیدوار کھڑے ہوں ان سے تو درخواست کرنی ہوگی کہ وہ یونیورسٹی کی کارکردگی میں دل چسپی لینے کے لئے نمائندگی قبول کریں۔ اگر کورسوں کو جدید اقتصادی تقاضوں کے ہم آہنگ کرنا مقصود ہے اور اگر یونیورسٹی کی تحقیقی سرگرمیوں اور ملک کی اقتصادی و ترقیاتی ضرورتوں کے درمیان گہرا رابطہ قائم کرنا مقصود ہے تو ان کا مشورہ نہایت قیمتی ہوگا۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لئے کہ یونیورسٹی محض نمائشی نہ رہے، یہ ضروری ہے کہ ایسے بلند مقام اصحاب خصوصاً جن کا تعلق صنعت کے پبلک سیکٹر سے ہے۔ یونیورسٹی کے معاملات میں عملی حصہ لیں۔ یہ بات سراسر ناقابلِ فہم ہے کہ کسی سرکردہ پبلک سیکٹر ادارے کا سربراہ یا ٹیکنیکل ڈائرکٹر یونیورسٹی میں جائے گا اور یونیورسٹی کی کورٹ کے انتخاب میں اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرے گا۔ لہٰذا یہ مناسب سمجھا گیا کہ وزیٹر کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ ایسے افراد کو نامزد کرے۔ دیگر نامزد اراکین میں چیف ریکٹر کا ایک نمائندہ اور چانسلر کی طرف سے نامزد تین افراد شامل ہوں گے۔

(۲) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) قانون، یونیورسٹی کو ۲۱ اراکین کی ایک ایگزیکٹو کونسل فراہم کرتا ہے جس میں وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، پانچ ڈین، ایک پرنسپل ایک پروفیسر، تین ٹیچر (جن کا انتخاب اکیڈمک کونسل کرے گی اور ان میں سے کم از کم ایک لیکچرار ہوگا۔) پانچ افراد (جن کا انتخاب متناسب نمائندگی کے اصول پر کورٹ کرے گی اور ان میں سے کوئی بھی یونیورسٹی یا اس کے کسی کالج کا ملازم یا طالب علم نہیں ہوگا) اور دیگر چار افراد، جنہیں وزیٹر نامزد کریگا، شامل ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۱ اراکین میں سے دس وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کے علاوہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے نمائندے ہوں گے۔ اس کا اصلی مقصد اور لب لباب یہ ہے کہ یونیورسٹی کو چلانے کی بنیادی ذمہ داری اساتذہ کو دی جانی چاہئے۔

(۳) اکیڈمک کونسل جو یونیورسٹی کی بڑی تعلیمی باڈی ہے وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، فیکلٹیز کے ڈین، مطالعاتی شعبوں کے سربراہوں، پرنسپلوں اور انسٹی ٹیوشنوں کے سربراہوں، اسٹوڈنٹس ویلفیئر کے ڈین، اسٹوڈنٹس کونسل کے چیرمین، لائبریرین، شعبوں کے سربراہوں سے الگ پانچ پروفیسروں،

شعبوں کے سربراہوں سے الگ پانچ ریڈروں، پانچ لیکچراروں اور پانچ افراد (جو یونیورسٹی کی ملازمت میں نہیں ہوں گے اور ان کے خاص علم کی وجہ سے اکیڈمک کونسل انہیں بطور شریک کار کے منتخب کرے گی مگر اس شرط کے ساتھ کہ کسی ایک فیکلٹی کو سونپے ہوئے موضوعات سے وابستہ دو سے زیادہ افراد کو نہیں لیا جائے گا)، ایک پروووسٹ جسے وائس چانسلر نامزد کرے گا اور پراکٹر پر مشتمل ہوگی۔

اکیڈمک کونسل کے اراکین کی میعاد تین سال سے جیسی کہ ترمیم سے پہلے قانون میں تھی، کم کر کے دو سال کر دی گئی ہے تاکہ اساتذہ کی باری جلدی آئے اور ہر استاد کو یونیورسٹی کی اس بڑی تعلیمی باڈی کا رکن بننے اور اپنی شرکت سے یونیورسٹی کے تعلیمی امور کو فیض پہنچانے کا موقع ملے گجندر گڈکر کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ اکیڈمک کونسل کا دائرہ کار تنگ کر دیا جائے۔ اکیڈمک کونسل کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ پالیسی وضع کرے، مختلف شعبوں میں رابطہ قائم کرے تعلیمی معیار بڑھانے کی اصولی ہدایات دے اور یونیورسٹی کے عام تعلیمی مفاد کا دھیان رکھے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) قانون مجریہ ۱۹۷۲ء سے وابستہ ذیلی قواعد کی رو سے اکیڈمک کونسل کو یہ خاص ذمہ داری دی گئی ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسیوں کی نگرانی کرے اور طریق تعلیم، کالجوں میں مربوط تدریس تحقیقی کام کو فروغ دینے اور تعلیمی معیار بڑھانے میں رہنمائی کرے۔ اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ مختلف شعبوں میں رابطہ پیدا کرے اور ایسی کمیٹیوں یا بورڈوں کا تقرر کرے جو مختلف شعبوں میں ارتباط کی بنیادوں پر نئے منصوبے ہاتھ میں لیں۔ اکیڈمک کونسل کو یہ بھی اختیار دیا گیا ہے کہ عام تعلیمی افادیت کے معاملہ پر خود غور کرے یا کسی شعبہ یا ایگزیکٹو کونسل کی طرف سے اسے یہ کام کرنے کو کہا جائے تو کرے تعلیم کے نصاب، ممتحنوں، امتحانی پرچے مرتب کرنے والوں وغیرہ

کے ناموں یا ممتحنوں کی رپورٹوں اور تحقیقی مقالوں کی منظوری دینے کے معاملات اکیڈمک کونسل کے پاس نہیں جائیں گے۔

(۴) یونیورسٹی کے علمی شعبوں (فیکلٹیوں) کو زیادہ آزادی دی گئی ہے تاکہ تدریسی اور تحقیقی سرگرمیوں کے درمیان ربط باہم رہے اور تحقیقی منصوبوں نیز باہمی نظم و ضبط کے طریق کار کو فروغ ملے۔ اب ان شعبوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہر ذیلی شعبہ کی طرف سے سفارش کردہ کورسوں کی منظوری دے سکتے ہیں اور اسامیاں پیدا کرنے یا ختم کرنے کی سفارش کر سکتے ہیں۔ اب ان شعبوں میں ریڈروں اور لیکچراروں کو زیادہ نمائندگی دی گئی ہے اور دوسرے شعبوں کے لئے اکیڈمک کونسل کے نامزدگان فراہم کئے جا سکتے ہیں۔

(۵) ترمیمی قانون ہر ڈیپارٹمنٹ (ذیلی شعبہ) کو ایک بورڈ آف اسٹڈیز فراہم کرتا ہے جو اس ڈیپارٹمنٹ کے چار ریڈروں اور چار لیکچراروں، متعلقہ مضامین پڑھانے والے دو افراد اور دو ماہرین پر مشتمل ہوتا ہے۔ بورڈ کو جو کام تفویض کئے گئے ہیں ان میں مطالعہ کے لئے کورسوں کی سفارش، ممتحنوں کی تقرری، تحقیقات کے لئے موضوعات کی منظوری، ریسرچ کے لئے پروفیسروں کی تقرری اور انڈر گریجویٹ و پوسٹ گریجویٹ مطالعات و تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کی تدابیر کرنا شامل ہیں۔

(۶) ہر اس تدریسی ڈیپارٹمنٹ میں، جہاں اساتذہ کی تعداد بیس سے زیادہ ہوگی اب ایک ڈیپارٹمنٹل کمیٹی بنائی جائے گی جو اس ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ، متعلقہ فیکلٹی کے ڈین، ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسروں، چار ریڈروں اور لیکچراروں پر، جو اس ڈیپارٹمنٹ کے ہوں گے اور برتری کی بنا پر باری سے لئے جائیں گے، مشتمل ہوگی۔ ڈیپارٹمنٹل کمیٹی اساتذہ کی نئی اسامیاں نکالنے یا ختم کرنے یا ان کا درجہ بڑھانے کی سفارش کرے گی اور اس ڈیپارٹمنٹ نیز اس کی کارگردگی سے متعلق عام اور تعلیمی مفاد کے معاملات پر غور کرے گی۔ جس

تدریسی ڈیپارٹمنٹ میں اساتذہ کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ہوگی ڈیپارٹمنٹل کمیٹی کے فرائض خود وہ ڈیپارٹمنٹ سر انجام دیگا

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) قانون ۱۹۷۲ء سے پہلے کورٹ تین سال کے لئے یونیورسٹی کا چانسلر منتخب کرتی تھی

(۷) وائس چانسلر کا تقرر کم از کم تین افراد کے پینل میں سے وزیر کرے گا اور ان تین افراد کا انتخاب ایک کمیٹی کریگی جو خود تین افراد پر مشتمل ہوگی۔ کمیٹی کے دو ارکین ایگزیکیوٹو کونسل کے مقرر کردہ ہوں گے مگر ان میں سے کوئی بھی یونیورسٹی کا ملازم یا اور ایگزیکیوٹو کونسل یا اکیڈمک کونسل کا رکن نہیں ہوگا۔ کمیٹی کے تیسرے رکن کو وزیر نامزد کرے گا۔ وائس چانسلر کی میعاد پانچ سال مقرر کی گئی ہے۔ اب تک یہ میعاد چھ سال ہوا کرتی تھی تاہم اب اسے دوسری بار بھی مقرر کیا جا سکے گا۔ اب تک کے دستور کے مطابق دوبارہ تقرری نہیں ہو سکتی تھی۔

(۸) اب تک ہر ڈیپارٹمنٹ آف سٹڈی کا سربراہ جو ایک پروفیسر ہوا کرتا تھا، برتری کے اعتبار سے اپنی باری سے دو سال کے لئے فیکلٹی کے ڈین کی حیثیت میں کام کرتا تھا۔ اسی طرح پہلے یہ قاعدہ تھا کہ ہر ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ایک پروفیسر ہوگا اور پروفیسر نہ ہونے کی صورت میں ریڈر ہی سربراہ ہوگا۔ لیکن اب ترمیمی قانون کی رُو سے ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ہی برتری کی بنا پر از خود فیکلٹی کا ڈین نہیں بن سکے گا اور اس کے بجائے وائس چانسلر ہی فیکلٹی کے پروفیسروں میں سے کسی ایک کو تین سال کے لئے ڈین مقرر کرے گا۔ ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ وائس چانسلر کی سفارش پر پروفیسروں میں سے کسی ایک کو ایگزیکیوٹو کونسل کی سفارش پر مقرر کرے گا۔ جن ڈیپارٹمنٹوں میں صرف ایک پروفیسر ہے ـــ ان میں ایگزیکیوٹو کونسل کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ وائس چانسلر کی سفارش پر پروفیسر یا ایک ریڈر کو ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ مقرر کر سکے گی۔ یہ بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ کوئی بھی پروفیسر یا ریڈر جو ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ اس درجہ سے نہیں بننا چاہتا کہ اسے اس میں دلچسپی نہیں یا انتظامی ذمہ داریاں سنبھالنے کا شوق نہیں یا کافی عرصہ تک وہ انتظامیہ ذمہ داریاں پوری کر چکا ہے، ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ مقرر کئے جانے کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کر سکتا ہے۔

(۹) یونیورسٹی میں پروفیسروں، ریڈروں اور لیکچراروں کے تقرر کی سفارشات کرنے والی سلیکشن کمیٹی کی ساخت میں بھی تبدیلی کی گئی ہے۔ اس وقت تک فیکلٹی کا ڈین سلیکشن کمیٹی کا رکن ہوا کرتا تھا۔ اب متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ سلیکشن کمیٹی کا رکن ہوگا۔ کمیٹی کے ماہر اراکین کو ایگزیکیوٹو کونسل ایک پینل میں سے نامزد کرے گی۔ اس پینل کے ناموں کی سفارش اکیڈمک کونسل متعلقہ مضمون میں ان افراد کے خاص شغف یا علمی استعداد کو ملحوظ رکھ کر کرے گی۔ ایک سال سے کم مدت کی عارضی اسامیوں کے لئے الگ سلیکشن کمیٹیاں بنائی جائیں گی۔ ایسی کمیٹی فیکلٹی کے

مولانا محمد علی

ضرورت اس امر کی ہے کہ جتنی قومی جماعتیں اور انجمنیں اس وقت ملک میں موجود ہیں سب مل کر تسلیم کریں پبلک میں ایک ایسی زبردست ایجی ٹیشن کریں کہ گورنمنٹیں قومی جذبات کے مطابق کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائیں یا صاف اظہار کر دیں کہ اس کام کو قومی کام نہیں سمجھتے نہ قوم کی آواز کا ان پر اثر ہے اس میں مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کو سب سے بڑا حصہ لینا پڑیگا اور ہم نے اسلئے مناسب جانا کہ ایسوسی ایشن کو پہلے سے متنبہ کر دیں اگر کوئی با اختیار اور ذی اقتدار جماعت جس کا فرض منصبی قوم کے ہاتھوں میں نہ ہو بلکہ اپنی جماعت میں تمام خالی جگہوں کو بھی خود پُر کرتی ہو قومی جذبات کے سراسر خلاف کارروائی کرنے لگے تو ایک جماعت میں قوم کیا کر سکتی ہے؟ اسکے لئے صرف دو ہی راستے ہیں یا ایجی ٹیشن کرے اور اس جماعت سے اپنے جذبات و احساسات کا لحاظ کرائے یا PASSIVE RESISTANCE سے مقابلہ کرکے رجحانات کو بدل دے

لوک سبھا کے اسپیکر جناب جی۔ایس۔ڈھلوں مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے خصوصی مہمان کی حیثیت سے
مسلم یونیورسٹی کے چند طلبار کے درمیان

ڈین، ڈپارٹمنٹ کے سربراہ اور وائس چانسلر کے ایک نامزد رکن پر مشتمل ہوگی۔

(۱۰) قانون میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ یونیورسٹی کے ہر استاد کا تقرر ایک تحریری معاہدے پر ہوگا اور معاہدہ کا مضمون قواعد کے مطابق وضع کیا جائے گا۔ یہ بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ یونیورسٹی کسی پروفیسر یا ریڈر کو جز وقتی بنیادوں پر کسی یونیورسٹی یا کسی ادارہ میں ساتھ ساتھ کام کرنے کی اجازت ایسی شرائط کے تحت دے سکتی ہے جو آرڈی ننس کے ذریعہ مقرر کی جائیں گی۔ ترمیمی قانون کے تحت رجسٹرار ہر زمرے کے افراد کی مکمل اور آخری وقت تک کی برتری کے مطابق فہرست تیار کرے اور اپنے پاس رکھے۔

(۱۱) یونیورسٹی کے لئے اساتذہ کی ایسوسی ایشن اور غیر تدریسی عملہ کی ایسوسی ایشن بنانے کے لئے بھی گنجائش رکھی گئی ہے ایسی ایسوسی ایشنوں کے آئین اور فرائض اور دائرۂ کار بذریعہ آرڈی ننس مقرر کئے جائیں گے۔

(۱۲) ایجوکیشن کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ سٹوڈنٹس یونین کمرۂ جماعت سے باہر یونیورسٹی کی زندگی میں طلبار کی شرکت کا ایک اہم ذریعہ پیش کرتی ہے۔ اگر یونینیں ٹھیک ڈھنگ سے منظم ہوں تو خود انتظامی اور خود ضبطی میں مدد دیتی ہیں۔ لہٰذا قانون میں یونیورسٹی کے لئے سٹوڈنٹس یونین کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس کی رُو سے یونیورسٹی کے ہر طالب علم کو اس کا رکن تصوّر کیا جائے گا۔ مزید براں سٹوڈنٹس یونین کی جنرل کونسل ہوگی۔ یہ فیصلہ آرڈیننس کے ذریعہ کیا جائے گا کہ کونسل میں طلبار کی تعداد کتنی ہو اور اس کی تشکیل کس طرح کی جائے۔ سٹوڈنٹس یونین اور جنرل کونسل کے اختیارات کا تعین بھی آرڈی ننسوں کے ذریعہ کیا جائے گا۔ (بشکریہ محکمہ اطلاعات گورنمنٹ آف انڈیا)

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

"مسلم یونیورسٹی شعلوں کے نرغے میں"

ایکٹ ۱۹۷۲ء کے مخالفین کا نقطۂ نظر

"اپنی مدد آپ کرو" یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرے میں انسانوں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی مدد آپ کرنے کا جوش اس کی ترقی کی سچی بنیاد ہے اور جب یہ جوش بہت سے لوگوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور مضبوطی کی جڑ ہے۔ کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے غیرتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے۔ (سر سید احمد خاں)

غدر کے بعد مسلمانوں کی حالت گرنے لگی تھی۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کو سدھارنے کیلئے سر سید احمد خاں نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی داغ بیل ڈالی۔ بلاشبہ یہ کالج مسلمانوں کے لئے قائم کیا گیا تھا مگر اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ اس کے ذریعے سے ہندو مسلم کی تفریق کیجائے۔ بقول سر سید احمد خاں "مجھ کو بیحد افسوس ہو گا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندؤں اور مسلمانوں میں امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو کالج قائم کرنے کا ہوا، یہ ہے کہ مسلمان روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے تھے۔ ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہیا کی گئی تھی اس واسطے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جائے۔ اس کی مثال اس طرح پر دی جا سکتی ہے۔ فرض کرو دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک بالکل طاقتور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی زوال پذیر ہے۔ پس اس کے دوسرے بھائی کا فرض ہو گا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیریں کرے اور اس کی مدد کرے"۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

اس طرح ایم۔ اے۔ او کالج کی بنیاد رکھی گئی تاکہ

مسلمان تعلیم حاصل کریں اور خود کو اس قابل بنا سکیں کہ دوسری قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں۔ غیر مسلم جنہوں نے بھی اس ادارے کے لئے عطیات دیئے وہ بھی اس سے متفق تھے اس لئے اس کالج کے قیام کے وقت یہ بات پیش نظر تھی کہ ہر مسلمان طالب علم کے لئے نہ صرف اسلامی تعلیم کا انتظام ہو بلکہ اسے اسلامی تربیت بھی دی جائے۔ اس ماحول کو ایسا رنگ دیا جائے جو اسلامی ماحول کہلانے کا مستحق ہو مگر اس درسگاہ کے دروازے غیر مسلموں کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ ان دروازوں کے کھلے ہونے کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ یہ درسگاہ مسلمانوں کے لئے قائم نہیں کی گئی۔

مسلمانوں کا یہ عزیز ترین ادارہ ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء کے تحت محمڈن اینگلو اورینٹل کالج سے "دی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" میں تبدیل ہو گیا۔ اس ایکٹ نے یہ بات صاف طور پر واضح کر دی کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی اقامتی درس گاہ ہے۔ اس ایکٹ کی کئی دفعات نے اس بات کا اظہار کر دیا کہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں نے مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ و بقا کے لئے تعمیر کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کورٹ جو سارے اختیارات کی مالک ہے اس کا ممبر صرف مسلمان ہو سکتا ہے۔ اسلامی دینیات کی تعلیم ہر مسلمان طالب علم کے لئے ضروری قرار دی گئی تھی۔ کورٹ کی ممبری کا نظام اس طرح قائم کیا گیا تھا کہ اسے نہ صرف ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی نمائندگی حاصل ہو بلکہ اس کا تعلق ہندوستان کی ملت اسلامیہ سے زیادہ سے زیادہ برقرار رہ سکے۔ کورٹ متفق ہو کر اپنے کسی ممبر کو وائس چانسلر نامزد کرتا تھا۔

مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۵۱ء: ۱۹۵۱ء میں مسلم یونیورسٹی کا نیا ایکٹ پاس کیا گیا۔ اور ایکٹ ۱۹۲۰ء میں کافی تبدیلیاں کر دی گئیں۔ کورٹ کی ممبری کی یہ قید ختم کر دی گئی کہ کورٹ کا ممبر صرف مسلمان ہی ہو سکتا ہے اور یہ نظام درہم برہم کر کے اس طرح تبدیل کر دیا گیا کہ کورٹ کی نمائندہ حیثیت ملت اسلامیہ سے ہٹ کر حکومت کے ہاتھوں میں پہنچ گئی اور کورٹ حکومت کا ماتحت ادارہ بن گیا۔ وائس چانسلر کے تقرر کا حق وزیٹر یعنی صدر جمہوریہ ہند کو دے دیا گیا جو کورٹ کی نہیں بلکہ یونیورسٹی کی انتظامیہ کی سفارش پر کرے گا۔ اسلامی تعلیم یونیورسٹی کے ہر مسلمان طالب علم کے لئے ضروری نہیں رہ گئی۔ اس طرح سے مسلم یونیورسٹی کے اقامتی کردار اور نام کے علاوہ باقی تمام امور میں تبدیلیاں کر دی گئیں جن کے حصول کے لئے سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اپنے تن من دھن کی بازی لگا دی تھی ہندوستان کے مسلمان جو ۱۹۴۷ء کے اندوہناک حالات سے خوفزدہ تھے۔ ان بنیادی تبدیلیوں پر منہ سے آہ بھی نہ نکال سکے۔

مسلم یونیورسٹی آرڈیننس ۱۹۶۵ء: ایک ایسے دور میں جبکہ پورے ملک میں تشدد اور بے راہ روی کی ہوائیں چکرا رہی تھیں۔ طلباء میں بے چینی اور عدم اعتماد بڑھتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے ملک کی زیادہ تر یونیورسٹیاں بند ہو چکی تھیں لیکن مسلم یونیورسٹی کے طلباء کا رویہ پرسکون تھا۔ سابق چیف جسٹس آف انڈیا گجندر گڈکر نے کہا:۔

"صرف اتنا ہی نہیں کہ مسلم یونیورسٹی کے طلباء کا رویہ مثالی رہا بلکہ علی گڑھ نے اس وقت بھی بلا کسی خلل کے اپنا کام جاری رکھا جب کہ یہ تکلیف دہ منظر نگاہوں کے سامنے بار بار آ رہا تھا کہ متعدد معاصر یونیورسٹیاں بند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ یونیورسٹی کی خود مختاری ایک بہترین اصول ہے مگر صرف اس وقت جب اسے اس کا استحقاق ہو۔ اگر کسی یونیورسٹی کو خود مختاری کا حق حاصل ہے تو وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے"

۲۵ اپریل ۱۹۶۵ء کو یونیورسٹی کے چند ذمہ داروں نے طلباء کی عزت کو للکارا اور انہیں ایسا قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ میں

مسلم یونیورسٹی کے گرد بھیانک شعلے رقص کرنے لگے۔ اس واقعہ کو بہانہ بنا کر حکومت نے پھر مداخلت کی تاکہ اس کے بنیادی کردار کو ہی ختم کر دیا جائے۔ مسلمانوں کے زبردست احتجاج کو ٹھکراتے ہوئے حکومت نے یونیورسٹی پر ایک آرڈیننس نافذ کر دیا اور کچھ ہی دنوں بعد اس آرڈیننس کو مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۶۵ء کی شکل دیدی گئی۔

مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۶۵ء: ایکٹ ۱۹۵۱ء کے تحت کورٹ کی تھوڑی بہت حیثیت باقی تھی مگر ایکٹ ۱۹۶۵ء کے ذریعے اس کو بھی تبدیل کر دیا گیا یعنی اب کورٹ کے ممبر نامزد ہونے لگے اسی کے ساتھ کورٹ کے سارے اختیارات ختم کر دیئے گئے۔ اب کورٹ کو صرف مشورہ دینے کا ہی حق رہ گیا۔ انتظامیہ کے ممبر بھی نامزد کئے جانے لگے۔ حتی کہ ٹریژرر جو ایکٹ ۱۹۵۱ء کے تحت منتخب کیا جاتا تھا ایکٹ ۱۹۶۵ء کے تحت اس کا تقرر انتظامیہ کے سپرد کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ یہ قید بھی لگا دی گئی کہ انتظامیہ اپنے سارے اختیارات حکومت کے زیر نگرانی اور کنٹرول میں رہتے ہوئے استعمال کرے گی۔ اس طرح سے مسلم یونیورسٹی ایک خود مختار جمہوری ادارہ نہیں رہا بلکہ اس کا انتظام براہ راست مرکزی حکومت ہند کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور حکومت مسلم یونیورسٹی کے سیاہ سفید کی مالک بن گئی۔

سپریم کورٹ کا المناک فیصلہ: جمہوریہ ہند میں لے دے کر صرف مسلم یونیورسٹی ہی مسلمانوں کا اپنا ادارہ رہ گیا تھا۔ اس کے بھی اس طرح چھین لئے جانے پر ہندوستان کے مسلمان چیخ اٹھے۔ حکومت نے ان کے احتجاج کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ بے کس مسلمانوں کی نظر ہند کے سب سے بڑے عدل و انصاف کے دروازے پر پڑی اور حکومت کے فیصلہ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ جمہوریہ ہند کا دستور دفعہ ۳۰ میں کہتا ہے کہ ہندوستان میں ہر اقلیتی فرقہ کو اپنے ادارے قائم کرنے اور چلانے کا حق حاصل ہے۔ یہ سوچ کر مسلمانوں کو امید تھی کہ قانونی طور سے وہ مسلم یونیورسٹی کو پھر سے حاصل کر سکتے ہیں اور پھر سپریم کورٹ نے فیصلہ سنا دیا۔

" یہ یونیورسٹی نہ تو مسلمانوں نے قائم کی اور نہ اس کے نظم و نسق کا کوئی حق انہیں حاصل ہے۔" باوجود اس کے کہ مسلم یونیورسٹی کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ادارہ مسلمانوں نے مسلمانوں کے لئے قائم کیا۔

مہاراشٹر کے ایڈوکیٹ جنرل جناب ایچ۔ ایم سیروائی کے بقول "یہ وہ پہلا مقدمہ تھا جس میں سپریم کورٹ نے اپنی اس وسیع المشربی کو ترک کیا جس کو پیش نظر رکھ کر اس نے اب تک اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کے بارے میں فیصلے صادر کئے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں سپریم کورٹ نے چند نہایت تنگ اصلاحی بنیادوں پر جو خود نادرست اور غلط ہیں۔ یہ فیصلہ صادر کیا کہ یہ ادارہ اس اقلیت کا نہیں ہے جس نے ایک مسلم یونیورسٹی کے لئے جدوجہد کی اور اسے حاصل کیا اور نہایت وافر مقدار میں اس کو مال اور جائیداد سے نوازا اور باوجودیکہ ۱۹۲۰ء کا ایکٹ صرف مسلمانوں کو اس کا اعلیٰ ترین با اختیار طبقہ قرار دیتا تھا تاہم یہ چیز سپریم کورٹ کی نظر میں مسلمانوں کو اس کے نظم و نسق اور اسے چلانے کا اختیار عطا نہیں کرتی۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ مسلم یونیورسٹی پر مسلمانوں کے کسی بھی حق و اختیار کو بالکل ختم کر دیتا ہے اور اس فیصلہ کے بعد مسلم یونیورسٹی کی آئینی حیثیت حکومت کے صرف ایک ایسے مملوکہ ادارے کی رہ جاتی ہے جسے وہ کسی بھی وقت اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی شکل دے سکتی ہے۔"

موجودہ صورت حال:۔ اور اب ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ایک طرف سپریم کورٹ کا فیصلہ

یہ کہتا ہے:۔

۱۔ مسلم یونیورسٹی کو مسلمانوں نے قائم نہیں کیا۔

۲۔ مسلم یونیورسٹی کو چلانے اس کے انتظام میں دخل دینے کا کوئی حق مسلمانوں کو نہیں ہے۔

۳۔ مسلم یونیورسٹی کوئی خود مختار تعلیمی ادارہ نہیں ہے بلکہ مرکزی حکومت ہند کا براہ راست ماتحت ادارہ ہے جو اس کے نامزد افراد کے ذریعہ چلتا ہے اور صرف حکومت کے سامنے جواب دہ ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو کوئی حق اس ادارہ کی نگرانی اور انتظام میں دخل دینے کا نہیں۔ (عبدالبصیر نعیمی)

دوسری طرف مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء ہے جو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سکریٹری الحاج عبیدالرحمٰن شیروانی کے خیال میں بہی خواہان یونیورسٹی کی توقعات کے بالکل خلاف اور سخت مایوس کن ہے یہ بل پارلیمنٹ نے ایسی عجلت سے پاس کیا جس کی مثال ملنا دشوار ہے اور پارلیمنٹ میں پیش کیے جانے سے قبل کسی کو اسے دیکھنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ بعض ممبران پارلیمنٹ نے جو ترمیمیں پیش کیں انہیں کثرت آرا سے مسترد کر دیا گیا۔

وزیر تعلیم نے پارلیمنٹ میں بل پیش کرتے ہوئے جو تقریر کی اس میں دعویٰ کیا کہ یونیورسٹی کے خصوصی کردار کو برقرار رکھا گیا ہے۔ حالانکہ ہمارے نزدیک یہ حقیقت نہیں ہے بلکہ اس بل کی مختلف دفعات کے ذریعہ یونیورسٹی کی خصوصیات کو پامال کیا گیا ہے۔ ہمارا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ کورٹ۔ ایگزیکیٹو کونسل۔ فنانس کمیٹی وغیرہ میں انتخابات کے جمہوری اصول کو پس پشت ڈال کر نامزدگیوں کی بھرمار کر دی گئی ہے وائس چانسلر کی نامزدگی کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کے مطابق وہ کم و بیش حکومت ہند بلکہ وزارت تعلیم کا نمائندہ ہوگا اور پھر اس کے اختیارات میں جو بے جا اضافے کئے گئے ہیں وہ یونیورسٹی کے جمہوری کردار اور اندرونی خود مختاری (AUTONOMY) دونوں کے لیے سخت مضر اور نقصان رساں ہیں۔ اسی طرح چانسلر اور پرو چانسلر کی نامزدگی کا طریقہ بھی نہایت نامناسب تجویز کیا گیا ہے اور اس سے ان عہدوں کا وقار بالکل ختم ہو جائیگا۔ ڈونرز کو (جو اس یونیورسٹی کے بانیوں میں سے تھے) قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے اور کورٹ یا ایگزیکیٹو کونسل کی ممبری کا استحقاق انہیں آئندہ حاصل نہیں رہے گا۔ اسی طرح آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جسے بانی ایم۔ اے۔ او کالج نے قائم کیا تھا اور جس کا صدر مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوتا ہے۔ کورٹ میں حق نمائندگی ضبط کر لیا گیا ہے۔ کورٹ۔ جن اداروں اور پیشوں (LEARNED PROFESSION ETC.) سے دس افراد کو بطور رکن منتخب کرتا تھا اگرچہ اب ان کی تعداد بڑھا کر بیس کر دی گئی ہے۔ لیکن انہیں بھی وزیٹر نامزد کریگا۔ اسی طرح پارلیمنٹ کے جو دس ممبر کورٹ کے ممبر ہوں گے ان میں سے چھ کو اسپیکر لوک سبھا اور چار کو چیرمین راجیہ سبھا کا بالترتیب نامزد کریں گے یہ یقیناً زبردستی ہے۔ کورٹ کے کل ممبر تقریباً ۱۲۰ ہوں گے جن میں سے منتخب شدہ ممبروں کی تعداد صرف تیس ہوگی باقی سب باعتبار اپنے عہدہ کے ایکس افیشیو ہونگے یا پھر نامزد۔ منتخب شدہ ممبروں میں سے ۱۵ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے نمائندہ ہوں گے اور ۱۵ طالب علموں کے۔ دراصل طالب علموں کے نمائندہ بھی برائے نام ہی منتخب شدہ ہوں گے کیونکہ بالعموم ان کے انتخابات کا طریقہ بالواسطہ (INDIRECT) رکھا گیا ہے۔ چانسلر اور پرو چانسلر کورٹ کے ممبر نہیں ہوں گے ایگزیکیٹو کونسل کے ۲۱ ممبروں میں سے صرف پانچ کو کورٹ منتخب کریگا باقی سب ایکس افیشیو یا نامزد ہوں گے۔ کورٹ۔ ایگزیکیٹو کونسل اور اکیڈیمک کونسل کے ممبروں کے انتخاب کیلئے PROPORTIONAL REPRESENTATION کا اصول نہایت نامناسب ہے۔ تعلیمی اداروں میں اس طریقہ انتخاب کا رواج
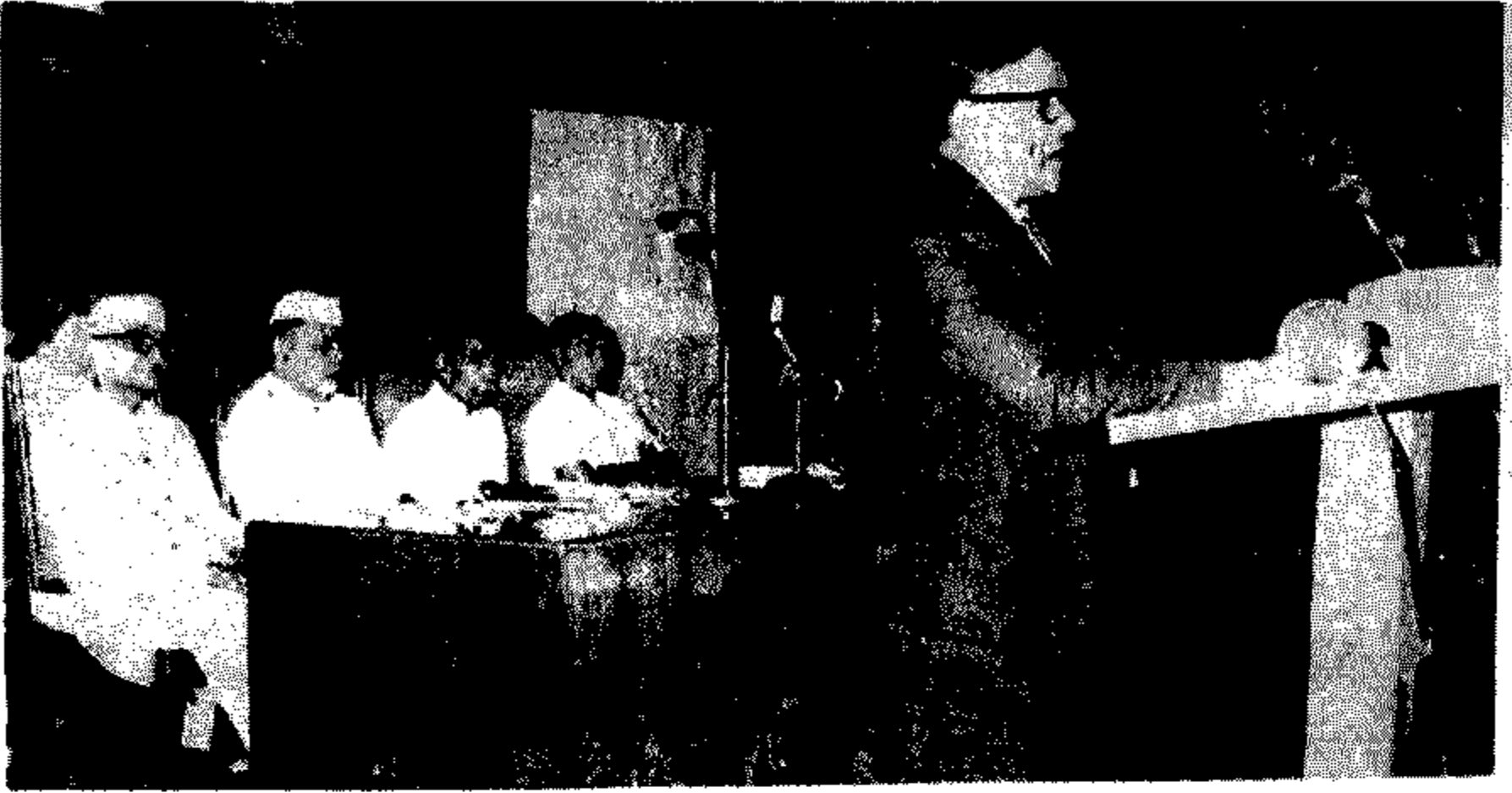
گاندھی جینتی کے موقعہ پر کینیڈی ہال میں جلسہ پروفیسر آر، این، سکسینہ صدر شعبہ سوشیالوجی تقریر کرتے ہوئے

تھے با عتبار سینیارٹی باری باری سے ڈین ہوتے تھے۔ لیکن موجودہ ایکٹ میں وائس چانسلر کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ جس پروفیسر کو چاہے بلا لحاظ سینیارٹی ڈین مقرر کردے اسی طرح شعبہ کا صدر سینیئر پروفیسر ہوتا تھا لیکن اب جن شعبوں میں ایک سے زیادہ پروفیسر ہوں گے ان میں وائس چانسلر جس پروفیسر کو چاہے صدر شعبہ مقرر کر سکتا ہے اور جن شعبوں میں صرف ایک پروفیسر ہوگا ان میں وہ اگر چاہے تو کسی ریڈر کو بھی متعین کر سکتا ہے۔ اس میں سینیارٹی کا لحاظ بالکل نہیں رکھا گیا ہے اور مسئلہ محض وائس چانسلر کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ پروفیسر اور ریڈر کا تقرر جو سلیکشن کمیٹی کرے گی ڈین اس کا ممبر نہیں ہوگا حالانکہ وہ اب تک اس کا ممبر ہوتا تھا ہرگز درست نہیں ہے۔

آنریری ٹریژرر کے عہدہ کو بحال نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے بجائے فنانس افیسر کا تقرر ہوگا جو یونیورسٹی کا تنخواہ دار ملازم ہوگا۔ وہ نہ کورٹ کا ممبر ہوگا نہ فنانس کمیٹی کا اور نہ ایگزیکیٹو کونسل کا۔ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے آنریری سیکریٹری ایم اے او کالج۔ کالج کے مالیات، جائیداد اور اوقاف کا نگراں ہوتا تھا یونیورسٹی کے قیام کے بعد یہ اختیارات آنریری ٹریژرر کو منتقل ہو گئے تھے ٹریژرر کو کورٹ منتخب کرتا تھا اور وزیٹر اس کی منظوری دیتا تھا وہ قوم کا معتمد علیہ ہوتا تھا۔ حسن اتفاق کہ ایم اے او کالج کے آخری آنریری سیکریٹری نواب سید محمد علی صاحب مرحوم یونیورسٹی کے پہلے آنریری ٹریژرر منتخب ہوئے۔ جیزجی کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی کہ آنریری ٹریژرر کے تحت ہی فنانس افیسر مقرر کیا جائے جو مالیات کی نگرانی کرے انٹرنل آڈٹ کا محکمہ پہلے ہی سے قائم ہے جو پورے سال حسابات کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے ۱۹۵۱ء کے ترمیمی ایکٹ کے بموجب فنانس کمیٹی کے دو ممبر کورٹ کے منتخب کردہ اور دو وزیٹر کے نامزد کردہ ہوتے تھے۔ موجودہ ایکٹ کی رو سے نامزد ممبروں کی تعداد تین ہو گئی ہے اور صرف ایک ممبر کو ایگزیکیٹو کونسل منتخب کیا کرے گی۔

فیکلٹی کے وہ پروفیسر جو شعبوں کے صدر بھی ہوتے رجسٹرار وزیٹر کو یونیورسٹی کی جملہ انتظامی مجلسوں کے

ایجنڈہ کی تعیین اور روئیداد لازماً بھیجا کرے گا۔ کیا یہ یونیورسٹی کی آزادی میں بے جا مداخلت نہیں ہے؟

اسٹوڈنٹس یونین کے علاوہ طالب علموں کی ایک کونسل کا قیام تجویز کیا گیا ہے۔ جس کا چیرمین وائس چانسلر کا مقرر کردہ کوئی استاد ہوگا اور جس طرح یونین کے صدر اور سیکریٹری کورٹ کے ممبر ہوں گے اسی طرح اس کونسل کے چیرمین اور سکریٹری بھی ممبر ہوں گے۔ کونسل کے کاموں کا تعین آرڈی ننس کے ذریعہ کیا جائیگا۔ یونین کے ہوتے ہوئے کونسل کا قیام کیوں ضروری سمجھا گیا یہ ایک وضاحت طلب سوال ہے۔

یہ کہنا کہ جب حکومت یونیورسٹی کی مالی امداد کرتی ہے تو اس کا پورا کنٹرول یونیورسٹی پر ہونا چاہیئے نادانی پرمبنی ہے اور یونیورسٹیوں کے اندرونی خود مختاری کے مسلمہ اصول کے منافی ہے۔ یونیورسٹی کو تعلیم اور اپنے اندرونی انتظام کے لیے قواعد و قوانین بنانے کا مکمل اختیار ہونا چاہئے۔ دنیا کے کسی بھی جمہوری ملک میں حکومت یونیورسٹیوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی ہے۔ بعض حلقوں سے بار بار یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں چھ کروڑ سے زیادہ مسلمان بستے ہیں جبکہ علی گڑھ یونیورسٹی میں صرف آٹھ ہزار طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ان میں چھ ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں ہیں۔ یہ قلیل تعداد ملک کی ساری مسلم آبادی پر کیسے اثرانداز ہو سکتی ہے۔ اور اگر اس یونیورسٹی کے مخصوص کردار کی ضمانت بھی کر دی جائے تو پورے ملک میں مسلمانوں کا تعلیمی مفاد اس سے کیسے محفوظ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے نوجوان اور متعدد بیرونی ممالک کے طالب علم بھی تعلیم پاتے اور ہوسٹلوں میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ ایم، اے، او کالیجیٹ اسکول کے قیام ہی کے وقت سے یہاں کی اقامت گاہوں میں طلبا کی ایسی تربیت کی جاتی ہے اور ان میں ایسے برادرانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں کہ وہ نہ صرف پورے ملک بلکہ ان دوسرے ملکوں کے لیے بھی جن کے نوجوان یہاں تعلیم پاتے ہیں نمونہ کا کام دیتے اور بعد کی زندگی میں مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں اس لیے اس ادارہ کا مخصوص کردار نہ صرف باقی رہنا چاہیے بلکہ بانی درس گاہ کے مقاصد اور حالات زمانہ کے مطابق اسے اس طرح اجاگر کرنا چاہیے کہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا و باہر جاکر واقعی ہر شعبۂ زندگی میں ممتاز اور نامور ہوں۔ دراصل موجودہ ایکٹ بجائے جمہوریت کو بحال کرنے کے جمہوری روایات کو پامال کرے گا اور آمریت کے لئے راہ کھولے گا۔

برعکس نہند نام زنگی کافور

۱۹۶۵ء کے ایکٹ نے وائس چانسلر کو جو اختیارات تفویض کیے تھے ان سے یونیورسٹی کے تعلیمی اور انتظامی معاملات میں کیا بہتری ہوئی اس سے ہر شخص واقف ہے اور اس لئے اس بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ اب موجودہ ترمیمی ایکٹ کی رو سے وائس چانسلر کو جو مزید اختیارات عطا کئے گئے ہیں ان کا نتیجہ یونیورسٹی کے لئے جیسا کچھ مفید یا مضر ہوگا اس کا اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اپنے نمائندوں کے ذریعہ اس ادارہ پر مکمل تسلط قائم کرنا چاہتی ہے اور استادوں، طلبا اور اولڈ بوائز کی یونیورسٹی کے نظم و نسق میں آزادانہ شرکت کے بجائے محدود اور مشروط شرکت کو کافی سمجھتی ہے۔ بہر صورت غور طلب امر یہ ہے کہ موجودہ ایکٹ سے یونیورسٹی کو جو نقصان پہونچیگا اس سے اسے کیسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے اس سوال کا جواب تلاش کرنا یونیورسٹی کے ہر بہی خواہ کا اولین فرض ہونا چاہیے۔" (عبید الرحمٰن)

●●

مسلم یونیورسٹی

سیکولر روایات کا گہوارہ

(بی. پی. موریہ ممبر پارلیمنٹ)

"جیسے ہی میں چھ سال کا ہوا میرے والد نے میرا داخلہ گاؤں کے پرائمری اسکول میں کرا دیا۔ اس اسکول میں میرا استاد ایک برہمن تھا۔ اس زمانہ میں ذات پات کا بھید بھاؤ بہت زیادہ تھا۔ مجھے دوسرے لڑکوں سے الگ بٹھایا جاتا۔ دوسرے لڑکوں کے بیٹھنے کے لیے فرش اسکول سے ملتا لیکن مجھے بیٹھنے کے لیے اپنا ٹاٹ اپنے گھر سے لے جانا پڑتا۔ مجھکو کلاس میں اندر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ کلاس سے باہر کھڑکی کے قریب مجھے بٹھایا جاتا تھا۔ یہ برہمن صاحب دوسرے لڑکوں کو تو ان کی غلطیوں پر ہاتھ سے مارتے تھے لیکن مجھے ڈنڈے سے پیٹا جاتا تھا چونکہ ڈنڈے کی چوٹ ناقابل برداشت تھی۔ اس لیے ایک دن میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے بھی ہاتھ سے ہی مارا کیجئے۔ اس پر انہوں نے بگڑ کر کہا "تم بلچھ ہو، میں تمہیں ہاتھ کیسے لگا سکتا ہوں، اور پھر ایک دن مجھے ماسٹر صاحب نے بڑی گندی گندی گالیاں دیں اور بے طرح مارا۔

"میں نے دوسرے دن اسکول چھوڑ دیا اور قریب کی مسجد میں جو مکتب تھا اس میں اپنی تعلیم شروع کی۔ اسی مدرسہ میں میں نے درجہ چار پاس کیا۔ یہاں کے مدرس ایک مولوی صاحب تھے۔ یہاں ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ مولوی صاحب نے کبھی مجھ سے نفرت نہیں کی، کبھی مجھے دوسرے لڑکوں سے الگ نہیں بٹھایا، کبھی میرے جسم کو ناپاک نہیں سمجھا۔

"علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد سے میری زندگی کا سنہری دور شروع ہوتا ہے۔ میں نے اس شاندار یونیورسٹی میں ۱۹۴۸ء میں ایف. ایس. سی میں داخلہ لیا اور پھر اسی یونیورسٹی سے بی. ایس. سی. ایل ایل بی اور ایل ایل ایم ڈگریاں حاصل کیں۔ اتنا ہی نہیں، اس یونیورسٹی نے مجھے ملازمت بھی دی۔ اور میں اس کے شعبۂ قانون میں دستوری

قانون کا لکچرر مقرر ہو گیا

"میرے لیے برہمن ماسٹر صاحب کا اسکول، اسکول نہیں بلکہ قتل گاہ تھا لیکن مولوی صاحب کا مدرسہ جیسے میرا اپنا گھر۔ اسی طرح کا ماحول میں نے علی گڑھ میں پایا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں ایک لفظ میں کہہ دوں یہ کہ اگر یہ یونیورسٹی نہ ہوتی تو آج کا موریہ بھی نہ ہوتا۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا میری زندگی بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ آج بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قومی کردار بنانے میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔ وہ ہندوستان کی قومی درسگاہ ہے۔ حکومت کو اس معاملہ میں زیادہ دخل نہیں دینا چاہیے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مسلم یونیورسٹی کوئی فرقہ پرست ادارہ ہے۔ وہ سیکولر روایات کا گہوارہ ہے۔ میری اپنی مثال اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔ لکچرر شپ کے لیے میرے مقابلے میں ۳۶ امیدوار تھے، ان میں زیادہ تر مسلم تھے۔ مگر ان سب میں میرا انتخاب کیا گیا۔ اس لیے میں کسی طرح بھی یقین کرنے کیلئے تیار نہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کوئی فرقہ پرست ادارہ ہے۔"

(ماخوذ از ہما نومبر ۱۹۶۷ء)

مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء

قطعی غیر جمہوری اور علم دشمن قدم

ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے

(شاہد صدیقی)

ناگروالا نے ریزرو بینک سے ۶۰ لاکھ روپے حاصل کئے۔ وہ پکڑا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا۔ فوراً ہی فیصلہ سنا دیا گیا۔ سزا ملنے کے کچھ مہینے کے بعد ہی دہلی کے ولنگڈن ہسپتال میں اس نے دم توڑ دیا۔ یہ سب کچھ اس تیزی اور پھرتی سے ہوا کہ دیکھنے والوں نے محکمہ انصاف کی کارکردگی پر حیرت سے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ اتنے اہم مقدمے کو جس غیر معمولی تیزی کے ساتھ نپٹایا گیا اس نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ آج بھی جب کچھ حزب مخالف کے ممبر دال کی اس کالک کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو حکومت انکی کالکوں کا بھانڈا پھوڑ کر دال کی کالک کا معاملہ گول کر دیتی ہے۔

کچھ ایسا ہی واقعہ مسلم یونیورسٹی بل کے معاملے میں ہوا شاید پارلیمنٹ میں کسی بل کو پیش کرنے اور پاس کرانے میں اتنی زیادہ پھرتی نہیں دکھائی گئی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر بل تمام مراحل سے گزر کر صدر جمہوریہ کی منظوری حاصل کرنے کے بعد ایکٹ بن چکا تھا۔ بل کو نہ تو کسی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا نہ اس پر رائے عامہ جاننے کی کوشش کی گئی (جیسا کہ دستور ہے اور جیسا کسی بھی جمہوری نظام میں کیا جانا چاہیے) اب اگر لوگ سوچتے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے تو اس میں ان کا کیا قصور ؟ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہمدردوں پر فرقہ واریت کا الزام لگانے والے چاہے کچھ بھی کہتے رہیں لیکن حقیقت تو کچھ اور ہی ہے۔ جب جمہوریت کے بڑے بڑے علمبردار اس غیر جمہوری طریقے سے پاس کئے جانے والے قطعی غیر جمہوری ایکٹ کی اندھی حمایت کریں تو یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑیگا کہ یقیناً وہ فرقہ پرست ہیں اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر اس ایکٹ کی حمایت کر رہے ہیں۔

پروفیسر یا کلرک: ہندوستان میں نظام تعلیم کی سب سے بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ یہاں پروفیسر کلاسوں میں کلرکوں کی طرح پڑھاتے ہیں طلباء کلرکوں کی طرح پڑھتے اور پانچ سال بعد ایم۔ اے کی ڈگری لے کر کسی بوسیدہ دیمک زدہ دفتر میں کلرک بننے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ پڑھانے والے کو علم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ علم حاصل کرنے والے کے مستقبل سے، ملک کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے اگر دلچسپی ہے تو صرف پہلی تاریخ کو ملنے والی تنخواہ سے۔ وہ کلاس میں آتا ہے، اپنی دکان کھولتا ہے اور پچاس منٹ بعد اپنی دکان سمیٹ کر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان

میں وائس چانسلر کو بہت زیادہ اختیارات حاصل ہیں ـــــ
پروفیسر، لکچرار اور طلباء سب ایک مشین کے کل پرزوں کی
طرح ہیں جس کا بٹن وائس چانسلر کے ہاتھ میں ہے معرف
بھی نہیں۔ یہاں تقرری کے وقت علمی اور تعلیمی میدان
میں تجربہ رکھنے والے لوگوں پر دفتروں میں کام کرنے والے
افسروں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ حال ہی میں اودے پور
یونیورسٹی کے آئین میں ترمیم کرکے وہاں کے رجسٹرار کو وائس
چانسلر بنا دیا گیا۔

لیکن ـــ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس بات پر فخر ہے کہ
وہ اب تک ان معاملات میں ہندوستان کی تمام دوسری
یونیورسٹیوں سے مختلف اور منفرد رہی ہے۔ یہاں آج تک
استاد اور شاگرد کا رشتہ ایک باپ اور بیٹے کا رشتہ بنا ہوا
ہے نہ کہ ایک دکاندار اور گاہک کا۔ یہاں آج بھی جونیئر،
سینیئر کی اپنے بڑے بھائی کی طرح عزت کرتا ہے اور سینیئر
اپنے جونیئر کا خیال رکھتا ہے۔ یہاں طالب علم صرف
ڈگری لینے نہیں آتا بلکہ ایک نئی شخصیت بنانے آتا ہے
علم حاصل کرنے آتا ہے۔ اور جب وہ یہاں سے نکلتا ہے تو
اس پر چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان مسلم یونیورسٹی کی
پوری پوری چھاپ پڑ چکی ہوتی ہے۔ وہ اس قابل بن
چکا ہوتا ہے کہ ہندوستان کی کسی دوسری یونیورسٹی کے
طالب علم سے کسی بھی میدان میں ٹکر لے سکے۔ اس کی
بات چیت، رکھ رکھاؤ ظاہر کر دیتا ہے کہ اس نے مسلم یونیورسٹی
کے علمی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ
وہ ایک اچھا کلرک ثابت نہ ہو لیکن ایسا بہت کم دیکھنے
میں آتا ہے کہ وہ ایک عمدہ انسان نہ بنے۔

لیکن ـــ موجودہ ایکٹ نے یونیورسٹی کے اس امتیازی
انداز کے اوپر، اپنائیت سے بھرپور اس برادرانہ ماحول
کے اوپر سب سے کاری ضرب لگائی ہے۔ اس ایکٹ کا اثر
یہ ہوگا یونیورسٹی کے پروفیسروں اور استادوں کی حیثیت
بھی مشین کل پرزوں جیسی ہو جائے گی۔ ان کو چلانے کا
کھٹکا وائس چانسلر کے ہاتھ میں ہوگا اور وائس چانسلر کا
کھٹکا مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم کے ہاتھ میں۔

ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے
لیکن جمہوریت صرف نعرے لگانے سے قائم نہیں ہوتی۔
عمل میں جمہوری طریقہ اختیار کرنے سے ہوتی ہے اور اس
جمہوریت کے غیر جمہوری طریقہ عمل کا سب سے بڑا نمونہ
مسلم یونیورسٹی ایکٹ ہے۔

اب تمام شعبوں کے ڈین (DEAN) بالکل غیر
جمہوری طریقے سے وائس چانسلر کے ذریعے منتخب کئے جائیں
گے۔ اور صرف یہی نہیں، وائس چانسلر کو اس بات کا بھی حق ہوگا
کہ وہ جسے چاہے کسی بھی شعبے کا صدر بنا سکتا ہے۔ یعنی اگر
اب وائس چانسلر چاہے گا تو تمام اہم عہدوں پر "جی حضور" کہنے
والے لوگوں کو مقرر کر دے گا۔ اب ترقی کرنے کے لئے یہ ضروری
ہو جائے گا کہ وائس چانسلر کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ اسی
طرح وائس چانسلر مرکزی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے میں
لگا رہے گا۔ اساتذہ وائس چانسلر کی خوشنودی حاصل کرنے
میں اور طلباء اپنے استادوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں۔
اس طرح کم از کم ایک فائدہ تو ہوگا کہ علی گڑھ والوں کی صحت
بہتر ہو جائے گی ـــ یونیورسٹی میں کتابوں کی مانگ کم ہو جائے گی
اور مکھن کی مانگ بڑھ جائے گی۔

اسی طرح اساتذہ بہت سے گروپوں میں بٹ جائیں
گے۔ کچھ وہ ہوں گے جو وائس چانسلر کی خوشنودی حاصل
کرنے کی کوشش کریں گے اور دوسرے وہ جو اس کے مخالف
ہوں گے۔ کچھ استاد شعبوں کے صدر کے ساتھ ہوں گے تو
کچھ اس کے پیٹھ پیچھے وائس چانسلر کی خوشنودی حاصل
کرکے اس کا تختہ پلٹنے کے درپے ہوں گے۔ اسی طرح مسلم

یونیورسٹی تعلیم کے سب سے بڑے مرکز کیلئے غیر جمہوری سیاست کا اکھاڑہ بن جائے گی

صرف یہ ہی نہیں بلکہ ایگزیکیٹو کیمٹی کے زیادہ تر ممبر بھی وائس چانسلر کے زیر اثر ہوں گے۔ سب سے مزیدار بات یہ ہے کہ یہ ایگزیکیٹو غیر تعلیمی اسٹاف " NON ACADE-MIC STAFF کے لئے ایک ایسوسی ایشن بھی قائم کرے گی اس کا آئین بنائے گی، اس کو چلائے گی یعنی خود مالک اپنے کام کرنے والوں کی ٹریڈ یونین کو چلائے گا۔ اس قسم کے غیر جمہوری قدم کی مثال ہٹلر کے جرمنی اور مسولینی کے اٹلی میں دیکھنے کو تو مل سکتی ہے لیکن کسی جمہوری ملک میں اس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔

ہماری حکومت سوشلزم کی علمبردار بنتی ہے اور غریبوں کی ہمدرد، لیکن یونیورسٹی کے غریب درجہ چہارم کے ملازمین کو کسی قسم کی مراعات نہیں دی گئی ہیں۔ انہیں کسی بھی کونسل یا کمیٹی میں کوئی نمائندگی نہیں ملی ہے۔

لوک سبھا میں جو بل پیش کیا گیا اسمیں ایگزیکیٹو کونسل کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی ٹیچر کو بغیر کسی انکوائری کے یا بغیر وجہ بتائے دو مہینے کے نوٹس پر علیحدہ کر سکتی ہے لیکن مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر جگدیش بھٹاچاریہ کے زوردار احتجاج پر حکومت کو یہ غیر جمہوری قدم واپس لینا پڑا اور اس کی جگہ — "ضروری انکوائری" کا لفظ بڑھا دیا گیا۔

دوسری طرف طلبا سے ان کے تمام جمہوری حقوق چھین لیے گئے ہیں اور یہ سب جمہوریت کے نام پر کیا جا رہا ہے اسٹوڈنٹ یونین کے علاوہ ایک اسٹوڈنٹ کونسل قائم کی جائے گی۔ اس کونسل کے ممبروں کا انتخاب خود وائس چانسلر کرے گا۔ اس طرح وائس چانسلر اگر چاہے گا تو طلبا کے اتحاد کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیگا۔ کچھ لڑکوں کو اسٹوڈنٹ کونسل کا ممبر بنا کر طلبا کے جائز حقوق کے لیے لڑنے والی اسٹوڈنٹ یونین سے بچھڑا دے گا۔

صرف یہی نہیں۔ اب اسٹوڈنٹ یونین کے عہدہ داروں کا انتخاب عام طالب علم نہیں کریں گے بلکہ پہلے ایک جنرل کونسل آف یونین قائم کی جائے گی جس کے کچھ ممبر عام طلبا چنیں گے اور کچھ نامزد کیے جائیں گے اور یہ کونسل یونین کے عہدے داروں کا انتخاب کرے گی یعنی ایک بار پھر ہم انیسویں صدی میں پہنچ جائیں گے۔ جب عام آدمی کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ اس طرح اسٹوڈنٹ یونین طلباء کی نمائندہ جماعت نہ رہ کر صرف ایک مذاق بن جائے گی۔

علی گڑھ میں ہوا — اب دہلی کی باری ہے، لیکن

سرسید کا مزار

آپ (سرسید احمد خاں) کی تدفین اسی یونیورسٹی کی حیات آفریں فضا میں مسجد کے بائیں پہلو میں ہوئی ہے مزار سنگ مرمر کا ہے۔ یہ وہی ہستی ہے جو اپنی زندگی میں کئی مزاروں پر عقیدت اور محبت کے پھول چڑھا چکی ہے مگر آج یہی ہستی چند پھولوں کے لئے بھی محتاج ہے۔ پھول تو پھول اس ہستی کے حق میں یہاں دعا کرنے کے لئے بھی بعد نماز جمعہ کوئی نہیں آتا یوں تو ہر جمعہ کو مسجد نمازیوں سے لدی ہوئی ہوتی ہے لیکن کوئی بندۂ خدا ایسا نہیں جو اس ہستی کے مزار پر فاتحہ پڑھے۔ واقعی یہ بات ہمارے لئے کتنی اندوہناک ہے۔ وہ ہستی جس نے اس یونیورسٹی کی بنیاد کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا یہاں تک کہ اس ہستی نے اس یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کے لئے اپنے ہاتھ تک دوسروں کے آگے پھیلائے تھے۔ افسوس صد افسوس! آج وہی ہستی چند پھولوں کی محتاج ہے میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ہستی کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے اور اسکی روح کو ابدی تسکین عطا فرمائے۔

(علیم صبا نویدی بی اے علیگ)

اسلامی مکاتب کے مجموعے کا نام

"فی الحقیقت ہماری یونیورسٹی ہندوستان کے اسلامی مکاتب و مدارس اور کالجوں کے مجموعے کا نام ہوگی۔"

"یونیورسٹی قائم ہوجانے کے بعد اسلامی آبادی کے تمام مرکزوں میں کالج ہوں گے اور یہ تمام کالج محمڈن یونیورسٹی کے ماتحت اور تابع ہوں گے۔"

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ۱۹۰۹ء

پا پا میاں شیخ عبداللہ

"پختہ استقلال و عزم یونیورسٹی ضرور ملے گی مگر میں یہاں تک قوم کو رائے دوں گا کہ خواہ انجام کچھ بھی ہو مگر اخیر وقت تک ہم کو ثابت قدم رہنا چاہئے اور اپنے استقلال میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آنے دینا چاہئے۔"

"یونیورسٹی کے متعلق اس وقت سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ جس نقطۂ خیال پر مسلمان متفق ہوچکے ہیں اسی پر قائم رہیں، ان دشواریوں سے جو گورنمنٹ کے جواب سے پیدا ہوئی ہیں، قومی استقلال میں ہرگز تذبذب نہ آنا چاہئے۔" ۲۹ ستمبر ۱۹۱۵ء

اس سب سے ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ صرف علی گڑھ میں ایسا ہو رہا ہے۔ اس قسم کے آرڈی ننس دہلی یونیورسٹی، بنارس یونیورسٹی اور وشو بھارتی یونیورسٹی کے لئے بھی آنے والے ہیں۔ اس کے بعد دوسری یونیورسٹیوں کا نمبر آئے گا۔ ان غیر جمہوری ایکٹوں کے ذریعے شاید حکومت کا ارادہ پورے نظام تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کا ہے اور اس طرح یونیورسٹی میں خود سوچنے اور رکھنے کی آزادی کو سلب کرنے کا ہے۔

دہلی یونیورسٹی میں پہلے ہی ایک آرڈی ننس آچکا ہے جس کے خلاف یہاں کے اساتذہ اور طلبا مختلف تحریکیں چلا رہے ہیں۔ علی گڑھ کے انداز پر دہلی میں بھی تین اسٹوڈنٹ کونسلیں قائم کی جائیں گی۔ تین اس لئے کہ دہلی یونیورسٹی میں اسّی ہزار طالب علم ہیں جب کہ علی گڑھ میں صرف دس ہزار طالب علم ہیں۔ ان اسٹوڈنٹ کونسلوں کے قیام کے بعد اسٹوڈنٹ یونین ایک مذاق بن جائے گی۔ طلباء آپس میں جھگڑیں گے اور یہاں بھی وہی نتائج برآمد ہوں گے جن کی طرف علی گڑھ کے سلسلے میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

اس غیر جمہوری آرڈی ننس کے خلاف دہلی یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ زبردست تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ تحریک تمام یونیورسٹیوں میں متحدہ طور پر چلائی جائے تاکہ علی گڑھ کے جمہوریت پسند اور جائز حقوق کے لئے لڑنے والے طلباء اور اساتذہ پر فرقہ واریت کا الزام لگانے والوں کا منہ بند ہو جائے۔

یہ ضروری ہے کہ ان لوگوں کا بھانڈا پھوڑ دیا جائے جو فرقہ واریت کا نام لے کر "ہندو مسلمان" کا نام لے کر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ یہ غیر جمہوری اور علم دشمن ایکٹ علی گڑھ کے حلق سے اتار دیا جائے۔ اسی طرح یہ لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ عام لوگوں کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹا کر صرف اقلیتی یا غیر اقلیتی کردار کے سوال پر مبذول رکھی جائے اور جو بھی اس غیر جمہوری ایکٹ کی سچے اور صاف دل سے مخالفت کرے اسے فرقہ واریت پھیلانے کا الزام لگا کر بند کر دیا جائے۔

علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ جن سنگھ کے ان لوگوں کے لئے بھی ایک وارننگ ہے جو فرقہ وارانہ جذبات بھڑکا کر فضا کو زہریلا بنا رہے ہیں۔ بہت جلد بنارس یونیورسٹی کے بارے میں بھی ایسا ہی ایکٹ پیش کیا جانے والا ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہ لوگ بھی اپنی آنکھیں کھولیں، مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی مخالفت کریں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہمدردوں کا ساتھ دیں۔

(شاہد صدیقی)

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی
ایکٹ ۱۹۷۲ء
اچھا — یا — برا؟

ہم نے ملک کے مختلف لیڈروں اور متضاد مکتبہ سیاست کے سربراہوں سے جن میں مسلمانوں کی تنظیمیں، مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور جمعیۃ العلمائے ہند بھی شامل ہیں مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے سلسلہ میں آراء طلب کی تھیں، ہم نے ان سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ مخالفت یا حمایت میں رائے دیتے ہوئے ان کی وجوہات بھی واضح کریں۔ جن حضرات کے جواب ہمیں ملے ہیں وہ ذیل میں لفظ بہ لفظ پیش کئے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی

ایم ڈی - صدر مسلم مجلس یوپی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کی وجہ سے، جسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے بڑی عجلت سے پاس کروا دیا گیا، بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ میں ذیل کے کالموں میں چند کے متعلق اظہارِ خیال کروں گا۔

(الف) یونیورسٹی کی خود مختاری

جمہوری ممالک کے تمام ماہرین تعلیم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ اعلیٰ علمی اور تحقیقاتی اداروں کو حکومت کی مداخلت اور دفتری پابندیوں سے آزاد ہونا چاہیے مجھے یقین ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے ذریعہ اس یونیورسٹی کی خود مختاری کو تباہ کر دیا گیا ہے شلاً:

(۱) صدر جمہوریۂ ہند یا مرکزی وزارت تعلیم کی طرف سے بالواسطہ طور پر یا بلاواسطہ طور پر یونیورسٹی کورٹ کے لیے نامزد کردہ اشخاص کم و بیش ۷۰ فی صد ہوں گے اکیڈمک کونسل کے لیے ۴۲ فی صد اور ایگزیکیٹو کونسل میں تو ۷۵ فی صد سے زاید ہی ہوں گے۔

(۲) صدر جمہوریہ ہند سے پیشگی منظوری لینے کے بعد دستور بنانے کا حق ایگزیکیٹو کونسل کو دے دیا گیا ہے (دفعہ ۲۴ کی رو سے)

(۳) ہر علمی شعبہ کا صدر اعلیٰ اور تمام محکموں کے سربراہ کاروں کا تقرر وائس چانسلر کریں گے۔ (دفعہ ۷-۸ کی رو سے)

(۴) ایگزیکیٹو کونسل کی سفارش پر جس میں وزارتِ تعلیم کے نامزد کردہ ممبران کی اکثریت ہوگی، وزیر یعنی صدر جمہوریۂ ہند چانسلر اور وائس چانسلر کا تقرر کرینگے۔

(۵) دستور کی دفعہ ۴۰ (۲) کی رو سے یونیورسٹی کے کسی بھی ملازم کو اس بنیاد پر کہ وہ اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل نہیں ہے، خارج کیا جا سکتا ہے۔

(۶) ایکٹ کی دفعہ ۴۰ کی رو سے عدلیہ کو مداخلت

کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

(۷) اعزازی خازن کا منتخب عہدہ ختم کر کے اس کی جگہ ایک افسر حسابات رکھا گیا ہے جس کا تقرر وائس چانسلر کریں گے۔

(۸) یونیورسٹی کورٹ اعلیٰ ترین اقتدار کا حامل ادارہ تھا۔ اس کے تمام حقوق کو سلب کر کے محض ایک بحث و مباحثہ کا یا مشورتی ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وائس چانسلر صاحب اپنی ایگزیکیٹو کونسل کی معرفت براہ راست صدر جمہوریہ ہند یعنی وزارت تعلیم کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خود مختار کردار کو ختم کر دیا گیا۔

(ب) طلباء کی جدوجہد

موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ طلبا کی ایک نئی تنظیم "اسٹوڈینٹس کونسل" کے نام سے قائم کرتا ہے۔ یہ دریافت وائس چانسلر صاحب کی ہے۔ یونیورسٹی یونین اجواب بھی موجود ہے، کے صرف تین ممبر اس کونسل میں لیے جائیں گے جس کے چیرمین ایک استاد ہوں گے اور جن کو وائس چانسلر صاحب نامزد کریں گے۔ (دفعہ ۲۴) مزید پانچ طلبا کو بھی وائس چانسلر صاحب ہی نامزد کریں گے۔ کونسل کے دیگر ممبران بھی بالواسطہ وائس چانسلر صاحب ہی کے حامی ہوں گے ورنہ ان کے لیے کونسل کا رکن بننا مشکل ہوگا۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ایکٹ میں طلبا کی ایک ہی قسم کی دو تنظیموں کی گنجائش کیوں رکھی گئی ہے۔ "اسٹوڈینٹس یونین" کے منتخب کردہ نمائندے ہمیشہ اقلیت میں ہوں گے۔ اکیڈمک کونسل اور ایگزیکیٹو کونسل میں طلبا کا کوئی نمائندہ نہیں ہوگا۔ صرف یونیورسٹی کورٹ میں طلبا کے نمائندے

کوئی توجہ ہی نہ کرسکا

شیخ محمد عبداللہ نے اپنے ۱۰ جولائی ۱۹۷۲ء کے خط میں لکھا ہے۔

"مجھے افسوس ہے کہ خود اپنے مسائل کے سلسلہ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے میں حال ہی میں بنائے گئے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ سے پیدا ہونے والے تنازعہ پر کوئی توجہ نہ دے سکا اس لئے میں سوالنامہ پر اپنی کچھ بھی رائے دینے کا اہل نہیں ہوں"

شیخ محمد عبداللہ

۱۰۔ مولانا آزاد روڈ۔ سرینگر

ہوں گے جس کے تمام حقوق کو چھین کر محض ایک مشورتی ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسٹوڈینٹس کونسل سفارشیں کرے گی اور نفاق کے بیج بوئے گی جس سے طلبا میں خوشامدی اور تملق پسند پیدا ہوں گے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اسکیم کے بروئے عمل آنے

ایڈیٹر پرتاپ کے نریندر کی رائے

"میرا خیال یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف جو ایجی ٹیشن چلایا جارہا ہے وہ خود ایکٹ میں درج باتوں کے خلاف کسی اضطراب سے زیادہ ذہنی مایوسی کا اظہار ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کا ایک طبقہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ کسی شخص کو بھی ایسی کوئی بات کرنے کا حق حاصل نہیں ہے جسے وہ کسی بھی وجہ سے پسند نہیں کرتے۔ یہ ناقابل برداشت صورت حال ہے۔ علیگڑھ یونیورسٹی اب اقلیتی ادارہ نہیں ہے۔ سپریم کورٹ بھی یہی فیصلہ دے چکی ہے۔ مسلمانوں کا جو طبقہ آج اس ایکٹ کے خلاف تحریک چلا رہا ہے وہ یہ سوچتا ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کو بھی بدل سکتا ہے۔ موجودہ ایکٹ کسی طرح بھی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات میں مداخلت نہیں کرتا۔ ایکٹ کے ذریعہ صرف کچھ انتظامی تبدیلی کی گئی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا جو طبقہ اس ایکٹ کے خلاف تحریک چلا رہا ہے وہ اپنے عمل سے پروفیسر بلراج مدھوک کی اس تھیوری کی تصدیق کرتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے بھارتیہ کرن کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ صرف نام کے ہندوستانی ہیں۔ ان کا سارا رخ، نظریہ اور اقدار فرقہ وارانہ ہیں۔ وہ اس بنیادی اور ابتدائی حقیقت کو تسلیم کرنے سے منکر ہیں کہ کوئی بھی مذہبی اقلیت نہیں ہوتی جب تک مسلمانوں کا یہ طبقہ یہ سمجھتا رہے گا کہ وہ پہلے مسلمان پھر ہندوستانی ہیں اس وقت تک ٹکراؤ ناگزیر رہے گا۔"

کے۔ نریندر ۷ جولائی ۱۹۷۲ء

(پرتاپ بھون بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی)

سے طلبا کی شخصیت اور کردار کے آزادانہ ارتقا میں مدد پیدا ہوں گی۔

(ج) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی اور تاریخی کردار

دستور ہند میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو قومی اہمیت رکھنے والا ادارہ کہا گیا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی اور تاریخی کردار کے کیا معنی ہیں؟ حکومت ہند نے ۱۹۶۱ء میں چیرمین کی حیثیت سے پروفیسر جی سی۔ چٹرجی کے ماتحت ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی بجائے اس کے کہ ان اصطلاحات کی میں اپنے طور پر تعریف کروں میں ان کی رپورٹ سے حوالے دوں گا جس کو حکومت ہند نے منظور کرلیا ہے۔ اس رپورٹ کے صفحہ ۱۲ پیراگراف ۲ میں کہا گیا ہے کہ یونیورسٹی کا مقصد جہاں طلباء کو اعلیٰ تعلیم سے مزین کرنا تھا وہاں مسلمانوں کے بہترین تصورات اور ثقافت کا تحفظ بھی تھا۔ آگے چل کر صفحہ ۱۴۲ پر پروفیسر چٹرجی فرماتے ہیں کہ دراصل یہ وہ زندہ روایت ہے، یہ وہ زبردست مقصدی قوت (یعنی اسلام) ہے جسے ہمیں محفوظ رکھنا چاہیے اور جس سے ہمیں اس یونیورسٹی کے تعلق سے بھی گہری محبت ہونا چاہیے۔

دستور ہند کی دفعہ ۲۹ اور ۳۰ میں اقلیتوں کو خصوصی تحفظات دیئے گئے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے کانگریس مینوفسٹو کے پیراگراف نمبر ۵۴ اور ۵۵ میں کہا گیا ہے کہ "کانگریس جدوجہد کرے گی کہ اقلیتوں کو تعلیمی اور دیگر ادارے قائم کرنے، ان کا انتظام کرنے اور چلانے کی پوری آزادی ملے مزید وہ کوشش کرے گی کہ اقلیتوں کے قائم کردہ اداروں کے جمہوری طریقۂ کار اور خود مختار طریقۂ کار کی حفاظت ہوتی رہے۔" یہ دونوں پیراگراف ۱۹۷۱ء میں کانگریس مینوفسٹو میں پہلی بار شامل کیے گئے ظاہر ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا اشارہ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف ہے۔ مینوفسٹو کی ان یقین دہانیوں اور دستور ہند کی ان دفعات کا بظاہر یہی مفہوم ہے کہ انتظامیہ یعنی یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکیٹو کونسل اور اکیڈمک کونسل کے علاوہ اساتذہ اور طلبا کی اکثریت بھی مسلمانوں پر مشتمل ہوگی۔ جب تک اس کا یقین نہ ہو جائے اقلیتی اور تاریخی کردار بحال نہیں رہ سکتا۔ دوسری طرف اگر آپ ایکٹ پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ سابق طلبا، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم تہذیب اور علم و فضل کے نمائندوں کو کورٹ کی رکنیت سے خارج کر دیا گیا ہے حالاں کہ یہ گذشتہ تین چوتھائی صدی سے کورٹ کے ممبر رہ چکے ہیں۔

یقین دہانیاں

سابق طلبا کی کونسل کے سکریٹری کو وزیر اعظم آنجہانی لال بہادر شاستری صاحب نے بہت عرصہ پہلے یعنی یکم ستمبر ۱۹۶۵ء میں تحریری طور پر یقین دلایا تھا کہ آنے والے بل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کردار اسی طرح قائم رکھا جائے گا۔ علاوہ ازیں وزیر اعظم کی ہدایت پر جناب فخرالدین علی احمد نے بیگ کمیٹی کا تقرر کیا جس کا مقصد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تجویز کردہ ترمیمی بل کے سلسلہ میں متعدد موصولہ مشوروں کا جائزہ لینا اور مناسب ترمیمیں تجویز کرنا تھا۔ اس کمیٹی نے اتفاقِ رائے سے سفارش کی (دفعہ ۱ و ۲) کہ چاہے کوئی عدالتی فیصلہ یا ٹریبونل کا حکم اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، یہی سمجھا جائے گا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو مسلم اقلیت نے اپنی پسند کے تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے قائم کیا لہٰذا اس کا نظم و نسق دستورِ ہند کی دفعات ۲۹ اور ۳۰ کے مطابق ہوگا۔ اسی کمیٹی کے ایک ممبر مسٹر سید علی ظہیر نے اپنی رائے کا اظہار مذکورہ بالا نظریے کی تائید میں اس طرح کیا ہے کہ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ

مولانا فارقلیط کی مائے

روزانہ الجمعیۃ کے ایڈیٹر مولانا عثمان فارقلیط نے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"مسلم یونیورسٹی ایکٹ پر ہما کا خاص نمبر واقعی قابل دید ہوگا۔ میں پیشگی اس کا خیر مقدم کرتا ہوں، مگر میری صحت اس درجہ گری ہوئی ہے کہ آپ شاید تصور ہی نہیں کر سکتے۔ بے چینی اور گھبراہٹ سے زندگی تلخ ہے ——— مجھ پر بڑا ہی کرم ہوگا اگر آپ میری معذرت قبول فرمائیں تو۔ ہما کا خاص نمبر مطالعہ کرنے کے لئے بے چین رہوں گا۔"

سیکشن ۴ اور بعد کے قوانین کی رو سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنا مقام ایک اقلیتی ادارے کی حیثیت سے قائم رکھتی ہے انھوں نے مزید کہا کہ حکومت کی تجویز کے مطابق یہ دفعہ مجوزہ دستور میں قائم رکھی جائے گی۔

مسٹر فخرالدین علی احمد نے بیگ کمیٹی کی سفارشات کو قبول کیا ہے اور اس کا بے شمار موقعوں پر اظہار بھی کیا

مدیر صدق جدید کی رائے

مسلم یونیورسٹی ایکٹ پر آفتابِ صحافت مولانا عبدالماجد دریابادی ایڈیٹر صدق جدید نے ہمارے ایک سوالنامہ کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

(۱) یونیورسٹی اس ایکٹ کے بعد مسلمانوں کی تو بہرحال نہیں رہی۔ اب "سیکولر" یونیورسٹی ہو گئی (۲) پرامن ایجی ٹیشن کرنا لازمی ہے۔ (۳) چانسلر، وائس چانسلر، ارکان کورٹ سب کو مسلمان رہنا لازمی تھا (جیسا کہ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں)، اس میں خلل ۱۹۵۱ء کے ایکٹ نے ڈالا اور اس کی تکمیل تازہ ایکٹ نے کر دی (۴) مضرت مسلمان طلبہ کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ اب کوئی ذمہ داری اس کی نہ رہی نہ تعلیم مسلمانوں کی مرضی کے مطابق ہوگی۔ (۵) تجویز تھی کہ ۱۹۲۰ء والا ایکٹ بحال کیا جائے۔ (۶) یہی یونیورسٹی از سرِ نو مسلم یونیورسٹی بن سکتی ہے۔ اگر یہی قدیم ایکٹ بحال کر دیا جائے ——— عبدالماجد

قصبہ و ڈاکخانہ دریاباد، ضلع بارہ بنکی ——— (یو۔پی)

ہے (مثلاً ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء، ۷ ستمبر ۱۹۷۱ء) انھوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ آنے والے بل میں ان سفارشات کو شامل کیا جائے گا۔ اس لیے یہ جان کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ جناب فخر الدین علی احمد صاحب نے سات سال کے طویل عرصے میں پہلی بار دہلی میں یہ کیسے فرمایا کہ "یہ مطالبہ کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک اقلیتی ادارہ ہے بنیادی طور پر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے اور ایک لادینی جمہوریت کے منافی ہے"۔

بیگ کمیٹی کی رپورٹ کو یو۔پی کے مسلم ممبران اسمبلی نے بھی منظور کیا تھا جن میں سے ۲۴ ممبران نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو مسز اندرا گاندھی کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ ہمیں امید ہے کہ جو بل پیش کیا جائے گا وہ بیگ کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں بنایا جائے گا۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ مذکورہ بالا خط کے چند دستخط کنندگان ہی آج اس ایکٹ کی حمایت کر رہے ہیں جس میں بیگ کمیٹی کی سفارشات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ خود وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بھی ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو سابق طلبا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان کریں گی جو چٹرجی کمیٹی کی سفارشات پر مبنی ہوگی۔ یہ اطلاع ہمیں فخر الدین علی احمد صاحب کے توسط سے ملی تھی۔ اس کے علاوہ لوک سبھا کے گذشتہ الیکشن سے کچھ ہی دنوں پہلے یعنی ۴ جنوری ۱۹۷۱ء اور ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو برقرار رکھا جائے گا (دستورِ ہند دفعہ ۲۹۔۳۰) یہ امر باعثِ دلچسپی ہوگا کہ کانگریس مینوفسٹو کے پیراگراف ۵۴، ۵۵ کے کچھ حصے میں نے خود ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو شری ایچ۔ این۔ بہوگنا کو لکھوائے تھے۔ اس وقت رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے اور یہ کام شریمتی اندرا گاندھی کی قیام گاہ پر ان سے گفتگو کے بعد کیا گیا تھا۔ مسٹر یو۔ ایس ڈکشٹ بھی اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے قبل یعنی ۳ دسمبر ۱۹۷۰ء اور ۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو مسٹر ڈی۔ پی۔ بشرا نے بھی مذکورہ پالیسی سے اصولی طور پر متفق ہونے کا اظہار کیا تھا۔

یہ معلوم کر کے تکلیف ہوتی ہے کہ وزیر تعلیم مسٹر نور الحسن صاحب نے جو بیانات دیئے ہیں اور جو خط طلبا کے والدین وغیرہ کو بھیجے ہیں ان میں اب بھی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ایکٹ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کے تاریخی کردار کو مکمل طور پر برقرار رکھا گیا ہے تعجب ہے کہ یو پی کانگریس کمیٹی کی صدر ڈاکٹر راجندر کماری باجپائی بھی وہی راگ الاپتی ہیں کہ ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء دستور ہند کی دفعہ ۳۰ کے عین مطابق ہے اور یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی گئی ہے۔ آپ خود غور فرمائیے کہ مسٹر فخرالدین علی احمد، مسٹر نورالحسن اور ڈاکٹر راجندر کماری باجپائی مذکورہ بالا اعلانات کی روشنی میں کس طرح ایک دوسرے کے خلاف بیانات دے رہے ہیں۔

(د) مالی امداد اور اقلیتی حقوق

اس دلیل کو کہ چوں کہ حکومت ہند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو کافی مالی امداد دیتی ہے اس لیے انتظامیہ پر اس کو اختیار ہونا چاہیے چھاگلا کمیٹی نے غلط ٹھہرایا ہے چنانچہ پیراگراف ۱۳ کے صفحہ ۱۱۳ پر وہ تحریر کرتے ہیں کہ "جہاں تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی ادارہ ہونے کا تعلق ہے اگر ۱۹۵۱ء کا ترمیمی ایکٹ اس کے اس خصوصی کردار میں تبدیلی نہیں کر سکا تو حکومت کی طرف سے دی جانے والی مالی امداد کی بڑھتی ہوئی رقم بھی کم نہیں کی جا سکتی۔ ملک کی سب سے بڑی عدلیہ سپریم کورٹ نے کیرالہ ایجوکیشن بل پر رائے زنی کرتے ہوئے غیر مبہم الفاظ میں کہا ہے کہ دستورِ ہند کی دفعہ ۳۰ (۱) کے ماتحت حکومت مالی امداد دینے کی بنیاد پر کسی اقلیت کو اس کے حقوق چھوڑ دینے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

پریس میں دہلی کے ایک سیمینار منعقدہ ۱۵ جولائی کی رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کا اختتام اس پر ہوا کہ ایک لادینی جمہوری نظام میں اس مطالبہ کو کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اقلیتی کردار کی حامل ایک یونیورسٹی ہے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ صحیح ہے تو ایسی حالت میں دستورِ ہند کی دفعہ (۲) ۲۹-۳۰ چھاگلا کمیٹی کی رپورٹ اور بیگ کمیٹی

ہندو مسلم نام بدلو

سوشلسٹ لیڈر مسٹر این۔ جی۔ گورے ایم۔ پی نے لکھا ہے کہ:۔

آپ کے مکتوب مورخہ ۲۷ کا شکریہ۔ میرے پاس اتنا فاضل وقت نہیں کہ آپ کے تمام سوالوں کا جواب دوں لیکن میں مختصراً اپنے موقف کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ میں مذاہب سے منسوب تمام اسکولوں ہسپتالوں اور یونیورسٹیوں وغیرہ کو توڑ دینے کے حق میں ہوں۔ ان اداروں کو باقی رکھتے ہوئے مکمل قومی یکجہتی کی امید کرنا فضول ہے۔ پارلیمنٹ کے ذریعہ منظور کیا گیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ محض ایک مفاہمت ہے۔ یہ نہ تو روشن خیال کے لوگوں کو مطمئن کرے گا نہ ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کو بلکہ جب تک حکومت علیگڑھ اور بنارس کی یونیورسٹیوں سے مسلم اور ہندو کے نام نہ خارج کرے گی اس وقت تک وہ خوشامد کی پالیسی پر چلتی رہے گی ــــ این۔ جی۔ گورے (ایم۔ پی)

(سداشیو پیٹھ ــــ پونہ ۳۰)

خرابیِ صحت کی وجہ سے مجبور ہوں

حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی (علی میاں) سوالنامہ کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"افسوس کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل سے اپنی خرابیِ صحت کی وجہ سے معذور ہوں۔ عرصے سے علیل ہوں اور لکھنے پڑھنے کا کام بھی بہت کم ہو پاتا ہے۔"

ابوالحسن علی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

کی سفارشات کو سب سے پہلے دریا بُرد کر دینا چاہیے اور اگر یہی طریقۂ کار کانگریس کی پالیسی سے مطابقت رکھتا ہے تو اس کانگریس راج میں اسی قسم کے ایکٹ کا نفاذ تمام ماتحت ریاستوں میں ہونا چاہیے اور یہ صرف یونیورسٹیوں ہی میں نہیں بلکہ تمام تعلیمی اداروں میں ہونا چاہیے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ تنہا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس مقصد کے لیے کیوں چُنا گیا۔

(۵) جہاں تک کسی قسم کے احتجاج کا تعلق ہے

کوئی رائے دینا مناسب نہیں

دہلی کے میئر جناب کیدار ناتھ ساہنی نے اپنے ۱۱ر جولائی کے خط میں لکھا ہے کہ:-

"آپ کا ۷ر جولائی ۷۲ء کا پتر مجھے ملا ہے۔ دھنیہ واد۔ اس سمبندھ میں میں مہاپور ہونے کے کارن کوئی رائے دینا بھی مناسب نہیں سمجھوں گا۔ کرپیا مجھے کشما کریں۔

کیدار ناتھ ساہنی

میری رائے میں یونیورسٹی کے تاریخی اور اقلیتی کردار کو برقرار رکھنے کی غرض سے سابق طلباء اور دیگر تمام ہمدردان بلاتفریق مذہب و ملت حق بجانب ہوں گے کہ وہ اس تباہ کن ایکٹ کے خلاف اس وقت تک جدوجہد کریں جب تک کہ حکومت اسے واپس نہ لے لے۔

(۶) اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ ملک کے کم و بیش آٹھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت کو تنہا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پورا نہیں کر سکتی لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب تو نہیں ہونا چاہیے کہ اس بنا پر اس کے تاریخی اور اقلیتی کردار ہی کو ختم کر دیا جائے۔ ہمارے پاس ملک میں کم از کم ایک یونیورسٹی تو ہو گی جہاں اسلامی تہذیب و اقدار کے جدید نمونے دیکھے جا سکیں گے اور جس کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ سے ہم اپنے تعلقات استوار رکھ سکیں گے ہماری ذرا سی جدوجہد سے یہ تعلیمی ادارہ عالمِ اسلام کے لیے خصوصاً اور ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے عموماً ایک علمی مرکز بن سکتا ہے۔

حکومت کا نقطۂ نظر خواہ کچھ بھی ہو اور ایکٹ کے علمبردار خواہ کچھ بھی کہیں مجھے یقین ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل ۱۹۷۲ء کے ذریعہ یونیورسٹی کے تاریخی اور اقلیتی کردار کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ مشرقی اور اسلامی تحقیقات کو آگے بڑھانے کے لیے کسی محکمہ کا قیام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اقلیتی ادارہ نہیں بنا تا۔ اس قسم کے ادارے بہت بڑے پیمانے پر بیرونی یونیورسٹیوں میں موجود ہیں۔ یہ ایکٹ پیچھے کی طرف ایک قدم ہے۔ اس نے یونیورسٹی کی خود مختاری کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ یہ طلبا کے لیے نقصان دہ ہے ساتھ ہی ساتھ تمام جمہوری قدروں کے منافی ہے اس ایکٹ کی موجودگی میں اقلیتی کردار کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ●●

کرنل بشیر حسین زیدی

سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی

۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے شروع ہی میں درج ہے کہ

"ہرگاہ کہ یہ قرین مصلحت ہے کہ علی گڑھ میں ایک تدریسی اور اقامتی، مسلم یونیورسٹی قائم کی جائے ......"

یونیورسٹی کے کردار کے متعلق اس کے سوا کوئی بات بالصراحت ایکٹ میں نہیں کہی گئی۔

مولانا شبلی نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

"ہمیں دو حرف از یونی ورسٹی مدعا باشد
کہ ایں سررشتۂ تعلیم ما در دست ما باشد"

اس اصول کی روشنی میں جانچا جائے تو ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کی رو سے یونی ورسٹی کا نظم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہونا صرف اس طرح سمجھا جاسکتا مسلم یونیورسٹی میں اقتدار اعلیٰ کورٹ کو سونپا گیا تھا اور اس کے ممبر صرف مسلمان ہو سکتے تھے اور کورٹ اپنی پسند کا وائس چانسلر منتخب کرتا تھا۔ اسلامی کردار کی دوسری بات یہ تھی کہ ہر مسلم طالب علم کے لیے دینیات کا پڑھنا لازم رکھا گیا تھا۔ اساتذہ اور مسلم طلبا میں مسلمانوں کی اکثریت کے متعلق اس ایکٹ میں کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا، یونیورسٹی کو جو اختیارات دیئے گئے تھے ان میں یہ اختیار بھی شامل تھا کہ وہ مشرقی اور اسلامی تعلیمات کو ترقی دے اور مذہب اسلام کی تعلیم اور اخلاقی و جسمانی تربیت کا انتظام کرے۔

۱۹۵۱ء کے ایکٹ نے جب کہ مولانا ابوالکلام وزیر تعلیمات تھے ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں دو اہم ترمیمیں کیں۔

(۱) کورٹ کی ممبری، مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں رہی

(۲) دینیات کی تعلیم مسلمان طلبا کے لیے لازم نہیں رہی۔

کورٹ کی ممبری کو عام کر دینے اور وائس چانسلر کے انتخاب کا طریقہ بدل دینے سے اگر عملاً نہیں تو قانوناً یونیورسٹی کا نظم صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا ختم ہو گیا لیکن اس کا اقامتی اور مخصوص کردار باقی رہا اور مسلم تہذیب اور اسلامیات کی تعلیم کی سہولتوں میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ ان میں نمایاں اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۵۱ء کے اس ترمیمی ایکٹ کے خلاف مسلمانوں نے کوئی خاص احتجاج نہیں کیا۔

۱۹۶۰ء کے ایکٹ میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں کی گئی جو اس کے اسلامی کردار پر اثر انداز ہوئی ہو۔

آج بھی مسلم یونیورسٹی کا ایک مخصوص کردار ہے۔ اس میں عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات اور دینیات کی اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم کا انتظام ہے۔ ملک بھر میں یہی ایک واحد یونیورسٹی ہے جہاں طلباء دینیات میں ماسٹر اور ڈاکٹر کی سند حاصل کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں ہندوستان کے سیکولر آئین کے ماتحت کسی ادارے میں مذہبی تعلیم کے خرچ کا کوئی حصہ گورنمنٹ برداشت نہیں کرتی لیکن علی گڑھ میں دینیات کے شعبہ کا تمام خرچ سرکاری گرانٹ سے پورا ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی مساجد کی دیکھ بھال، پیش اماموں اور موذنوں کی تنخواہیں، یونیورسٹی کے قبرستان کا انتظام سب گورنمنٹ گرانٹ سے ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی مختلف اقامت گاہوں میں مسلمان طلباء کے لیے ہر قسم کی ضروری سہولتیں آج پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ لہٰذا یونیورسٹی کا تاریخی کردار آج بھی بدستور قائم ہے بلکہ پچھلے بیس سال سے اس کو تقویت پہنچی ہے، البتہ یونیورسٹی کی فلاح و ترقی کی ذمہ داری صرف مسلمانوں کی نہیں ہے، بلکہ سارا ملک اور ساری ہندوستانی قوم اب اس کی ذمہ دار ہے۔ بہت اچھا ہو اگر ہندوستان کے مسلمان اپنی علیحدگی پسندی کی روایت کو ختم کر دیں۔

اس ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشنوں کی تہہ میں سیاسی مصالح کارفرما ہیں" وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں" وہ کچھ حضرات کو بہت ناگوار گزری ہے۔ افسوسناک کی بات ہے کہ ایک عظیم دانش گاہ سے متعلق مسئلہ کو بازار میں لے جایا گیا اور ایجی ٹیشن سے زیادہ تر نقصان اٹھایا

ایک زمانے میں جب ہندوستان میں گنی چنی یونی ورسٹیاں تھیں اور اچھے کالج بھی بہت کم تھے علی گڑھ کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ کھاتے پیتے مسلم گھرانوں کے لڑکے بالعموم علی گڑھ ہی آتے تھے۔ اب یہ صورتِ حال بدل گئی ہے۔ جگہ جگہ یونیورسٹیاں کھل گئی ہیں ہر ہر قصبہ میں کالج موجود ہے۔ پھر سرکاری ملازمتوں کے لیے ہر ریاست کا مطالبہ ہے کہ وہاں کی علاقائی زبان میں تعلیم ہو اور ریاست کی اپنی یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے نوجوانوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت پست ہو گئی ہے اور کم لوگ ہیں جو مقامی یا قریبی کالجوں کو چھوڑ کر اپنے بچوں کو علی گڑھ بھیجنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ اب علی گڑھ میں اکثریت یوپی یا یوپی کے قریب کے طلباء کی ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا انحصار اب صرف علی گڑھ پر نہیں ہے۔ ہر ریاست، خاص طور پر بمبئی اور جنوب ہند میں مسلمانوں کے اچھے معیاری کالج قائم ہو گئے ہیں۔

نئے ایکٹ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے نتیجہ میں تعلیمی اعتبار سے مسلم مفاد کو نقصان پہنچے۔ مسلمان طلباء کے لیے اب بھی جو سہولتیں علی گڑھ میں مل سکتی ہیں دوسری جگہ حاصل نہیں ہو سکتیں۔ نئے ایکٹ کے منظور ہو جانے کی وجہ سے اساتذہ اور طلباء کی تعداد میں مسلمانوں کے تناسب میں کوئی خاص کمی واقع ہونے کی کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ یونیورسٹی کے انتظامات میں البتہ اب باہر کے غیر تعلیمی سیاسی عناصر کی مداخلت کافی حد تک رک جائے گی جو ان عناصر کو ضرور ناگوار ہو گا۔

علی گڑھ کے تاریخی کردار اور مرکزی حیثیت کو برقرار رکھنے اور مستحکم بنانے کے لیے مسلمانوں کو بے کار ایجی ٹیشن کے بجائے تعمیری قدم اٹھانے ہوں گے اور ایسے حالات پیدا کرنے ہوں گے کہ تعلیمی اعتبار سے ہونہار اور ممتاز طلباء جن کی اکثریت لازماً غریب ہو گی، ہندوستان

کے ہر ہر گوشے سے علی گڈھ آ کر کسب فیض کر سکیں گے ایسا تب ہی ممکن ہو سکے گا جب ان کے لیے بڑی تعداد میں معقول رقم کے وظیفے موجود ہوں۔ مسلمان چار کروڑ روپے ہر سال جمع کر کے سرکاری امداد کے بغیر مسلم یونیورسٹی تو نہیں چلا سکتے۔ مگر ایک دفعہ وہ ایک کروڑ کا فنڈ تو جمع کر سکتے ہیں جس کی آمدنی سے ہر سال کئی لاکھ کے وظائف ہونہار اور مستحق طلباء کو دیے جا سکیں تاکہ وہ اپنی مقامی تعلیم گاہوں کی بجائے علی گڈھ میں داخلہ لے کر یہاں کے تاریخی کردار اور اعلیٰ تعلیمی معیار کی بقا میں حصہ لے سکیں۔ اس سلسلے میں اب سے گیارہ سال پیشتر مرحوم ہز ہولی نس ڈاکٹر سیدنا طاہر سیف الدین صاحب کی دو لاکھ روپے کی فیاضانہ امداد سے مسلم یونیورسٹی کے طلباء کو مالی امداد دینے کے لیے ایک فنڈ شروع کیا گیا تھا جس سے ہر سال مستحق طلباء کو ہزاروں روپے کے وظیفے دیئے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ علی گڈھ کے مستقبل کے متعلق پریشان ہیں وہ متذکرہ بالا تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کریں گے۔

■

ظفر احمد صدیقی ایڈوکیٹ سیتاپور

دینی تعلیمی کونسل اترپردیش

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کو ایک عام سرکاری یونیورسٹی کے معیار سے پرکھنے کی کوشش بنیادی غلطی ہے۔ اس ایکٹ کا جائزہ لینے اور اس سے صحیح نتائج اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان اغراض و مقاصد کو سامنے رکھیں جو بانیانِ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے پیش نظر تھے۔

۲۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو لدھیانہ میں تقریر کرتے ہوئے سرسید علیہ الرحمتہ نے فرمایا تھا:

"میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہونے کی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے۔ گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔"

(ماخوذ لکچروں کا مجموعہ۔ صفحہ ۱۵۷)

لکھنؤ میں ایک بار تقریر کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا

"اے دوستو! مجھے یہ بات خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔"

(ماخوذ از لکچروں کا مجموعہ صفحہ ۲۵۹)

۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو جب لارڈ لٹن وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے علی گڑھ آ کر کالج کا سنگ بنیاد رکھا اس موقع پر منتظمین کالج کی طرف سے وائسرائے کی خدمت میں سید محمود نے انگریزی میں ایڈریس پیش کیا جس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:

"کالج جس کا سنگ بنیاد آنجناب (your Excellency) رکھنے جا رہے ہیں اس ملک کے دیگر تعلیمی اداروں سے مختلف ہے۔ اس ملک میں پرائیوٹ اور افراد کے قائم کردہ اسکول اور کالج ہیں۔ ایسے بھی ہیں جن کو حکومت نے قائم کیا ہے اور

آپ تو جانتے ہی ہیں

ہما کے سوالنامہ کے جواب میں نائب مرکزی وزیر داخلہ جناب ایف ایچ محسن نے لکھا ہے کہ:۔

" علیگڑھ مسلم یونیورسٹی بل کے سلسلہ میں آپ کے مکتوب مورخہ ۷ جولائی ۱۹۷۲ء کا شکریہ۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حال ہی میں مذکورہ بل پر اخبارات میں میری آراء شائع ہو چکی ہیں "

ایف۔ ایچ۔ محسن

حکومت ان کا خرچ برداشت کرتی ہے مگر یہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ میں پہلا کالج ہے جس کی بنیاد کسی ذات کی فیاضی و محبت یا حکومت کی سرپرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ پوری مسلم قوم کی مشترکہ کوشش اور خواہشات کا نتیجہ ہے۔ اس کے محرکات وہ حالات ہیں جو اس ملک کی تاریخ میں رونما ہوئے "

(ماخوذ از ایڈریس واسپیچز متعلق ایم۔ اے۔ او۔ کالج۔ مرتبہ محسن الملک)

یہ بات مسلمہ ہے کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج نے ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کرلی۔

ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ تھا۔ سوسائٹی کی دفعہ ۲ اس کالج کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے۔

(اُردو ترجمہ)

" کالج کے قیام کا مقصد دراصل مسلمانوں کی تعلیم تھی۔ ہندو اور دیگر لوگ اس کے ضابطوں کے تحت استفادہ حاصل کر سکتے تھے۔ سوسائٹی کی دفعہ ۱۴۹ حسب ذیل تھی:

(اُردو ترجمہ)

" گورنمنٹ اور ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ کالج کے اندرونی تعلیمی انتظامات، بورڈنگ ہاؤسوں کے انتظامات، کالج کے اسٹاف کی تقرری، برخاستگی اور مذہبی تعلیم کے سلسلے میں مداخلت کرے "

آنریبل مرکزی ممبر تعلیم نے مسلم یونیورسٹی بل پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا:

" اس بل کو پیش کر کے ہم ایک تعلیمی اقامتی یونیورسٹی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ جدید طرز کی یہ یونیورسٹی مسلمانوں کے لیے نعمت ثابت ہوگی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وجود مسلمانوں کے لیے ترقی کی تاریخ میں اہم پارٹ ادا کرے گا۔ مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی کا قیام جس کے دروازے عالمگیر علم کے لیے کھلے ہوں مسلم قوم کی ترقی کی ضامن ہوگی "

چھرجی انکوائری کمیٹی ۱۹۶۱ء نے (جو مرکزی وزارتِ تعلیم کے ایما اور مشورے سے بنائی گئی تھی) اپنی رپورٹ کے صفحہ ۱۲ میں پیراگراف ۱ و ۲ میں یونیورسٹی کی تاریخ اور اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل دیے ہیں:

(اردو ترجمہ) پیراگراف (۱)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی بنیاد علی گڑھ تحریک ہے جسے سرسید احمد خاں نے گذشتہ صدی کے آخری نصف حصے میں شروع کیا تھا۔ سرسید کی کوششوں کی بدولت ایم۔ اے۔ او۔ کالج ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا کالج ترقی کرتا رہا، تعداد اور شہرت بڑھتی رہی۔ آخرکار ترقی کر کے اس نے ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا مقام حاصل

کریبا"

(پیراگراف ۲)

"یونیورسٹی کے سامنے مقصد یہ تھا کہ طلبار کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تہذیب اور خیالات کا تحفظ کیا جا سکے۔"

غرضیکہ یونیورسٹی کے قیام کا مقصد مسلمان طلبا کو صرف اعلیٰ تعلیم دلانا مقصود نہیں تھا بلکہ یہ تعلیم ایسے ماحول میں دلانا مقصود تھا جس میں مسلمانوں کی تہذیب و خیالات کا تحفظ ہو سکے۔ اس کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ یونیورسٹی کے نظم و نسق کا ماحول ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جن کے دلوں میں اسلامی معاشرہ کی عظمت ہو۔

چنانچہ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے بموجب یونیورسٹی کورٹ میں جو اقتدار اعلیٰ کی مالک تھی صرف مسلمان ممبر ہو سکتے تھے۔ اور ۱۹۵۱ء تک ملازمین یونیورسٹی سے تقرری کے وقت ایک عہد نامہ بھروایا جاتا تھا جس کی رو سے انھیں پابند کیا جاتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے اسلامی کردار کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے۔

تمام مسلم طلبار کے لیے مذہبی تعلیم لازمی تھی۔ طلب اور اساتذہ میں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ چانسلر وائس چانسلر کا انتخاب کورٹ اپنے میں سے کرتی یعنی اس کے لیے مسلمان ہونا شرط تھا۔ یہ تھا مسلم یونیورسٹی کا اصل کردار۔ اسے چاہے اقلیتی کردار کہیے یا تاریخی کردار کہیے۔ ۱۹۵۱ء میں ایکٹ کی دفعہ ۲۳ میں جزوی ترمیم کردی گئی یعنی شرط ہٹا دی گئی کہ صرف مسلمان کورٹ کے ممبر ہو سکتے ہیں مگر یونیورسٹی کورٹ بدستور SUPREME رہی۔ GOVERNING BODY اس کی تشکیل میں مسلمانوں کا غلبہ تھا۔ یونیورسٹی اتھارٹیز مسلمان ہی رہیں

اے کے گوپالن ایم پی

مارکسی کمیونسٹ پارٹی

کامریڈ گوپالن کی عدم موجودگی میں انکے سکریٹری نے لکھا ہے کہ:

"شری گوپالن آج کل کیرالا میں ہیں اور وہ کسان تحریک میں بہت مصروف ہیں۔ ۲۰ جولائی کو ان کے دہلی واپس آنے کی توقع ہے جیسے ہی وہ آئے آپ کا خط ان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔"

اس بنا پر باوجود جزوی ترمیم کے علاؤ یونیورسٹی ان مقاصد کی تکمیل کرتی رہی جو اس کے بانیان کے پیش نظر تھے ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے ذریعہ یونیورسٹی کورٹ کے اختیارات ختم کر دیے گئے ہیں اسے بے جان صلاح کار کی حیثیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے جس کے فیصلوں کی پابندی یونیورسٹی اتھارٹیز پر لازم نہیں۔ اس کی تشکیل میں طبقاتی نمائندگی دی گئی ہے۔ مسلم فرقہ کو بحیثیت فرقہ کوئی نمائندگی نہیں دی گئی۔ برخلاف اس کے ٹریڈ یونین ایگریکلچرسٹ اور تاجروں وغیرہ کو نمائندگی دی گئی ہے۔ اس سے حکومت کی منشا صاف ظاہر ہے۔

دستور ہند کی آرٹیکل ۳۰ (۱) میں دیے ہوئے حقوق کا لحاظ تو درکنار یہ کوشش کی گئی ہے کہ یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکٹو کونسل یا اکیڈمک کونسل وغیرہ کی تشکیل میں یونیورسٹی کی علامتی مسلم حیثیت بھی باقی نہ رہے۔ یونیورسٹی کے ماحول کا دارومدار منتظمین کے طرز فکر پر ہوتا ہے۔ ترمیمی ایکٹ میں اس کی بالکل فکر نہیں کی گئی ہے کہ یونیورسٹی کا اسلامی ماحول برقرار رکھنے کے لیے

گجندر گڈکر سابق چیف جسٹس

۱۹۶۸ء میں جب جناب گجندر گڈکر کانووکیشن میں تشریف لائے تو آپ نے یہاں کے طلبا کا نظم و ضبط دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تقریباً پندرہ کانووکیشن میں شرکت کی لیکن میں نے آج تک کہیں ایسا نہیں دیکھا کہ یہاں کی طرح طلبا اتنی دیر تک صبر و سکون اور نظم و ضبط کے ساتھ خاموشی سے شریک رہے ہوں۔"

آپ نے مزید کہا کہ "جبکہ دوسری یونیورسٹیوں میں تعلیم معطل تھی مسلم یونیورسٹی میں شمع علم بدستور روشن تھی۔"

سابق چیف جسٹس نے مزید کہا "یونیورسٹیوں کی خود مختاری کا اصول بہتر ہے بشرطیکہ اس کا استحقاق ہو اور اگر کوئی یونیورسٹی خود مختاری کی مستحق ہے تو مسلم یونیورسٹی ہے۔"

منتظمین ایسے ہوں جن کے دلوں میں اسلامی معاشرہ کا احترام ہو۔ یونیورسٹی ایکٹ کی دفعہ ۸ میں طلبا کے داخلے اور اساتذہ کی تقرری کے لیے آزاد مقابلہ Free Competition کا دروازہ کھلا ہوا ہے صرف اتنا ہی نہیں یونیورسٹی پر یہ پابندی بھی عاید کر دی گئی ہے کہ وہ آفیسرس کی تقرری میں مذہب، ذات یا نسل وغیرہ کی پابندی نہ لگائیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ چانسلر، وائس چانسلر اور دیگر عہدیداران سب غیر مسلم ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے اعلیٰ عہدیداران یعنی چانسلر و وائس چانسلر کی تقرری وزیر کے ہاتھوں میں ہوگی۔ آزاد مقابلہ کے نتیجہ میں جب کہ یونیورسٹی کے آفیسرس [illegible] ہمدردانہ جذبہ رکھتے ہوں، یونیورسٹی میں مسلم طلبا اور اساتذہ کے تناسب کا وہی حشر ہوگا جو پورے ملک کے تعلیمی اداروں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی مثال ہمارے سامنے ہے کیا اس کے بعد بھی علی گڑھ یونیورسٹی مسلم یونیورسٹی کہلانے کی مستحق ہوگی۔ اس سلسلے کا جو سب سے اہم نکتہ ہے اس کو سرکاری حلقے عموماً فراموش کر دیتے ہیں جیسا کہ سرسید کے قول سے ظاہر ہے اس درس گاہ کے قیام کا مقصد محض ڈگریاں دلوانا نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کی مخصوص تہذیب اور اسلامی قدروں کا تحفظ بھی تھا۔ آرٹیکل ۳۰ (۱) میں اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا جو حق دیا گیا ہے اس سے بھی اقلیتوں کی تہذیب اور زبان کا تحفظ مقصود ہے۔ اگر یہ مقصد فوت ہو جائے تو پھر یہ درسگاہ علمی ایسے جسم کے مانند ہو جائے گی جس کی روح سلب کر لی گئی ہو۔ ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے ذریعے بھی منصوبہ بنایا گیا ہے۔ یونیورسٹی کی روح کو برقرار رکھنے کے لیے محض دینیات و اسلامی تعلیمات

وغیرہ کے شعبوں کا وجود کافی نہیں ہے بلکہ ایسے انتظامیہ کی ضرورت ہے جسے ان شعبوں کی افادیت کا احساس ہو۔ یونیورسٹی میں ایسا ماحول ہو جس میں طلبا ان شعبوں کی اہمیت و ضرورت کو محسوس کر کے ان سے استفادہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں کیوں کہ موجودہ قانون کے مطابق مذہبی تعلیم لازمی نہیں بلکہ محض اختیاری ہے

اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اگر کسی تعلیمی ادارے کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ تنہا گورنمنٹ کے سرمائے سے چلتا ہے یعنی نیشنل یا سرکاری ادارہ ہے تو پھر دستورِ ہند کی آرٹیکل ۲۸ (۱) کی رو سے اس میں کسی مذہب کی تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ یہ چیز حکومت کے سیکولرزم کے بھی خلاف ہے کہ وہ کسی نیشنل تعلیمی ادارے میں مذہبی تعلیم کا بندوبست کرے۔ حکومت ایک طرف اسے مسلمانوں کا قائم کردہ ادارہ ماننے کے لیے تیار نہیں بلکہ اس پر مصر ہے کہ یہ بات مان لی جائے کہ مسلم یونیورسٹی مثل دیگر سرکاری یونیورسٹیوں کے ایک نیشنل یونیورسٹی ہے۔ دوسری طرف ایکٹ میں دینیات کے شعبے کو بھی قائم رکھا گیا ہے۔ یہ تضاد ہے جو زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکے گا۔ یا تو اس کی وضاحت کرنا پڑے گی کہ یہ ادارہ مسلمانوں کا قائم کردہ ہے اور گورنمنٹ اسے امداد دیتی ہے یا پھر یہ نمائشی مراعات کسی نہ کسی دن ختم ہو کر رہیں گی۔ مندرجہ بالا مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے وہ پہلو ہیں جن کی اصل زد مسلمانوں پر پڑتی ہے مگر اس کے علاوہ متعدد وہ پہلو ہیں جن کا اثر پورے ملک پر پڑتا ہے۔

مثلاً جمہوریت کے بجائے آمریت

اندرونی معاملات میں یونیورسٹی autonomy کے بجائے حکومت کی دراندازی۔ اساتذہ کی بیچارگی اور طلبا کے جمہوری حقوق کا خاتمہ وغیرہ وغیرہ۔ اس مضمون میں اس کی گنجائش نہیں کہ ان موضوعات پر تفصیل

یونیورسٹی کا اقلیتی کردار باقی رکھا جائے

مسٹر یونس سلیم نے انتخاب میں اپنی ناکامی کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک انٹرویو کے دوران کہا۔

"میں مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو برقرار رکھنے کا حامی ہوں اور اس کے لئے میں نے پوری جدوجہد کی ہے — چنانچہ نام نہاد فرقہ وارانہ فساد بھی علیگڑھ میں کرایا گیا، جس کو میں دراصل سیاسی دنگا کہتا ہوں، اس کے پیچھے دراصل یہی روح کارفرما تھی کہ ان کو میری کامیابی میں مسلم یونیورسٹی کے تعلق سے خطرات نظر آئے اور وہی لوگ فسادات میں پیش پیش رہے جو الیکشن سے چند ماہ قبل علی گڑھ یونیورسٹی کے خلاف علی گڑھ میں تحریک چلا چکے تھے

کماری پدمجا نائیڈو سابق گورنر بنگال

یہ یونیورسٹی اسلامی کلچر کے لاقیمت خزانے کی حفاظت کے لئے قائم کی گئی تھی، جو کہ ہندوستانی کلچر کے منجدھار کے ساتھ ہے۔

سے لکھا جا سکے البتہ اس کا مختصراً تجزیہ دیا جا رہا ہے۔

جمہوریت کے بجائے آمریت اور Autonomy کے بجائے حکومت کی مداخلت

جمہوریت سے مراد یہ ہے کہ اصل اقتدار جمہوری طور پر منتخب شدہ نمائندوں کے ہاتھوں میں ہو، اور اختیارات کی تقسیم اس طرح ہو کہ ہر سطح پر جمہوری طور پر اختیارات منتقل ہوں۔ برخلاف آمریت کا مزاج یہ ہے کہ اختیارات شخص واحد یا واحد جماعت میں مرکوز ہو جائیں۔ پورا ایکٹ پڑھ جائیے۔ صاف نظر آئے گا کہ یونیورسٹی کے نظم و نسق کے سارے اختیارات ایک فرد یعنی وائس چانسلر کو گھما پھرا کر دے دیئے گئے ہیں۔ وائس چانسلر مرکزی وزارت تعلیم کے پسند کا آدمی ہوگا۔ اس طرح یونیورسٹی کے اندرونی معاملات میں حکومت مخل ہوگی اور وائس چانسلر کے ذریعہ اپنی پالیسیوں پر عملدرآمد کرائے گی۔

اساتذہ کی بے چارگی اور طلبا کے جمہوری حقوق کا خاتمہ

یوں دنیا کے دکھانے کے لیے تو یہ کہا گیا ہے کہ یونیورسٹی کورٹ میں اساتذہ اور طلبا کو نمائندگی دی گئی ہے مگر اس کی تفصیلات دیکھیے تو اندازہ ہوگا کہ یہ چیز محض نمائشی ہے۔ یونیورسٹی کورٹ میں اساتذہ کی نمائندگی کے سلسلے میں بیشتر وہ لوگ ہوں گے جو بحیثیت اپنے عہدوں کے نمائندگی کے مستحق ہوں۔ مثلاً ڈینس ہیڈس آف ڈپارٹمنٹ، پرووسٹ وغیرہ۔ یہ سب عہدوں کی تقرری کے سلسلے میں وائس چانسلر کی مرضی کے محتاج ہوں گے۔ مثلاً اسٹیٹیوٹ ۷(۱) کے بموجب وائس چانسلر کو فیکلٹی کے ڈین کے سلسلے میں وائس چانسلر کو مختار کل بنا دیا گیا ہے۔ وہ آزاد ہوگا کہ سینیارٹی یا جونیارٹی کا لحاظ کیے بغیر اپنی پسند کے آدمی کو ڈین بنا دے۔ اسٹیٹیوٹ ۸ کی رو سے وائس چانسلر کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ جس کو چاہے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ بنا دے یہاں تک کہ پروفیسر کی موجودگی میں کسی ریڈر کو ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ بنا سکتا ہے۔

اس طرح اسٹیٹیوٹ ۱۱(۱) و ۱۲(۱) کے بموجب پرووسٹ یا پراکٹر کا تقرر ایگزیکٹو کونسل وائس چانسلر کی سفارشات کی بنا پر کرے گی۔ وائس چانسلر کے ان فیصلوں کے خلاف کوئی داد فریاد نہ ہو سکے گی۔ ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کی دفعہ ۴ کی رو سے یہ پابندی عاید کر دی گئی ہے کہ یونیورسٹی کے کسی آفیسر یا ملازم کے خلاف کسی ایسے معاملے میں جو اس نے ایکٹ، اسٹیٹیوٹ یا آرڈیننس کی منشا کے مطابق نیک نیتی سے کیا ہو کسی قسم کی عدالتی یا قانونی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی۔

ظاہر ہے کہ کسی مسئلے میں وائس چانسلر کی بددیانتی ثابت کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس کا اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس نے فلاں کام یونیورسٹی کے مفاد میں کیا ہے۔ لہٰذا بے چارے اساتذہ اپنی ترقیوں کے لیے عام تسلیم شدہ ضابطوں سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے بلکہ وہ وائس چانسلر کے رحم و کرم کے محتاج ہوں گے۔ یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکیٹو، اور اکیڈمک کونسل میں وائس چانسلر کے چشم و ابرو کے اشارے پر چلنے کے لیے مجبور ہوں گے۔ اس طرح جمہوریت کے نام

پھر یونیورسٹی میں ایک شخصِ واحد کی حکومت ہوگی۔

طلبا کے ساتھ ایکٹ میں جو ستم ظریفی کی گئی ہے وہ بھی بہت دل چسپ ہے۔ طلبا کی منہ بھرائی کے لیے طلبا کو یونیورسٹی کورٹ میں نمائندگی دی گئی ہے مگر ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کی رو سے یونیورسٹی کورٹ کو کوئی اختیار انتظامیہ کو کنٹرول کرنے یا اس میں دخل دینے کا نہیں ہے۔ اس کا کام محض باتیں کرنا اور تجویزیں پاس کرنا ہوگا۔ جن کی پابندی یونیورسٹی اتھارٹیز پر لازم نہیں ہوگی — یونیورسٹی کے انتظامات کے اختیارات وائس چانسلر کے بعد ایگزیکیٹو کونسل اور اکیڈمک کونسل کو ہوں گے۔ ان میں طلباء کو کوئی نمائندگی نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس طلباء کی یونین کی طاقت کو توڑنے اور طلباء میں افتراق پیدا کرنے کی غرض سے اسٹوڈینٹس کونسل بنادی گئی ہے جس کے چیرمین کو وائس چانسلر نامزد کریں گے۔ اس کے بہت سے ارکان وائس چانسلر کے نامزد کردہ ہوں گے اسٹیٹیوٹ ۲۵ میں اسٹوڈینٹس کونسل کے اختیارات اور حدود کار کی وضاحت کردی گئی ہے جبکہ اسٹیٹیوٹ ۴۲ میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ یونین کے حدود کار آرڈیننس کے ذریعہ متعین ہوں گے۔

اسی طرح اسٹوڈینٹس یونین کو جن کے عہدے دار جمہوری طریقوں سے منتخب ہوتے تھے، غیر موثر اور بے کار کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

یوم احتجاج جہاں تک سوال نمبر ۲ کا تعلق ہے آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز کنونشن کونسل کی طرف سے ۱۶ ر جون کو صرف یوم احتجاج منانے کی اپیل اس ہدایت کے ساتھ کی گئی تھی کہ جلوس اور نعروں سے پرہیز کیا جائے، ہر طرح کی اشتعال انگیزیوں سے بچا جائے جلسے صرف ان مقامات پر کیے جائیں جہاں ان کے لیے

ڈاکٹر کے ایل شریمالی
سابق وزیر تعلیم

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ہمارے عظیم قومی اداروں میں سے ایک ہے اور اس کے مقاصد اور روایات ہماری قومی زندگی کا حصہ ہیں۔

سہولتیں ہوں۔ قانون شکنی نہ کی جائے۔ اس سے زیادہ پُرامن طریقہ اظہار ناراضگی کا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کا نام ایجی ٹیشن رکھ کر اس کو سختی سے کچلنے کے لیے حکومت کی طرف سے اقدام ہمارے ملک کی جمہوریت کے لیے انتہائی رسوا کن ہیں۔ آزادی خیال کے حق کو دبانے کی کوشش جمہوریت نہیں آمریت ہے۔ ۱۶ ر جون کو یوم احتجاج پرسکون طریقہ پر پورے ملک میں منایا گیا۔ صرف یوپی میں پولیس، پی۔ اے۔ سی اور مقامی حکام کے کرتوتوں کی بدولت چند مقامات پر اس نے بدنما شکل اختیار کرلی مگر اس کی ساری ذمہ داری یوپی کی حکومت پر ہے۔

اقلیتی کردار کا تذکرہ سوال نمبر ۱ کے جواب میں آگیا ہے لہٰذا اس کی مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

آپ کا آخری سوال یہ ہے کہ کیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرسکے گی؟

یہ سوال اس عام غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی صرف جدید تعلیم کے حصول کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس کا مقصد صرف ڈگریاں دینا تھا۔ اس کے پیش نظر مسلمانوں کی تہذیب۔ زبان اور اسلامی معاشرہ کا تحفظ نہیں تھا۔

اس سلسلے میں یہ حقیقت نہ فراموش کرنا چاہیے کہ مسلمان اس ملک میں ایک مذہبی تہذیبی اقلیت ہیں ان کی تہذیب و زبان و مذہبی معتقدات کے تحفظ کے

اگلا بچہ ہونے سے پہلے

ذرا سوچئے

کیا آپ اس بچے کی
پرورش اچھی طرح
نہیں کرنا چاہیں گے؟

آپ اس کے روشن مستقبل کے لئے اسے اچھی تعلیم دینا چاہیں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ اس کی سبھی ضرورتوں کو پورا کرنا پسند کریں گے۔ لیکن اگر گھر پر جلدی ہی بوجھ بڑھ جاتا ہے تو یہ سب آپ کے لئے آسان نہ ہوگا۔ کیا آپ ایسے حالات سے بچنا نہیں چاہتے؟

دنیا بھر میں لاکھوں لوگ یہی کر رہے ہیں۔ وہ اگلے بچے کی پیدائش اسی وقت تک ٹالتے ہیں جب تک وہ اس کے لئے خود تیار نہیں ہو جاتے۔ نرودھ کی مدد سے یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ مردانہ نرودھ حمل روکنے کا وہ ذریعہ ہے جو دنیا بھر میں مقبول ہے۔ اس کا استعمال نہایت آسان ہے۔ اس سے کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ نرودھ کے ذریعہ آپ اگلے بچے کی پیدائش کو ٹال سکتے ہیں۔

یہ ہر جگہ ملتا ہے۔ 15 پیسے میں 3 (سرکاری امداد کی وجہ سے)

جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان

نرودھ

لاکھوں میں مقبول بہتر اور آسان

جنرل مرچنٹس، کیمسٹ اور ڈرگسٹ، بڑی بڑی دکانوں اور پان و سگریٹ فروشوں کے یہاں بکتا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کیلئے قانون بیگ کمیٹی کی سفارشات کے بموجب بنایا جائے

لیے ایسے تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے جو ان کے زیر نگرانی ہوں تاکہ جدید تعلیم اسلامی ماحول میں دی جاسکے اگر نیچے کی سطح پر ان کے لیے تعلیمی ادارے ہیں تو اونچی سطح پر ان کے لیے یونیورسٹی کی بھی ضرورت ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ایک مذہبی فرقہ کی بھاری اکثریت ہو سرکاری یا نیم سرکاری تعلیمی اداروں میں اکثریتی فرقہ کی تہذیب و زبان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوتا البتہ اقلیتوں کو اپنی تہذیب زبان اور مذہبی معتقدات کے تحفظ کے لیے ان کے مخصوص تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک کے دستور میں اس کی اہمیت و ضرورت کو محسوس کرایا گیا ہے۔ مگر آج یہ کہہ کر کہ مسلم یونیورسٹی سے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پوری نہیں ہوتیں مسلمانوں کو بنیادی حق سے محروم کردیا گیا مسلم یونیورسٹی کی اہمیت و ضرورت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب ہم یہ جائزہ لیں کہ موجودہ نظام تعلیم کے ذریعے کون سی تہذیب و زبان زندہ کی جارہی ہے اور کس کو فنا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مسئلہ صرف تعلیمی ضروریات کا نہیں بلکہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرہ کے بقا کا بھی ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ دیگر تعلیمی اداروں بالخصوص میڈیکل کالجوں اور انجینئرنگ کالجوں وغیرہ میں مسلمانوں کا تناسب کیا ہے اور مسلمان کس طرح تعصب کا شکار ہیں۔

مندرجہ بالا نقطۂ نظر سے اگر ہم ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کا جائزہ لیں تو اس سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح مسلمانوں کے مفاد کو ترقی پسندی کے نام پر نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یونیورسٹیاں ملک میں بہت ہیں۔ اس وقت بھی تھیں جب مسلم یونیورسٹی قائم کی گئی تھی۔ مگر مسلم یونیورسٹی اپنی نوعیت کی منفرد یونیورسٹی تھی۔ اس کو عام یونیورسٹیوں کی سطح پر لانا مسلمانوں کے ساتھ صریحی ناانصافی ہے۔

تجاویز

ایک جمہوری ملک کی یہ سب سے بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اقلیتوں کو خوش و مطمئن رکھے۔ ان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا نہ ہونے پائے تاکہ ملک کے سارے باشندے خوش دلی کے ساتھ ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے سکیں اور اپنی گوناگوں صلاحیتوں سے ملک کو مالا مال کرسکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اقلیتوں سے متعلق امور میں قوانین اقلیتوں کو اعتماد میں لیے بغیر نہ بنائے جائیں۔ اس کے لیے حکومت کے ایک سینیر وزیر فخرالدین علی احمد صاحب کے ذریعہ مسلمانوں کے ماہرین قانون و تعلیم کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی جو بیگ کمیٹی کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو حکومت کے معتمد تھے۔ یہ اطمینان دلایا گیا تھا ـــ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے قانون بیگ کمیٹی کی سفارشات کو حقارت سے ٹھکرادیا گیا ـــ حالاں کہ ملک کی تمام مسلم جماعتوں، اولڈ بوائز، اسٹوڈینٹس یونین اور یونیورسٹی سے ہمدردی رکھنے والے دیگر حضرات نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے قانون بیگ کمیٹی سفارشات کے بموجب بنایا جائے۔ اب بھی مسئلہ کا حل یہی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے لیے قانون جبراً نافذ نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے جذبات کو کچلنے کے بجائے ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے۔ ●●

اجیت پرشاد جین

ایم پی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تاریخی اور اقلیتی کردار کو برقرار رکھنے کی خواہش رکھنے والوں کا کیا مقصد ہے؟ یہ بات ابھی تک اپنی بہترین کوششوں کے باوجود میں نہ سمجھ سکا۔ یونیورسٹی کے مقاصد کی وضاحت ۱۹۲۰ء کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے دیباچہ اور دفعہ ۳ اور ۵ میں کی گئی ہے اور حال ہی میں منظور کئے گئے ترمیمی ایکٹ میں ان دفعات کو جوں کا توں باقی رکھا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو چیز موجود نہیں ہے اُسے آپ ختم نہیں کر سکتے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آئین کی دفعہ ۳۰ کی رو سے کبھی بھی اقلیتی ادارہ نہیں رہی جو دو شرائط نافذ کرتی ہے ایک یہ کہ یہ تعلیمی ادارہ ایک اقلیت کے ذریعے قائم کیا گیا تھا اور اس کا انتظام بھی اس اقلیت کی مرضی سے ہوتا تھا۔ بلاشبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد ۔۔۔ علی گڑھ مسلم اینگلو اورینٹل کالج کی شکل میں اپنے وقت کے عظیم ترین لیڈر سرسید احمد خاں نے رکھی تھی اور اس کی تعمیر مسلمانوں کے عطیات سے ہوئی تھی لیکن خود یونیورسٹی کا نظم و نسق ۱۹۲۰ء کے ایکٹ ا X کی دفعات کے تحت آغاز ہی سے چلا آ رہا تھا۔ ترمیمی ایکٹ نے یونیورسٹی کے بنیادی ڈھانچہ میں کوئی خلل نہیں ڈالا ہے یعنی اس کی کورٹ اکیڈمک کونسل۔ ایگزیکیٹو کونسل۔ چانسلر۔ پرو چانسلر اور وائس چانسلر کو باقی رکھا ہے صرف کورٹ کے آئین میں ترمیم کی گئی ہے۔ اصل معطیان جو تقریباً سب فوت ہو چکے ہیں کی نمائندگی اب اُن کے وارثوں کے ذریعے ہوتی ہے گویا کورٹ ورثہ میں ملی ہوئی جائداد ہو۔ نئے ایکٹ کے ذریعے کورٹ میں معطیان کی نمائندگی ختم کر دی گئی ہے اور اس میں طلبہ کو نمائندگی دی گئی ہے۔ میرے خیال میں وارثوں کو کورٹ کی ممبری سے محروم کرنا ممکن تھا لیکن اصل معطیان کو پہلے سے کم نمائندگی حاصل رہ سکتی تھی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دروازے پہلے ہی دن سے بلا تفریق مذہب و ملت ہر نسل، فرقہ اور طبقہ کے مردوں اور عورتوں کے لئے کھلے رہے ہیں۔ جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں اُن کی فہرست طویل اور جامع ہے اور یہ فہرست اس عظیم ادارہ کے پاکیزہ کردار کی غمازی کرتی ہے۔ یونیورسٹی کے امتیازی پہلو کی نشان دہی ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کی دفعہ ۵ (۲) سے ہوتی ہے جو یونیورسٹی کو مشرقی اور اسلامی علوم کے

فروغ اور مسلم دینیات میں سبق دینے کا اختیار دیتی ہے۔ ایکٹ میں شامل کیا گیا شیڈول شعبہ دینیات قائم کرنے کا انتظام کرتا ہے عربی اور فارسی اور سنی و شیعہ دینیات کے حامیوں اور مخالفوں دونوں کے لئے ایک امتحان ہے۔ انھیں مسلم دھرم، تاریخ اور کلچر کی تعلیم کا اس طرح انتظام کرنا چاہئے کہ اس تعلیم سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو یکساں دلچسپی پیدا ہو۔ اسے نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ مرکزی حکومت یونیورسٹی کے اخراجات کے سب سے بڑے حصہ کا انتظام کرتی ہے ۱۹۷۱ء میں مرکزی حکومت نے تین کروڑ ۴۱ لاکھ روپے یونیورسٹی کے اخراجات کی تکمیل کے لئے دیئے۔ اگر معترضین کامیاب ہوتے ہیں تو یونیورسٹی اتنی ہی مالی امداد کی مستحق ہوگی جتنی دوسرے اقلیتی اداروں کو مل سکتی ہے اور یہ امداد اس وقت تک یونیورسٹی کو چلانے کے لئے کافی نہ ہوگی جب تک مسلم فرقہ خسارہ کو پورا نہ کرے۔ اس بات کا بار بار مطالبہ کیا جا تا رہا ہے کہ ایکٹ X آف ۱۹۲۰ء پر نظر ثانی کی جائے کیوں کہ یہ ایکٹ کئی اعتبار سے بے محل ہو چکا ہے۔ برسوں سے یہ مطالبہ کھٹائی میں پڑا ہوا تھا۔ یہ ضروری ہے کہ مسلم یونیورسٹی اپنے تنگ دائرے سے نکل کر سماجی تصورات میں نئی تبدیلیوں کا ساتھ دے۔ یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کی طرف سے مخالفت ہو لیکن یہ بات افسوسناک ہے کہ وہ سادہ لوح افراد فسادات کا نشانہ بنیں جو یونیورسٹی کی تعلیم سے کوئی واسطہ نہ رکھتے ہوں۔ اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ چیلنج قبول کریں اور جو شرارت ہو رہی ہے اُسے ختم کر کے رکھ دیں۔

میر مشتاق احمد

چیرمین میٹرو پالیٹن کونسل دہلی

آج علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ترمیمی ایکٹ کا بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اپنی تاریخ اور روایت کی وجہ سے اس نے مسلمانوں کو زیادہ مضطرب کیا ہے۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کچھ لوگوں نے ایکٹ کے علمی اور تعمیری پہلوؤں کو لینے کی بجائے جذباتی رویہ اختیار کیا ہے

ایکٹ کے سلسلے میں عام مسلمانوں کی لاعلمی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کی مایوسیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرقہ وارانہ جذبات بھڑکانے کی غیر دانشمندانہ کوشش کی جارہی ہے۔

اے۔ ایم۔ یو کے سلسلہ میں مختلف ایکٹوں اور اس کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد ہم نے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۔

۱۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں میں جدید تعلیم

کتنا سحر
کتنی جاذبیت
یہ سب کمال ہے
افغان
آپ بھلے ہی یقین نہ کریں لیکن یہ سچ ہے۔
افغان کے استعمال سے لحمہ بہ لحمہ مکمل طراوت
حاصل ہوتی ہے۔ اتنی احتیاط ہر کسی کے بس
کی نہیں لیکن یہ ایک راز ہے جس سے آپ
آگاہ ہیں۔
آپ کبھی بھی پسند فرمائیں
say 'aha!' to AFGHAN SNOW!
E. S. PATANWALA, BOMBAY-86.
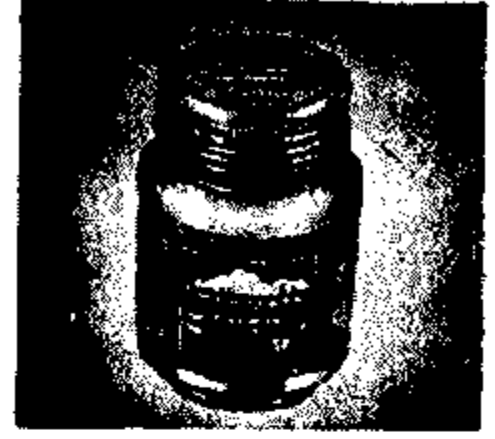
عام کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔

۲۔ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے بانیوں کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس میں اسلامی تعلیمات اور دینیات کی تعلیم کا خاص اور کافی انتظام ہو سکے۔ وہ اس ادارے کو صرف مسلمانوں کے لیے محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء میں جس کے مطابق یونیورسٹی قائم کی گئی تھی واضح طور پر کہا گیا تھا (آرٹیکل ۸) کہ یونیورسٹی کے دروازے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لیے کھلے رہیں گے۔

۳۔ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے تحت کورٹ کی رکنیت صرف مسلمانوں تک محدود تھی۔ اور ۱۹۵۱ء کی ترمیم میں یہ پابندی ختم کر دی گئی تھی۔ لیکن اس کی تاریخ اور روایت کے پیش نظر مسلم مفادات جوں کے توں رکھے گئے۔

۴۔ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے تحت مسلم یونیورسٹی اسلامی علوم اور دینیات میں تحقیق کے لیے خاص سہولیات اور انتظامات فراہم کیے گئے تھے اور مذہبی احکامات پر عمل کرنے کا بھی انتظام تھا۔ یہ سہولیات اور انتظامات ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۵ء دونوں کے ترمیمی ایکٹوں میں باقی رکھے گئے ہیں۔

۵۔ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ سے لے۔ ایم۔ یو کورٹ کسی بھی بیرونی کالج کے امتحان کی منظوری دے دی تھی ۱۹۵۱ء کے ایکٹ میں اس انتظام کو باقی رکھا گیا لیکن اس سے فائدہ اٹھا کر فرقہ پرست عناصر نے یہ مہم شروع کر دی کہ مقامی کالجوں کا یونیورسٹی سے الحاق کیا جائے۔ ان کا مقصد اس کے اقامتی کردار کو تباہ کرنا اور مسلمانوں کے مفادات کو نقصان

میر مشتاق احمد
چیرمین میٹروپولیٹن کونسل دہلی

پہنچانا تھا۔ لیکن کورٹ نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا اور اقامتی کردار برقرار رکھا۔ اس تازہ ترین ایکٹ میں اس انتظام کو ختم کر دیا گیا ہے۔ تاکہ یونیورسٹی کے دشمن فرقہ پرست عناصر اس کے اقامتی کردار کے خلاف مزید سازش نہ کر سکیں اس سے یہ ایکٹ مسلم یونیورسٹی کو حقیقی معنوں میں قومی اہمیت کا ادارہ بناتا ہے۔

۶۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۵۱ء کے ایکٹوں کے تحت کورٹ پر جاگیردار عناصر حاوی تھے۔ ان کی بالادستی کو ۱۹۷۲ء کے ایکٹ کے ذریعہ ختم کر دیا گیا ہے۔ اس ایکٹ میں یونیورسٹی کے ٹیچروں اور طلبار کو زیادہ نمائندگی دی گئی ہے اور پہلی بار یونیورسٹی کے نظم و نسق کے سلسلے میں ٹیچروں کی بالادستی

ہم سینٹرل یونیورسٹی چاہتے ہیں

"ہم سینٹرل یونیورسٹی چاہتے ہیں اور اس کے زیر اقتدار بہت سے کالجوں کے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔" "۱۹۰۴ء" ۱۹۰۴ء

"میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ رائے ظاہر کی ہے کہ علاوہ یونیورسٹی کے ہمیں اوّل درجے کے پراونشل کالج قائم کرنے چاہئیں جو مسلم یونیورسٹی کے ساتھ ملحق کئے جائیں۔" "۱۹۱۱ء" سر آغا خاں مرحوم

قائم ہوئی ہے۔

۷۔ ترمیمی بل منظور کرنے کے وقت یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ یونیورسٹی کے تاریخی کردار کو برقرار رکھا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یونیورسٹی میں اب تک جن آداب پر عمل ہوتا تھا انھیں آئندہ بھی جاری رکھا جائے گا۔ یقین دہانیوں پر عمل کا انحصار ان لوگوں کی نیت پر ہوتا ہے جو یقین دہانی کراتے ہیں۔ ابھی ان لوگوں کی دیانتداری یا غیر دیانتداری کا اندازہ لگانا، نامنصفانہ اور بے بنیاد ہوگا۔

اس پس منظر میں حالیہ ایجی ٹیشن پر غور کرنے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ حسبِ معمول کچھ فرقہ پرست عناصر منفی رویہ اختیار کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ عام طور پر قدیم طلبا نے آگ پر تیل ڈالنے سے گریز کیا ہے۔ قدیم طلبا کا صرف ایک چھوٹا سا طبقہ پیش پیش ہے اور ان لوگوں کو کسی بھی حالت میں یونیورسٹی کے موجودہ اور قدیم تمام طلبا کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا۔ مسلمانوں کو اس دلیل کے ساتھ گمراہ کیا جا رہا ہے کہ یونیورسٹی کو دفعہ ۳۰ اے کے تحت مسلمانوں کا ادارہ قرار دینا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آیا کوئی یونیورسٹی مرکزی حکومت کی دیکھ ریکھ میں زیادہ بہتر طور پر ترقی کر سکتی ہے یا پرائیویٹ انتظامیہ کے تحت۔ گزشتہ ۲۰ برسوں میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی زبردست ترقی اور توسیع اس لیے ہو سکی کہ اسے مرکزی حکومت کی لامحدود امداد ملی۔ کوئی بھی غیر سرکاری ایجنسی اتنی غیر معمولی ترقی اور توسیع نہیں کر سکتی تھی۔

"جو لوگ تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۰ اے کے تحت یونیورسٹی قائم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو بھی بھولتے ہیں کہ آج کے زمانے میں کوئی بھی ایک یونیورسٹی کسی بھی فرقہ کی تعلیمی ضروریات پوری نہیں کر سکتی۔

جہاں بھی امتیازی سلوک ہوتا ہے وہاں اقلیتوں کو زیادہ گھاٹا ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے کسی بھی تعلیمی ادارے میں کوئی بھی امتیازی سلوک نہ ہو، اور جہاں بھی اقلیتوں کے خلاف امتیاز برتا جا رہا ہو وہاں اسے ختم کیا جائے۔ اس تعمیری رخ پر تحریک چلانے کی بجائے مسلمانوں کے لیے ایک یونیورسٹی محفوظ رکھنے" کا نعرہ لگانا۔ ان کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں ہے۔

جہاں تک یونیورسٹی کورٹ کے اختیارات گھٹانے کا سوال ہے یہ ایک ترقی پسندانہ اقدام ہے۔ یونیورسٹی میں اعلیٰ ترین نگراں ادارہ ایگزیکیوٹو ہی ہونا چاہیے اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں ایسا کیا گیا ہے۔ اس طرح امورِ یونیورسٹی میں بیرونی اقدامات ختم ہو جائیں گے۔

لیکن وائس چانسلر کو دیئے گئے غیر معمولی اختیارات سے یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے نظم و نسق کے جمہوری کردار کو ضرب لگے گی۔ پہلے ہی سے موجود اسٹوڈنٹس یونین کے ساتھ ہی اسٹوڈنٹس کونسل کے قیام سے بھی غیر ضروری تنازعہ پیدا ہو سکتا ہے جس کے نتیجہ میں یونیورسٹی

کی ڈسپلن کو نقصان پہنچے گا۔

لیکن یہ معاملے ایسے ہیں جن کا ان لوگوں کی طرف سے اٹھائے جانے والے سوالوں اور اعتراضات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو آج ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن چلا رہے ہیں اور یہ ترمیم بھی حرفِ آخر نہیں ہے۔ اگر عملی طور پہ ہمارے خدشات درست ثابت ہوتے ہیں تو ہمیں ان دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ایکٹ میں مزید ترمیم کرانے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔

ہم علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے عام خیر خواہوں اور اقلیتوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اس معاملہ پر احتیاط کے ساتھ غور کریں اور مسلمانوں اور یونیورسٹی کے حقیقی مفادات کو غلط فہمیوں کا شکار نہ بنائیں۔ ہمیں صرف علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ہی کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کے مجموعی تعلیمی و میں ان کا مناسب مقام دلانے کے لیے بھی جدوجہد کرنا ہے۔ ہم حکومت سے اپیل کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے احساسِ مایوسی کو دور کرنے کے لیے اقدامات کرے گی۔ تاکہ فرقہ پرور عناصر انہیں استعمال نہ کر سکیں۔

مشہور ادیب اور فلم ڈائرکٹر خواجہ احمد عباس

ایکٹ ۱۹۷۲ء بہت اچھا ہے پہلی بار یونیورسٹی کی باگ ڈور نوابوں جاگیرداروں کے ہاتھ سے نکل کر دانشوروں، استادوں اور طالبعلموں کے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ ایسا ہی ہر یونیورسٹی اور ہر تعلیمی ادارے میں ہونا چاہیے۔ حکومت نے صرف ایک غلطی کی ہے۔ اگر علی گڈھ یونیورسٹی کے ساتھ ویسا ہی ایکٹ بنارس ہندو یونیورسٹی کے بارے میں بن جاتا تو خواہ مخواہ مخالفوں اور معترضین کو موقع نہ ملتا کہ حکومت کی نیت پر حملہ کریں۔ مگر مجھے یقین ہے ایسا ہی ایکٹ بنارس یونیورسٹی کے

بدر الدین طیب جی

بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے قومی اداروں کا وجود جنہیں حکومت امداد دینے کا فیصلہ کرے ہمارے سیکولرازم کو معنیٰ اور مقصد عطا کرنے کے لئے اوّلین شرط ہے۔ ان اداروں کا ہرگز یہ مقصد نہیں اور ان کے بارے میں یہ کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ محض قیمتی کھلونے ہیں جن کو دل کو بہلانے کے لئے کسی غالب اکثریت کو یا کسی چیخ وپکار کرنے والی اقلیت کو دے دیا جائے تاکہ وہ خاموش رہے اور مناسب حد تک مطمئن ہوجائے۔ ان اداروں کا مقصد اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

بارے میں پاس ہوگا، اور اس کی باگ ڈور بھی راجوں مہاراجوں سیٹھوں اور فرقہ پرستوں کے ہاتھوں سے لے کر دانشوروں، استادوں اور طالبعلموں کو سونپی جائے گی۔

جہاں تک ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن کا تعلق ہے، یہ تحریک ایک فرقہ وارانہ تحریک ہے اور میں ایسی تحریکوں کا ہمیشہ سے مخالف رہا ہوں۔ بدقسمتی سے بہت سے بھولے بھالے مسلمان فرقہ پرستوں اور فرقہ پرست پارٹیوں کے بہکاوے میں آجاتے ہیں اور ہنگاموں میں شریک ہوکر دکھ اٹھاتے ہیں، دوسری مسلم فرقہ پرست تحریکوں کی طرح یہ تحریک بھی ہندو فرقہ پرستی کو ہوا دے رہی ہے۔

میں فرقہ وارانہ تعلیمی اداروں کا مخالف ہوں۔ لیکن اسلامی تاریخ، اسلامی تمدن، اسلامی کلچر اور اسلامی فلسفہ ہندوستان کی ہمہ گیر تاریخ، تمدن، کلچر اور فلسفہ کا بیش قیمت حصہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان علوم میں علی گڑھ یونیورسٹی ایک قومی ہندوستانی تعلیمی ادارے کی حیثیت سے SPECIALIZE کرے جیسے کہ ہندو تاریخ، ہندو فلسفہ اور ہندو تمدن پر بنارس میں کام ہو۔ ساتھ میں یہ دونوں یونیورسٹیاں جدید علوم، سائنس اقتصادیات وغیرہ کی تعلیم و تحقیق میں قومی ہندوستانی یونیورسٹیوں کی حیثیت سے کام کریں۔ علی گڑھ کے دروازے سب ہندوستانیوں کے لئے کھلے ہوں اور اسی طرح بنارس کے دروازے بھی سب ہندوستانیوں کے لئے کھلے ہوں۔

اس ایکٹ سے مسلمانوں کے تعلیمی مفاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچیگا بلکہ فائدہ پہنچیگا۔

مسلمانوں کو علمی، سیکولر، قوم پرستانہ رویہ اپنا کر ملک کے ترقی پسند نظریات اور ترقی پسند تحریکات کا ساتھ دینا چاہئے، اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ پرانی مسلم فرقہ پرستی کو زندہ رکھنا ہندو فاشزم کو زندہ کرنا اور طاقت پہنچانا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات (دوسری ضروریات مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، آرام تفریح وغیرہ کی طرح) وہی ہیں جو دوسرے ہندوستانیوں کی ہیں۔ اس کے لئے ہزاروں کالجوں اور اسکولوں کی ضرورت ہے جہاں دوسری قوموں کے طالبعلموں کے ساتھ ہندوستانی مسلمان طالبعلم بھی آزادی اور فراغت کے ساتھ موجودہ تعلیم حاصل کرسکیں اور ملک کی تمدنی، اقتصادی، سیاسی زندگی میں حصہ لینے کے قابل بن سکیں۔ مسلمانوں کا (جس طرح ہندوؤں، پارسیوں، عیسائیوں، سکھوں، بدھ مت کے ماننے والوں اور ملاحدوں کا) مستقبل ملک میں سیکولرازم اور سوشلزم کی تحریکوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ان نظریوں اور تحریکوں کو مضبوط بنانے میں ہی ان کی (اور باقی سب ہندوستانیوں کی) نجات ہے۔

●●

کے ۔ ڈی ۔ مالویہ ایم پی

● مجموعی طور پر میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی حمایت کرتا ہوں۔ یہ درست سمت میں ایک قدم ہے اور میری حمایت کی مزید بنیاد اس توقع پر ہے کہ دوسری یونیورسٹیوں کی کارکردگی کم و بیش انہی خطوط پر سدھاری جائے گی۔

● میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن کو ناسمجھی کی بات سمجھتا ہوں۔ اس کی بنیاد جذباتی ہے اور یہ چند اقتصادی و سماجی پہلوؤں پر اکثریتی فرقے کے خلاف طویل احساس شکایت کا ردعمل بھی ہے۔ اور یہ ردعمل بھی صورت حال اور انڈین نیشنل کانگریس اور دوسری ترقی پسند پارٹیوں کے ان لیڈروں کی مسلسل جدوجہد کے سلسلہ میں لاعلمی کا نتیجہ ہے جو سرمایہ داری، روایت پسندی، مذہبی جنون اور کسی کے اپنے کلچر کو پھیلنے کے غلط تصور کو مٹانے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں معترضین یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے جمہوری طرز زندگی اختیار کیا ہے اور متعصب و جنونی طاقتیں ہر جگہ ہیں اور ہم ان کو آمرانہ ڈھنگ سے ختم نہیں کر سکتے۔

● میں اعتراف کرتا ہوں کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو سمجھنے سے اس طرح میں قاصر ہوں جس طرح میں اس فرسودہ تصور کو پسند نہ کروں گا کہ کسی بھی یونیورسٹی پر اکثریت کا کنٹرول ہو۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کی قومیتوں کے فسادات میں ایک نئے سماجی نقطۂ نظر کو فروغ دیا جائے۔ جو واضح طور پر مذہبی عقیدہ اور مذہبی طرز زندگی سے جدا ہو کیونکہ ان دونوں چیزوں کو میرے خیال میں نجی اور خاندانی روابط ہی تک محدود رہنا چاہیے۔

● مجھے یقین ہے کہ اس ایکٹ سے مسلمانوں کے تعلیمی مفادات کو ضرب نہ لگے گی کیونکہ ایک طرف مسلم طرز زندگی کی خوبیاں زیادہ تیزی سے پھیلیں گی۔ اور دوسری طرف علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی صلاحیت کار اس حالت میں بڑھ جائیگی جب وہ ماضی کی اس علیحدگی پسندی کے دائرے سے باہر آجائے گی جو مفادات خصوصی کے نمائندوں کی دین تھی۔

● میری تجویز ہے کہ یونیورسٹی کے بنیادی طرز عمل کا چاہے وہ براہ راست مرکزی حکومت کے زیر انتظام ہوں یا نہ ہوں چند مہینوں کے اندر جائزہ لیا جائے اور ان کی کارکردگی کو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی عام کارکردگی کے طرز پر لایا جائے۔

● مجھے یقین ہے کہ یونیورسٹی کے بدلے ہوئے ڈھانچہ میں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کافی اور بامقصد طور پر پوری ہوں گی۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ اس یونیورسٹی سے مزید کالجوں کے الحاق پر جو پابندی لگائی گئی ہے وہ معقول اور مناسب ہے۔

کے لیے ہے اور اسے مسلمانوں ہی کو چلانا ہے۔
یہ بات عرصے سے چلی آ رہی ہے۔ ایک ادارہ جو عوام کے سرمایہ سے چلتا ہو۔
قومی کردار کے علاوہ کسی اور کردار کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اے ایم یو ایکٹ کو منسوخ کر کے ایک ایسا یکساں ایکٹ بنانا چاہیے جو علی گڈھ اور بنارس یونیورسٹیوں کو اور تمام مرکزی یونیورسیٹوں کا احاطہ کرے۔ دو یونیورسٹیوں کے لیے دو الگ الگ قوانین کا ہونا قوم پروری کے منافی ہوگا۔
● مسلمانوں کا کوئی علیحدہ تعلیمی مفاد نہیں ہے۔ ان کے

جن سنگھ کے پروفیسر بلراج مدھوک

● ۱۹۷۲ء کا علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ نہ اچھا ہے نہ برا۔ یہ مسلم فرقہ پرستی کی خوشامد کے مرادف ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس ایکٹ کے ذریعہ یونیورسٹی کا نظم و نسق بڑے بڑے زمینداروں اور دوسرے جاگیردارانہ ذہنیت رکھنے والوں کے ہاتھوں سے لے کر وائس چانسلر کو سپرد کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو حکومت وقت کا نمائندہ ہوگا۔
● ایجی ٹیشن خود علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف اتنا نہیں ہے جتنا بنگلہ دیش کی آزادی اور پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں امداد دینے کے لیے حکومت کے خلاف ہے۔ یہ اس امر کے اظہار کی ایک کوشش ہے کہ دو قوموں کا نظریہ چاہے پاکستان اور بنگلہ دیش میں مر گیا ہو لیکن ہندوستان میں اچھی طرح زندہ ہے۔
● علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار سے میں یہ مطلب نکالتا ہوں کہ یونیورسٹی مسلمانوں کی ہے، مسلمانوں

مفادات بھی وہی ہیں جو دوسرے ہندوستانیوں کے ہیں۔ جب تک ان میں علیحدگی پسندی کو زندہ رکھا گیا اس وقت تک ہندوستانی مسلمانوں کو نقصان پہونچتا رہے گا اور ان کے خلاف باقی ماندہ ہندوستانی معاشرہ میں غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔
● علیگڈھ، بنارس اور شانتی نکیتن کے لیے یکساں قانون ہونا چاہیے اور ان یونیورسیٹوں سے دس میل کے اندر واقع تمام کالجوں کا الحاق ان سے ہونا چاہیے لیکن مختلف مضامین میں ان کی الگ الگ خصوصیات ہوسکتی ہیں۔ علیگڈھ یونیورسٹی اسی طرح قرون وسطیٰ کی تاریخ اور مغربی ایشیا کے علوم میں خاص تعلیم دے سکتی ہے جس طرح بنارس یونیورسٹی اعلیٰ انجینئرنگ میں اور شانتی نکیتن ہیومینٹیز میں۔
● کسی ایسی خاص یونیورسٹی کا کوئی سوال نہیں پیدا

ہونا جو صرف مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرے۔ تمام یونیورسیٹیاں تمام ہندوستانیوں کی جن میں ہندوستانی مسلمان بھی شامل ہیں، تعلیمی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ صرف مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کیلئے کسی یونیورسٹی کا خیال رجعت پسندانہ اور فرقہ وارانہ ہے۔

سید مظفر حسین طاہر جعدولی

(سکریٹری شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ)

● علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۲ء

اس دانش گاہ کو جدید و مفید ترین تعلیمی اصلاحات سے روشناس کراتا ہے۔ گجندر گڈکر کمیٹی کی جن سفارشات کا ماہرین تعلیم گرم جوشی سے خیر مقدم کر رہے ہیں یہ ایکٹ مسلم یونیورسٹی کے اصل بنیادی کردار کو بدستور محفوظ رکھتا ہے۔

● اس درس گاہ کے بانی سرسید احمد خاں نے اس ادارے کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایکٹ اس دانش گاہ کو قومی تعمیر میں بھرپور تعاون کرنے کے مواقع عطا کرتا ہے جو عہدِ حاضر کی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہ ایکٹ دانش گاہ کو بدلتے ہوئے وقت و حالات کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق ضروری قوانین بنانے میں آزادی دیتا ہے۔ ایکٹ کا لچکیلا پن اس کی خاص صفت ہے۔ اس سے دانش گاہ کے انتظام میں طلبا و اساتذہ کو موثر طور پر حصہ لینے کے مواقع فراہم ہو رہے ہیں۔ اس ایکٹ نے دانش گاہ کے اقامتی کردار کو خاص طور پر محفوظ کر دیا ہے۔ ان ہی تمام وجوہ کے باعث یہ ایکٹ ماہرین تعلیم کے نقطۂ نظر سے مفید ترین اقدام ہے اس لیے ملک کے ترقی پسند عناصر ایکٹ کی بھرپور حمایت کر رہے ہیں۔ میری رائے میں یہ مسلم یونیورسٹی کے مفاد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

دانش گاہ علی گڑھ کے مسئلہ پر بعض مسلم حلقوں کی تحریک حقائق سے زیادہ بے بنیاد باتوں، غلط فہمیوں اور گمراہ کن پروپگنڈے پر مبنی ہے۔ تحریک میں ہوش سے زیادہ جوش کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ تحریک سنجیدہ غور و فکر، ٹھوس دلائل اور حقائق سے زیادہ جذباتی ہیجان کے بل بوتے پر چلائی جا رہی ہے۔ مسلم یونیورسٹی جیسے علم و دانش کے مرکز کے مسائل ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، جذباتی تقریروں اور جوشیلی تحریروں سے دانش گاہوں کے مسائل طے نہیں کیے جا سکتے۔ ماہرین تعلیم پر مشتمل کمیشن برسوں پوری سنجیدگی سے ان مسائل پر غور کر کے ان کے حل پیش کرتے ہیں۔ تحریک چلانے والوں کا یہ کہنا کہ مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں ان کی رائے کو نظر انداز کرنا جمہوریت کے منافی ہے۔ اس لیے درست نہیں کہ تعلیمی اداروں کے انتظام میں تعلیم و تدریس کے مسائل سے کما حقہٗ واقفیت نہ رکھنے والے عوام کی رائے کا ماننا ضروری نہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے مسائل میں عوام کی رائے منوانے کی ضد بالکل غیر دانشمندانہ امر ہے۔ جس کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ بھاکڑہ ننگل باندھ کی تعمیر جیسے ٹکنیکل کام میں بجائے انجنیئروں کی رائے پر عمل کرنے کے جمہوریت کی دہائی دیکر عوام کی رائے منوانے

کی ضد کی جائے۔ میرے خیال میں ایکٹ کے مخالفین مسلم یونیورسٹی
کے مفاد کو پس پشت ڈال کر اپنے ذاتی مفروضات و مفاد
کی بنیاد پر تحریک چلانے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ یہ تحریک
خود مسلمانوں کے لیے بھی بجائے مفید ہونے کے مضرت
رساں ہے۔ اس تحریک سے مسلم یونیورسٹی کو بھی نقصان
پہنچے گا اور یہ ملک کے وسیع تر مفاد کے بھی منافی ہے۔
اس تحریک سے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو شدید
صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس تحریک کو بہانہ بنا کر اکثریتی
فرقہ کے رجعت پسند اور فرقہ پرست عناصر ملک کے امن و
سکون کو غارت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

● علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار ایک غیر
واضح اصطلاح ہے کہ اسکے مفہوم پر خود اقلیتی کردار کے
حامی پوری طرح متفق نہیں۔ اگر اقلیتی کردار کا محض یہ
مطلب ہے کہ اس دانش گاہ کا انتظام صرف مسلمانوں کے
ہاتھ میں دیدیا جائے تو اس مطالبہ کو قبول کرنا ملک میں
علیحدگی پسند عناصر کو تقویت دینے کے مترادف ہوگا۔
مسلم یونیورسٹی آئین ہند کی دفعہ ۳۰ کے تحت آنے والے
اقلیتوں کے ذریعہ چلائے جانے والے اداروں میں نہ تو
خود آئین کی رو سے شامل کی گئی ہے اور نہ سابقہ قوانین
کی رو سے یہ اقلیتی ادارہ ثابت ہوتی ہے۔ سپریم کورٹ
کے فیصلہ کے مطابق بھی یہ اقلیتی ادارہ نہیں بلکہ مرکزی
حکومت کے ذریعہ چلایا جانے والا ایک ایسا قومی ادارہ
ہے جس کے تقریباً تمام و کمال کثیر مصارف (جو ۳ کروڑ
۸۹ لاکھ روپیہ سالانہ تک پہنچ چکے ہیں) مرکزی حکومت
برداشت کر رہی ہے۔ اس کے برخلاف آئین ہند کی
دفعہ ۳۰ کے تحت چلنے والے اقلیتی اداروں کو حکومت
کسی قدر مالی امداد تو دیتی ہے مگر ان کے تمام و کمال مصارف
نہیں برداشت کرتی۔ ایک سیکولر حکومت کیلئے مسلم یونیورسٹی
کو اقلیتی ادارہ مان کر اسکے تمام و کمال مصارف برداشت
کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ اس سے حکومت پر یہ الزام عاید
ہوتا ہے کہ اس نے ایک مخصوص فرقہ کے ساتھ امتیاز برتا
جو سیکولرازم کے منافی ہے اور حکومت کے لیے ملک بھر
میں ایک بہت بڑی تعداد میں قائم تمام اقلیتی اداروں کے
تمام تر کثیر مصارف برداشت کرنا سردست ناممکن ہے۔
لہٰذا مسلم یونیورسٹی کو اگر حکومت ہند سے اپنے تمام تر
مصارف کے لیے کثیر رقم متواتر و غیر متواتر مالی امداد کی
شکل میں حاصل کرنا ہے تو اس کو قومی ادارہ کے بلند
درجے سے گھٹا کر اقلیتی ادارہ بنانا غلط ہوگا۔ اقلیتی ادارہ
بن کر یہ دانش گاہ زبردست مالی بحران کا شکار ہو جائیگی۔
جس سے نہ صرف اس کی آئندہ ہونے والی ساری توسیع و
ترقی مسدود ہو جائے گی بلکہ اس ادارہ کا وجود ہی خطرہ
میں پڑ جائے گا۔ یہ ادارہ مرکزی حکومت سے کثیر رقم
حاصل کر کے ہی آج ترقیوں کی اتنی بلند منزل پر پہونچ چکا
ہے کہ دوسری دانش گاہوں کے لیے مشعل ہدایت کا کام
کر رہا ہے۔ جذباتی تحریروں اور تقریروں سے یہ حقائق
جھٹلائے نہیں جا سکتے۔

ایکٹ مسلمانوں کے تعلیمی مفاد کے کسی طرح منافی
نہیں بلکہ یہ ملی اور ملکی دونوں اعتبار سے مفید ثابت ہو
سکتا ہے۔ ایکٹ کے نفاذ کے بعد وقت خود اس بات کو
ثابت کر دے گا۔ قبل از مرگ واویلا کرنا صحیح طرز عمل نہیں۔

میری رائے میں ایکٹ کے مخالفین کو جذباتی ہیجان
سے محفوظ رہ کر حقیقت بینی سے کام لیتے ہوئے ایکٹ
کے نفاذ کے بعد پیدا ہونے والے نتائج کا انتظار کرنا
چاہیے۔ زیر بحث ایکٹ میں مجھے کہیں یہ بات نہیں نظر آتی
کہ اس کے نفاذ سے مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات
نہ پوری کرے گی۔

●●

پروفیسر سید احتشام حسین

صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی

● میں کسی یونیورسٹی ایکٹ کو دیکھوں تو سب سے پہلے میری نظر اس پر پڑتی ہے کہ ایکٹ یونیورسٹی کے تعلیمی تقاضوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں؟ تعلیم کے قومی معیار سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ تعلیم اور تدریس، تحقیق اور اجتہاد کی راہ میں رکاوٹ تو نہیں پیدا کرتا؟ ملک کی تہذیبی اور جذباتی زندگی سے ہم آہنگی پیدا کر کے ارتقا کی راہ ہموار کرتا ہے یا نہیں؟ تعلیم حاصل کرنے کی آزادی کو سلب تو نہیں کرتا؟ علی گڑھ یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کو میں ان پہلوؤں سے مفید، ترقی پسند اور معقول پاتا ہوں جس میں روایتوں کی توسیع کے پہلو بھی ہیں اور نئی راہیں تلاش کرنے کے تجربوں کی دعوت بھی۔ ایکٹ کا دوسرا مقصد ایک ایسے انتظامیہ کی تشکیل ہونا چاہیے جو تعلیمی مسائل کو سلجھائے، انھیں بروئے کار لانے اور پرسکون تعلیمی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو، اصلاً تو یہ کام اساتذہ اور طلبا کے تعاون سے ہونا چاہیے۔ لیکن انتظامی ضروریات کے لحاظ سے کچھ اور عہدہ داروں اور انتظامی شعبوں کا وجود بھی لازمی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ اس حیثیت سے بھی اہم ہے کیونکہ اس میں اساتذہ اور طلبا کو شمولیت سے اہمیت دی گئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وائس چانسلر کے انتخاب، سرکاری نامزدگیوں کی تعداد، وائس چانسلر کے اختیارات، چند ایسے مسائل ہیں جن پر مختلف رائیں ہو سکتی ہیں میرا خیال یہ ہے کہ وائس چانسلر کو اتنے اختیارات دینے سے نہ صرف اساتذہ کے اندرونی اختلافات بڑھ سکتے ہیں بلکہ خود وائس چانسلر کے دردِ سر میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور غیر معمولی احتیاط کے باوجود "مقامِ شیخ" ابرو بکھلتے رہیں گے، تھوڑے دن کے تجربہ کے بعد اگر ایکٹ کے اس حصہ کی ترمیم کی ضرورت پڑے تو اسے فی الفور انجام دیا جا سکے گا۔

● جو تحریک اس ایکٹ کے خلاف چلائی گئی وہ قطعاً غیر دانشمندانہ تھی۔ عوام نہ یونیورسٹی کی تعلیم سے واقف ہیں، نہ پرانے اور نئے ایکٹ کے فرق کو سمجھ سکتے ہیں، نہ انھیں صورت حال سے آگاہ کیا گیا بلکہ مذہبی اور فرقہ وارانہ رنگ دے کر ان کو اسلام کے بچانے اور سارے ہندوستانی مسلمانوں کے عزت و وقار، ان کے حقوق اور اختیارات کا تحفظ کرنے پر اکسایا گیا۔ ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ تعلیمی لحاظ سے یہ ایکٹ بالکل درست ہے، اس میں اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے اور جاری رکھنے پر کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی ہے بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ اس ایکٹ سے ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی وقار کو زخمی کیا گیا ہے اور وہ مذہبی وقار یہ ہے کہ کچھ لوگ، جن میں سے اکثر تعلیمی مسائل سے بے بہرہ ہوتے تھے، اب کورٹ کے ممبر نہ ہو سکیں گے۔ اس طرح یہ تحریک بالکل غلط راستہ پر چل نکلی۔ اس کی قیادت یونیورسٹی کے اساتذہ یا ملک کے دانشوروں کے ہاتھوں میں ہونے کے بجائے ایسے سیاست دانوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی جن کا نقطۂ نظر کبھی ترقی پسندانہ اور علمی نہیں رہا ہے۔ یہ بات
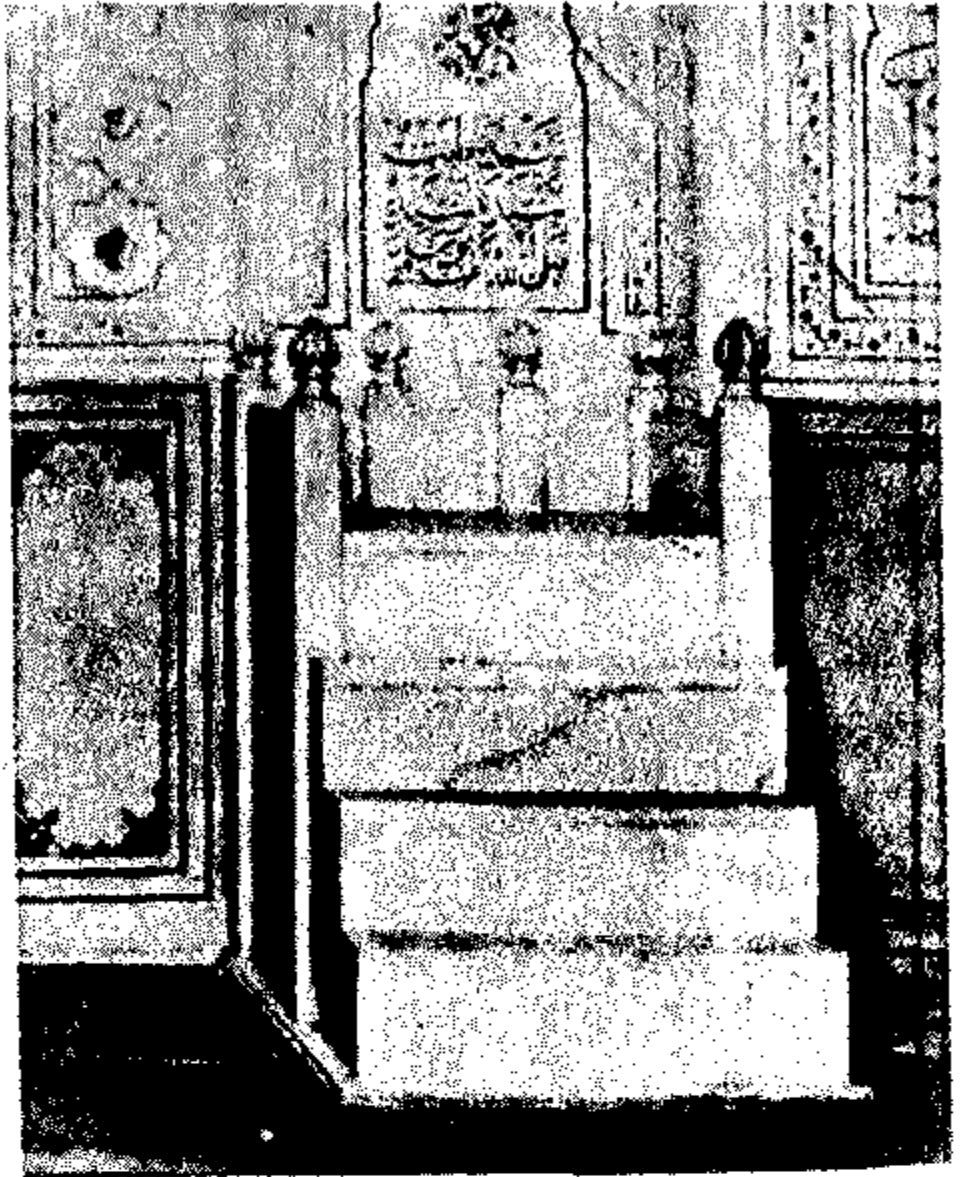
مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد کا ایک گوشہ

ان نتائج سے بھی ظاہر ہے جو احتجاج کے غلط طریقے اختیار کرنے اور جذبات کو بے سوچے سمجھے بھڑکانے سے رونما ہوئے۔

● علی گڑھ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو میں محض گزشتہ چند سالوں کے اندر پیدا ہونے والی تنگ نظر سیاسی صورتِ حال کی ایجاد سمجھتا ہوں۔ نہ اس کا کوئی اقلیتی کردار سرسید کے زمانے میں تھا اور نہ اس کے بعد۔ ہاں مدت دراز تک مخصوص انداز میں تعلیمی نظام چلاتے رہنے کی وجہ سے اس کی کچھ روایتیں ضرور بن گئی ہیں جو تاریخی اسباب کا نتیجہ ہیں۔ اسے اقلیتی کردار کہنا نہ صرف نامناسب ہے بلکہ یونیورسٹی کے پورے تعلیمی ڈھانچوں کو عام قومی ارتقا سے الگ کرنے کی کوشش ہے۔ اس یونیورسٹی میں اسلامی علوم و افکار کی جو تعلیم دی جاتی رہی ہے اور جس میں مزید اضافہ ہوگا وہ یونیورسٹی کو اقلیتی کردار عطا نہیں کر سکتی یہ معاملہ مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کا نہیں نشرِ علم کا ہے، بہت سی غیر ملکی یونیورسٹیاں جن کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، اسلامی تاریخ، تہذیب اور علوم کی اعلیٰ تعلیم دیتی ہیں اور انہیں اسلامی یونیورسٹیاں نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار ہے، جسے برقرار رکھنا چاہیے بلکہ یہ ایک طرح سے اس کے دائرۂ عمل کو محدود کر دینے کے مترادف ہوگا۔

● میرا مشورہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ کہہ کر گمراہ نہیں کرنا چاہیے کہ اب علی گڑھ یونیورسٹی میں کوئی ایسی تعلیم دی جائے گی جو اسلام کے اقلیتی مفاد کے خلاف ہوگی۔ ہم سب کا فرض ہے کہ اسے جدید ہندوستان کی ایک ایسی قابلِ فخر یونیورسٹی بننے میں مدد دیں جس سے اسلامی علوم و افکار کی اشاعت ہو۔ جسے اگر امتیاز حاصل ہو تو ایک اقلیتی یونیورسٹی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اعلیٰ پایہ کی دانش گاہ کی حیثیت سے، جس کے فرزند عالمی امتیاز حاصل کریں ــــ جیسا کہ کہہ چکا ہوں، ان تنظیمی پہلوؤں کو تھوڑے دن تک برتنے کا موقع دینا چاہیے۔ جو تبدیلی سے پیدا ہوں گے، اگر وہ کارآمد نہ ثابت ہوں اور ان سے تعلیم کی توسیع و ترقی میں دشواریاں نظر آئیں تو ان کے بدلنے یا ان میں ترمیم کرنے کی تحریک چلائی جا سکتی ہے۔

● یقیناً یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ان مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرے گا جو اس میں تعلیم حاصل کریں گے۔ ہندوستان میں مسلمان سات کروڑ ہیں، ملک کے ہر گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور بہت سی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ صرف علی گڑھ سے سارے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات تو پوری نہیں ہو سکتیں اس لیے علی گڑھ سے سارے مسلمانوں کی تعلیمی تقدیر کو وابستہ کرنا درست نہیں ہوگا۔

اچاریہ جے۔ بی۔ کرپلانی

میرے خیال میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ایک ترقی پسندانہ اقدام ہے۔ یہ ایکٹ ایسی خطوط پر بنایا گیا ہے جنکی نشاندہی گجندر گڈکر کے منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ذہن نے کی تھی۔ یہ ایکٹ اساتذہ اور طلبہ کو یونیورسٹی کی حکمت عملی میں سرگرم حصہ لینے کے کافی مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہ ایکٹ یونیورسٹی کی نوجوان نسل کے خیالات کی عکاسی کرتا ہے اور ان تمام باتوں کے ساتھ حسب سابق مذہبی تعلیمات کے شعبے بھی برقرار رکھے گئے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے ایک گروپ کی طرف سے ایک مقررہ تاریخ کو ایجی ٹیشن شروع کرنے کا اعلان بہت ہی غیر معقول بات ہے۔ آج کل یوم احتجاج منانے کا اعلان کرنا تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے، وہ تباہی جسکے شکار صرف بے قصور عوام ہوتے ہیں، اور پھر اس فساد کا فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرلینا اور بھی بدنصیبی کی بات ہے۔

اس ایکٹ کی ذمہ داری ہندو فرقہ پر کسی طرح بھی نہیں ڈالی جاسکتی پھر بھی فسادیوں نے اسی فرقے کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا، ایکٹ بنانیوالی حکومت ہے، وہ حکومت جسکو مسلمانوں کی غالب اکثریت نے گزشتہ انتخابات میں ووٹ دیا تھا۔ اتنی بات تو سمجھ میں آسکتی ہے کہ فرقے کا ایک مستقل گروپ سرکاری املاک کو نقصان پہونچائے۔ لیکن ہندو فرقہ پر حملہ کرنا نہ صرف بہت بڑی بد اخلاقی بلکہ سراسر ظلم ہے۔ اس قسم کے ایجی ٹیشن کے برے اثرات ایجی ٹیشن میں صرف حصہ لینے والوں تک محدود نہیں رہتے بلکہ اس سے پورا فرقہ متاثر ہوتا ہے۔ اس طرح وہ قومی یکجہتی بھی جسکی ہر فرقے کے نیک دل لوگ تمنا کرتے ہیں محض خواب وخیال بنکر رہ جائیگی۔

میری رائے میں یونیورسٹیوں کو طلبہ کی زندگی کے ہر اس پہلو سے دلچسپی لینی چاہیے جس سے ان کی عقل و فہم میں تیزی آئے اسی طرح مذہبی تعلیم بھی یونیورسٹیوں میں دیجانی چاہیے مگر اسطرح کہ اس سے انکے ذہن میں جلا پیدا ہو، اس سے جذبات برانگیختہ نہ کئے جائیں، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم وہ دینا چاہیے جو ذہن کو اپیل کرے، نہ کہ جذبات کو۔

آج دنیا کے اندر موجود مذاہب کی تمام مقدس کتابیں کسی خاص فرقے کی جاگیر نہیں ہیں، وہ طلبہ جو اپنے مطالعے کو کسی خاص مذہبی کتاب یا جس مذہب میں وہ پیدا ہوئے ہیں صرف اسی مذہب سے متعلق چند کتابوں تک محدود رکھتے ہیں یقیناً وہ تنگ نظر سمجھے جائیں گے۔ بنی نوع انسان کی بہت بڑی اکثریت اسی مذہب کی پیروکار ہے جس میں وہ پیدا ہوئی۔ حالانکہ وہ اس مذہب سے بہت کم واقفیت رکھتی ہے ہمیں تسلیم کہ آپ کا مذہب تمام مذاہب عالم سے اچھا ہے لیکن اس سے آپ کی شخصیت میں کیا عظمت آئی؟ آپ تو چونکہ اس مذہب پر پیدا ہوئے تھے اسلیے اس کی پیروی کررہے ہیں۔ ہاں اگر علی وجہ البصیرت آپ اپنے مذہب کو بہتر کہتے ہیں تو اس میں بلاشبہ آپ کی عظمت بھی روپوش ہے لیکن میرے خیال میں یہ بصیرت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے

جب آپ اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کریں۔

میں اس بات کے حق میں ہوں کہ تمام یونیورسٹیوں میں مختلف مذاہب کی تعلیمات کا اہتمام ہو، اور ایک لڑکا جس طرح اپنے مذہب سے واقفیت رکھتا ہے اسی طرح دوسرے مذاہب سے بھی واقفیت بہم پہونچائے۔ اور یہ طریقہ میری سمجھ کے مطابق اقلیت یا اکثریت کی مذہبی یونیورسٹیوں کی تمام خامیوں کا سد باب کر دے گا۔

ہندوستان میں مسلمان ہی واحد اقلیت نہیں ہیں بلکہ یہاں عیسائی، بدھ، سکھ، جین اور پارسی بھی رہتے ہیں۔ کسی بھی اسٹیٹ کے لیے مذہبی بنیادوں پر ہر مذہب کیلئے ایک مخصوص ادارہ قائم کرنا بڑا مشکل کام ہے، ایک سیکولر ملک اپنے فنڈ سے صرف ایک سیکولر ادارہ ہی چلا سکتا ہے۔ اگر کوئی فرقہ صرف اپنے مذہب ہی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے فرقے ہی کے خرچ پر چلانا چاہیے۔ پھر مذہبی تعلیم تو ایک کار خیر ہے اور ہر کار خیر اپنی دولت سے ہی انجام پا سکتا ہے۔

●●

ڈاکٹر ظفر امام علیگ

علی گڈھ یونیورسٹی مسلمانوں میں بہ حیثیت تعلیمی ادارے کے ہی نہیں بلکہ مذہبی اور جذباتی وابستگی کی وجہ سے بھی عزیز ہے۔ یہ صفت یقیناً علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے لیے ایک سرمایہ سے کم نہیں لیکن اسی صفت کے باعث مسلم یونیورسٹی کو دوسرے حلقوں میں اکثر و بیشتر تعریف و توصیف اور طنز کا نشانہ بننا پڑا ہے۔ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے سلسلے میں حالیہ بحث و تنقیص اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

جدید ہندوستان کی تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی نے ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک میں ابتدائی اور اہم کردار ادا کیا ہے۔ سرسید مرحوم نے راجہ رام موہن رائے کی رہنمائی کی تقلید کی اور جدید ہندوستان کی اور دیگر تحریکوں کی مانند تحریک علیگڈھ نے بھی ہمارے ملک میں دو طرح کے اثرات قائم کیے منفی اور مثبت ــــ تحریک علیگڈھ کے تاریخی کردار کی یہ نوعیت نہ حیران کن ہے اور نہ ہی کوئی انوکھی چیز۔

موجودہ ہندوستان میں علی گڈھ یونیورسٹی نے ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیاتی بحالی کیلئے اہم ترین کردار ادا کیا ہے اور آزادئ وطن کے دس سالوں کے اندر اندر اس یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک ایسی نئی نسل ابھر کر آئی جو ملک و قوم کی تعمیر نو کے عظیم کام میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ یہ یقیناً یونیورسٹی کا ٹھوس اور تعریفی پہلو ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ منفی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ مسلم یونیورسٹی خاص طور پر شہری علاقوں میں رہنے والی صرف ۲۷ فی صدی مسلم آبادی کی تعلیمی ضروریات کو ہی پورا کرتی رہی ہے جب کہ تمام ملک میں قائم ہونیوالے دیگر کالجوں اور یونیورسٹیوں نے نہ صرف شہری بلکہ دیہی

ہندوستان کی تعلیمی ضروریات بھی پوری کیں۔ اور ان تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنیوالے طلبا میں مسلم طلبا بھی شامل رہے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط تک اس منفی پہلو کے نتیجے میں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنیوالے مسلم طلبا کی اکثریت مغربی اترپردیش کے شہری علاقوں سے تعلق رکھتی تھی۔ اپنے ماضی کے عین برعکس مسلم یونیورسٹی میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے آنیوالے مسلم طلبا کی تعداد اور ان کا تناسب بہت کم تھا۔ لہٰذا ان حالات کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ آج ۱۹۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی کا وہ آل انڈیا کردار ختم ہو گیا ہے۔ یہ چیز یونیورسٹی پر اثر انداز ہوتی ہے اور آج مسلم یونیورسٹی بہت سی وجوہ کی بنا پر مغربی یوپی کی شہری مسلم آبادی میں پائی جانیوالی مشکلات اور ان میں پھیلے ہوئے نظریات کا آئینہ دار بن گئی ہے۔

لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ جدید ہندوستان میں مسلم یونیورسٹی اپنے ان منفی اور مثبت پہلوؤں کی بدولت اپنی پہلی جیسی اہمیت اور برتری کھو چکی ہے تو صحیح ہوگا۔ آج ۱۲ لاکھ کی شہری مسلم آبادی جو کہ ہندوستان کی مجموعی مسلم آبادی کا ۲۷ فیصدی ہے اپنی تعلیمی ضروریات کے لیے صرف علیگڑھ مسلم یونیورسٹی پر ہی انحصار نہیں کرتی بلکہ ملک کے دیگر تعلیمی ادارے بھی ان کی تعلیمی ضروریات کو پورے کر رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یونیورسٹی کے شاندار ماضی سے قطع تعلق کر لیا جائے یا اس کے عظیم کردار سے لاتعلقی کا اظہار کیا جائے بلکہ یہ تو ایک حقیقت کا اعتراف ہے۔

بہرنوع مسلم یونیورسٹی کی ابتدائی برتری اور اہمیت کے کم ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ یونیورسٹی کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور نا ہی اس کا مطلب یہ ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے مالی اعانت اور سرکاری امداد حاصل کرنیوالا صرف ایک تعلیمی ادارہ بنکر رہ گیا ہے اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ایک ہندوستانی مسلمان کے یونیورسٹی سے جذباتی لگاؤ کو نظر انداز کر دیا جائے دراصل ضرورت اس چیز کی ہے کہ وقت کی ضروریات کے پیش نظر آج یونیورسٹی کی نئی لائنوں پر تنظیم کی جائے تاکہ یہ اپنا

ایڈیٹر سنگم غلام سرور

س۔ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ قاتل۔

س۔ انڈیا کے مسلمانوں کے ایک حلقے کی جانب سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے سلسلہ میں چلائے جانے والے ایجی ٹیشن کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ بعد محرم یا حسین۔

س۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج۔ بنیادی اینٹ۔

س۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ایکٹ سے مسلمانوں کے تعلیمی مفاد کو دھکا پہنچے گا؟ اگر ایسا ہے تو کیوں؟

ج۔ لاریب ــــ اظہر من الشمس ہے۔

س۔ کوئی تجویز؟

ج۔ جدوجہد۔

س۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی جملہ تعلیمی ضروریات پوری کرنے کو کافی ہے؟ اگر نہیں تو پھر آپ دوسری کون سی متبادل تجویز پیش کرتے ہیں۔

ج۔ حاشا و کلا ــــ عمل پیہم

رام گوپال

ایم، ایل، سی

مسلمان ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں، ان کے اس مطالبہ پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا جائے کہ یونیورسٹی کے انتظام میں ان کو مناسب حصہ دیا جائے۔

رام گوپال ایم ایل سی
بی کے ڈی، لکھنؤ ۱۰/ جولائی

تاریخی کردار بدستور انجام دیتی رہے۔ میری طرح علیگڑھ کے اور دوسرے پرانے طلبا اپنی درس گاہ کی اس عظیم روایات پر فخر کرتے ہیں کہ ہماری درس گاہ نے ابتدا سے لیکر آج تک وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے۔

یہ ایک اہم اور بنیادی تقاضہ ہے کہ ایک تعلیمی ادارہ اپنی تحقیق و تدریس اور تعلیم کا اعلیٰ معیار برقرار رکھے اور اس کے معاملات نہ صرف انہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہیں جو کہ اس سے براہِ راست وابستہ ہیں یعنی طلبا اور اساتذہ۔ اور اس کے علاوہ یہ سوسائٹی کی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے خوش آیند اثرات قائم کرے یہی وہ اسباب ہیں جو کہ ایک یونیورسٹی کو بناتے ہیں اور اس کا کردار متعین کرتے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء کی اصلاحات اس سمت میں راہ ہموار کرتی ہیں۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی یقیناً ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی ہے جسکے آئین و قوانین ایک کمیٹی کی سفارشات پر مبنی ہیں۔ گجیندر گڈکر کمیٹی کی سفارشات میں ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں کو جمہوری بنانے کیلئے اقدام کیے گئے ہیں اور ان اداروں میں تعلیم و تحقیق کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ صرف ان سفارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے چاہیے تو یہ تھا کہ محبانِ علیگڑھ اس ایکٹ کو خوش آمدید کہتے۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اپنا تاریخی کردار اسی حالت میں بدستور انجام دے سکتی ہے جبکہ یہاں تعلیم اور ریسرچ کا ایک اعلیٰ معیار برقرار رکھا جائے اور اس کے انتظامیہ کو جمہوری بنایا جائے۔ اس بل میں یونیورسٹی کے اقامتی کردار کو برقرار رکھنے کے علاوہ یونیورسٹی کے انتظامیہ میں طلبا کی شمولیت کی گنجائش رکھی گئی ہے اور یونیورسٹی کے انتظام و انصرام اور منصوبہ بندی کے معاملات میں اساتذہ کی اکثریت اور تعلیم و تحقیق کے نئے مرکز قائم کرنے اور نئے کورس شروع کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ایکٹ کے یہ پہلو یقیناً یونیورسٹی کیلئے خوش آیند ہیں۔ اگر یونیورسٹی علوم مشرقیہ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا چاہتی ہے تو اس پر کوئی بندش عائد نہیں کرسکتا۔ لہٰذا میرے خیال میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے تاریخی کردار کو برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ پورے ہندوستان میں یہ ایک مثالی یونیورسٹی بنے اور اپنی اعلیٰ تعلیم و تحقیق سے ملک کی سیکولر سوسائٹی کو مضبوط کرے۔

ظاہر ہے کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اپنا یہ تاریخی کردار صحیح معنوں میں ادا نہیں کرسکتی اگر اسکو صرف مسلمانوں کا ہی تعلیمی ادارہ قرار دیدیا جائے یا پھر مسلمانوں کی شہری آبادی اور وہ بھی خاص طور پر مغربی اتر پردیش کی مسلم آبادی سے وابستہ رکھا جائے۔ دراصل اسوقت یونیورسٹی کے لیے مسئلہ یہ ہونا چاہیے کہ دیہاتی علاقوں میں رہنے والی ۳،۷ فی صد مسلم آبادی کیلئے اس کے پاس دینے کو کیا ہے اور تعلیم و تربیت کے معاملے میں غیر مسلم طلبا کے ساتھ کس طرح امتیاز برت سکتی ہے جبکہ یہ یونیورسٹی اپنی ابتدا سے لے کر
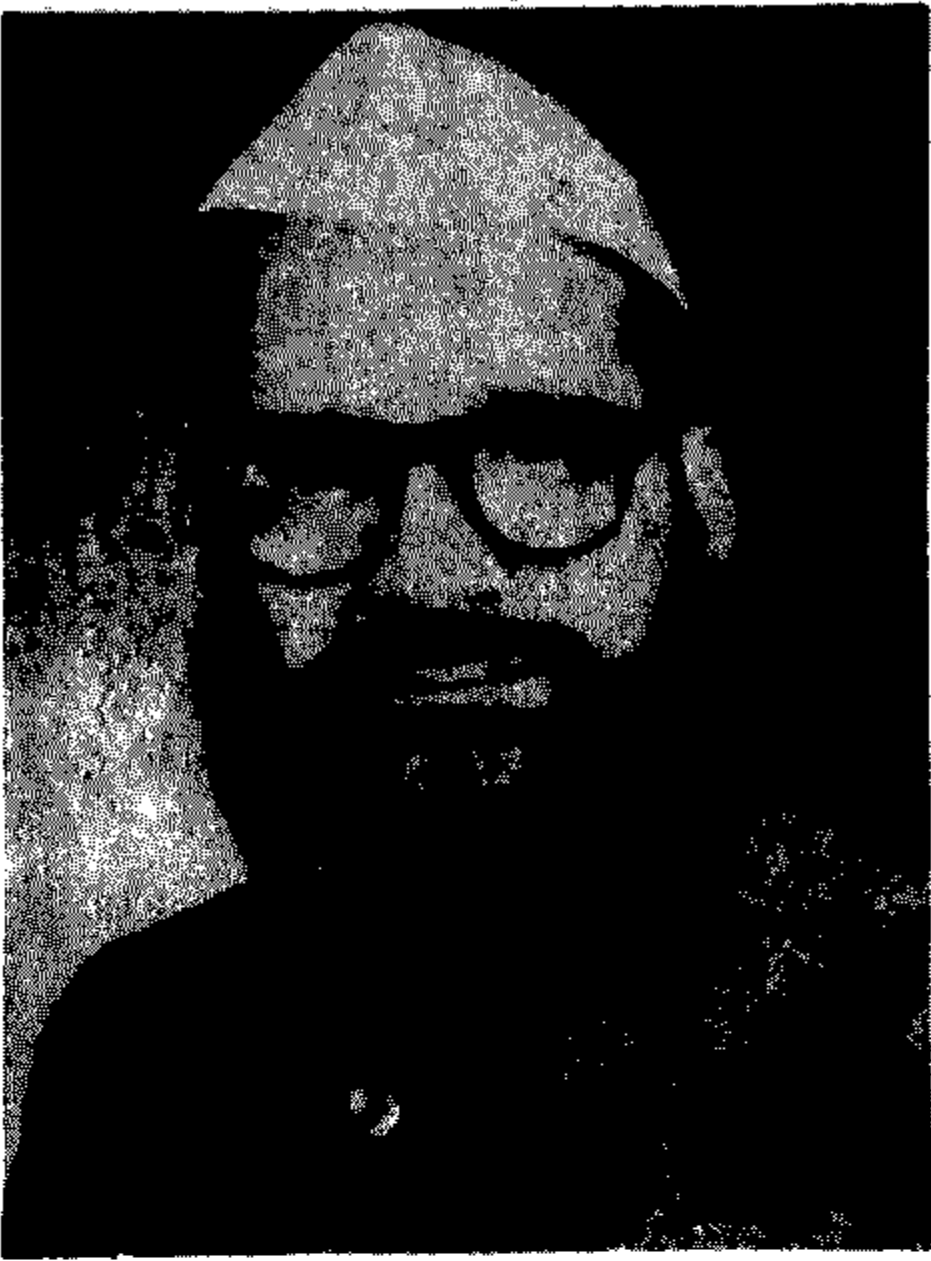
آج تک ہر قسم کے مذہبی تعصب اور امتیاز کے خلاف رہی ہے۔

اس ایکٹ کے خلاف شور و غل اور بحث و مباحثہ کی فضا جن بنیادوں پر تیار کی گئی ہے وہ سراسر غیر تعلیمی ہیں۔ ایکٹ کی مخالفت میں دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں پہلی یہ کہ بحیثیت تعلیمی ادارے کے اس کا اقلیتی کردار تبدیل ہو جائے گا کیونکہ یونیورسٹی کے انتظامی اور انصرامی معاملات اور کورٹ میں معطیان اور قدیم طلبا کی انجمن کی نمائندگی کم کر دی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے یونیورسٹی کا مسلم کردار ختم ہو گیا ہے۔ دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایکٹ میں مسلم یونیورسٹی کو ایک مسلم ادارہ اعلان نہ کر کے مسلم قوم کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے اور پارلیمنٹ نے بل پاس کر کے اقلیتوں کے حقوق کی خلاف ورزی کی ہے۔

اس سے پیشتر کہ ان دلیلوں کے حسن و قبح اور نقائص پر غور کیا جائے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ ان دلیلوں کا یونیورسٹی کے تعلیمی کردار سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی بحیثیت تعلیمی ادارے کے یونیورسٹی کے کردار پر توجہ دلائی گئی ہے، جبکہ ان دونوں دلیلوں سے یونیورسٹی کی کارکردگی اور اس کا معیار متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہر حال ایکٹ کی مخالفت کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اتنی اہم چیز کا نظر انداز کر دیا جانا کوئی حیران کن چیز نہیں ہے۔

ایکٹ کے مخالفین کی پہلی دلیل اس غیر واضح اور مبہم مفروضے پر قائم ہے کہ کسی یونیورسٹی کے کردار کا تعین اس کے منتظمین کے مذہبی رجحانات سے ہوتا ہے۔ یہ ایک سراسر غلط خیال ہے، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ اور علوم مشرقیہ کی تدریس کیلئے عیسائی اساتذہ کا تقرر ہوا۔ اسکے علاوہ یونیورسٹی میں غیر مسلم طلبا اور اساتذہ کی ایک اچھی خاصی تعداد اس حقیقت کا ایک سادہ سا ثبوت ہے کہ کسی یونیورسٹی

مولانا اسحاق سنبھلی ممبر پارلیمنٹ

مسلم یونیورسٹی کو مسلم کلچر کا سینٹر بنانا ضروری ہے صرف نام میں لفظ مسلم سے کام نہیں چلے گا۔ بڑے شوق سے علی گڑھ سے مسلم اور بنارس سے ہندو کا لفظ نکال دیجئے۔

(اقتباس پارلیمنٹ کی ایک تقریر سے)

کے کردار کا تعین اسکے طریقہ تعلیم سے ہوتا ہے گجندر گڈکر کمیٹی کی سفارشات میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ، فلسفہ، اسلامی تاریخ اور تہذیب و تمدن کی تعلیم و تدریس کے اعلیٰ معیار کی تعریف کی گئی ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ نہ صرف اس معیار کو برقرار رکھا جائے بلکہ اسکو مزید فروغ دیا جائے۔ یہ مسلم یونیورسٹی کا ایک خاص کردار

ہے جسکو ہر حال میں برقرار رکھا گیا ہے۔

آج حالات یکسر بدلے ہوئے ہیں اور ان حالات میں بھلا کون معطیان کی خصوصی نمائندگی کیلئے کوشاں ہوگا۔ مزید یہ کہ آج کتنے مسلمان موجود ہیں جو یونیورسٹی کی انتظامیہ میں بطور معطی ایک سیٹ خریدنا چاہیں گے اور جہاں تک علیگڈھ کے قدیم طلبا، کی انجمن کی نمائندگی کا سوال ہے اسکو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے بلکہ مناسب اور موزوں نمائندگی دی گئی ہے۔

بہر نوع اس مسئلہ کے پس پشت یونیورسٹی کے انتظامیہ میں مسلمانوں کو اکثریت اسلیے دلانا مقصود ہے کیونکہ انہوں نے اپنے خون پسینے سے اس کو تعمیر کیا ہے یہ خالصتاً ایک جذباتی دلیل ہے جسکو اگر بفرض محال تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کا کوئی آخر نہیں ہوگا، لال قلعہ، تاج محل وغیرہ کی مانند علیگڈھ مسلم یونیورسٹی بھی ہمارے قومی ورثے کا ایک حصہ ہے۔ اسکے علاوہ اسطرح کی کوئی بندش نہیں لگائی جارہی ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو تعلیم کے حصول کے لیے علیگڈھ نہ بھیجیں اور نہ ہی یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ کوئی مسلمان اس کا وائس چانسلر نہیں بن سکتا یا اس کی فیکلٹی کا کوئی مسلم ممبر اس کی انتظامیہ کمیٹیوں کا ممبر نہیں بن سکتا۔

اس ایکٹ کی مخالفت کے سلسلے میں دی جانیوالی دوسری دلیل ہمارے ملک کے سیاسی، سماجی ڈھانچہ میں اقلیتوں کو دئے گئے حقوق سے متعلق ہے اس سلسلے میں آئینی طریقوں کی بحث میں پڑنا فضول ہے اور یہ موجودہ مسئلہ سے غیر متعلق بحث ہوگی بس مختصراً یہی کہنا کافی ہوگا کہ ہمارے آئین میں لفظ اقلیت کی کہیں بھی تعریف نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ آئین میں ہر صورت میں تمام شہریوں کو مساوی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ آئین اس بات کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ کوئی بھی شہری کوئی ادارہ قائم کرسکتا ہے اور اس کا انتظام وانصرام کرسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ آئین حکومت کو اس بات کے لیے مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ کسی بھی ایسے ادارے کی جو کہ صرف کسی ایک خاص طبقے یا جماعت کی خدمت کرنا چاہتا ہے مالی امداد کرے۔ لہٰذا علیگڈھ کو ایک اقلیتی ادارہ قرار دینے کا مطالبہ کرنا سراسر غلط ہے جس کی کوئی بھی حکومت تعمیل نہیں کرسکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہے ہیں دراصل ان کے اپنے کچھ ذاتی مفاد ہیں جو وہ جمہوریت بچاؤ کے خوبصورت نعروں میں چھپائے ہوئے ہیں۔

ایکٹ کے مخالفین کے نقطۂ نظر کو بغور سمجھنے کی کوششوں کے باوجود ذاتی مخالفت کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ماسوائے اسکے کہ ایکٹ کی مخالفت میں ان کا مفاد پوشیدہ ہے یا اس کے پس پشت کچھ اور عناصر کار فرما ہیں۔ اس طرح اس بل کے مخالفین اپنی کم فہمی اور تنگ نظری کی بدولت نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کی بلکہ خاص طور پر علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کو اس امر کا یقین کرلینا چاہیے کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اپنی تمامتر اہمیت کے باوجود ان کے مسائل کے حل کا ذریعہ نہیں ہے۔ آج ان کے سامنے بے انتہا اہمیت کے مسائل درپیش ہیں جن کو حل کرنے کیلیے انہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ ان حالات میں اس ایکٹ کی جو یونیورسٹی کے لیے یقیناً بہتر ہے، مخالفت کرنا بے معنی ہے۔ مناسب تو یہ ہے کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کو اپنا کام کرنے دیا جائے وہ عظیم کام، جو اس نے ماضی میں انجام دیا ہے اور مستقبل میں بھی انجام دینا ہے۔ ★

انیسویں صدی کا ہندوستان اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے لحاظ سے سترھویں اور اٹھارویں صدی کا زائیدہ تھا لیکن ہر زمانی تسلسل کی طرح نہ تو خالص ارتقائی، نہ خطِ مستقیم کی طرح سیدھا۔ روایتوں کی سخت جانی، تہذیبی اثرات کے اختلاط، معاشی تغیرات اور سیاسی حالات نے ایسے پیچیدہ، مرکب اور متضاد عناصر پیدا کر دیے تھے کہ تصورات اور اقدار کے نئے نئے حلقے بن گئے تھے جو زوال پذیر معاشی حدوں کے اندر اپنے پجاری رکھتے تھے۔ یہ ہل چل اور اضطراب، بننے اور بگڑنے کی یہ جدوجہد اور کشمکش نہ بے معنی تھی اور نہ اتفاقی بلکہ اس کے اندر مرنے اور پیدا ہونے کا کرب تھا، کسی سانچے میں ڈھل جانے کی بے چینی تھی، بگاڑنے کا غم اور خوف اور بنانے کا احساس اور ولولہ تھا اور یہ سب کچھ صدیوں کے کچلے ہوئے ارمانوں اور خوابوں، مشرق و مغرب کے تصادم سے پیدا ہونے والے تاریخی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔ اس حرکت اور ذوقِ نمود کی ایک شکل وہ تحریک تھی جو "علی گڑھ تحریک" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ یہ تحریک ہندوستان کے اس عام دورِ بیداری کا ایک جزو تھی جسے کبھی کبھی نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ گیری اور نئے شعوری اثرات اور مطالبات کے لحاظ سے یہ دورِ تغیر ہندوستان کی کسی اور تحریک سے مماثلت نہیں رکھتا تھا بلکہ اگر کہہ سکیں تو "نشاۃ اولین" تھا جسے عام گفتگو میں "دورِ جدید" کہتے ہیں۔

اب اگر ہم علی گڑھ تحریک کو ایک بڑی تحریک کا "جزو" قرار دیتے ہیں تو منطقی زبان میں گفتگو کرنے کے لیے ہمیں "کل" کی خصوصیات کو پیش نظر رکھنا ہوگا تاکہ تحریک کے ہر پہلو پر نگاہ جا سکے اور محرکات کے سرچشموں کا پتہ چل سکے۔ عمرانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس دورِ بیداری اور تہذیبی تحریک کی بنیادوں کا

مطالعہ ہندوستان کی سیاسی، مذہبی، فلسفیانہ، تعلیمی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی تاریخ کے تمام پہلوؤں کے مطالعہ پر حاوی ہے، اسی لیے اس کو اتنی اہمیت حاصل ہے۔ اس مختصر سے مقالے میں علی گڑھ تحریک کی تاریخ، اس کی وسعت یا اس کے اثرات مابعد سے بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے وجود میں آنے اور عہد جدید کے دور اولین میں ایک انقلاب خیز اور عہد آفریں قوت بن جانے کا تجزیہ ہے۔ تجزیہ خیالوں کا بھی ہوتا ہے اور مادی حقائق کا بھی، لیکن اولیت مادی حقائق ہی کو حاصل ہوتی ہے کیوں کہ خیال کے دائرۂ عمل کے لیے زمان ومکان کے حدود لازمی ہیں۔ انھیں حدوں کے اندر رہنے، انھیں چھو لینے یا ان سے باہر نکلنے میں خیال، خیال بنتا ہے۔ اس لیے پہلے حقائق کی مادی بنیادوں کو سمجھنا چاہیے تاکہ وہ تصورات بھی سمجھ میں آ سکیں جو ان کا عکس ہیں۔ اس طرح جو خیالات وجود میں آتے ہیں وہ مادی حقائق کو بدلنے یا بہتر بنانے میں معاون ہوتے ہیں لیکن ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک مادی حقائق کا تعلق ہے انھیں گرفت میں لانا بھی بہت آسان نہیں ہے کیوں کہ مسلسل حرکت ان کو بدلتی اور دوسرے حقائق سے ان کے رشتے میں تغیر پیدا کرتی رہتی ہے۔ کوئی شخص جو تغیر لانے والے تمام اہم عناصر پر نگاہ نہیں رکھتا اور ان عناصر کے منفی اور مثبت رشتوں کو سمجھنے میں ایک معروضی نقطۂ نظر اختیار نہیں کرتا وہ حقائق کی صحیح توجیہ نہیں کر سکتا۔ واقعات کے آگے بڑھنے میں رشتوں کی ترتیب بدلتی ہے۔ بعض عناصر کی نفی ہو جاتی ہے، بعض نئے عناصر داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح حقیقت اپنے مادی مفہوم میں نئی ہو جاتی ہے اور خیالوں کے لیے نیا مواد فراہم کرتی ہے۔

علی گڑھ تحریک کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس مختصر تمہید کی ضرورت تھی کیوں کہ ہر تحریک ایک مسلسل تہذیبی عمل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں قدروں کی آزمائش ہوتی ہے اور نتائج کے لحاظ سے اس کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جس نے نئے حالات کی طرف رہنمائی کی وہ تاریخی واقعات کی وہ ترتیب ہے جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان میں رونما ہوئی اور جو خود گزری ہوئی صدیوں کا خمار اپنے وجود میں رکھتی تھی۔ مختصراً اس کی شکل یہ تھی کہ ہندوستان میں صدیوں سے مسلمان بادشاہوں کی حکومت قائم تھی جو ایک مفہوم میں تو ضرور اسلامی حکومت کہی جا سکتی تھی، لیکن درحقیقت وہ دنیا کی ہر اس حکومت سے ملتی جلتی تھی جس کا مرکز بادشاہ کی ذات ہوتی ہے جس میں کسی نہ کسی شکل کی جاگیرداری، یا جگنداری یا ایسا ہی نظام محاصل وجود میں آتا ہے۔

سولھویں صدی میں مغل حکومت کے قیام سے لے کر اٹھارویں صدی میں نادر شاہ کے حملے تک، یعنی دو صدیوں سے زیادہ تک ہندوستان بیرونی مداخلت سے آزاد رہا۔ پھر اندرونی انتشار بھی شروع ہوا اور بیرونی حملے بھی جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مرکزی حکومت کمزور ہو رہی ہے۔ اندر وہ قومی عناصر مختلف شکلوں میں ابھر رہے تھے جنھیں دبے دبے رہنا پڑا تھا یا مختلف ذرائع سے جنھوں نے کسی علاقے میں اپنی معاشی تنظیم کر لی تھی۔ اگرچہ بعض مورخین نے اسے مسلمان حکومت کے خلاف ہندو قوم کی بیداری کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی یہ نوعیت نہیں تھی۔ انفرادی طور پر یہ خیالات کچھ لوگوں کے یہاں پائے جاتے رہے ہوں تو اور بات ہے ورنہ قومی سطح پر ان کی حیثیت فرقہ وارانہ

یا مذہبی نہیں تھی۔ اندرونی کشمکش نے یہ شکل بعد میں اختیار کی۔ خالص تاریخی نقطۂ نظر سے اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے جس نئی طاقت نے سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی وہ انگریز تھے جو اس طرح ہندوستانی زندگی پر چھاتے جا رہے تھے اہمیت کا مرکز ثقل اب مغل حکومت نہیں تھی، نہ بنگال، نہ اودھ نہ مرہٹے، نہ نظام، نہ میسور، نہ سکھ اور نہ کوئی اور اب سیاسی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی حقیقی طاقت رکھتی تھی۔ انیسویں صدی کے اولین نصف حصے میں بڑی بڑی تاریخی تبدیلیاں نہیں ہوئیں لیکن آہستہ آہستہ ساری قوت انگریزی کمپنی کے ہاتھوں میں سمٹ گئی اس قوت کا سرچشمہ اگر صرف اندرونی لڑائیوں اور ان میں ہونے والی فتوحات کو قرار دیا جائے تو یہ بڑی غلطی ہوگی کیوں کہ اس طرح کی لڑائیاں اور خانہ جنگیاں پہلے بھی ہوتی رہی تھیں لیکن ان سے ہندوستان کا معاشی نظام اس طرح نہیں بدلتا تھا کہ توازن قوت میں اس کی وجہ سے فرق آجائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل ہندوستان کی معاشی اور اقتصادی زندگی میں بالکل نئی نوعیت رکھتا تھا۔ اس وقت اس سے بحث نہیں کہ انگلستان کا اقتصادی نظام کیا تھا، ہندوستان کے نقطۂ نظر سے جاگیردارانہ نظام ٹوٹ رہا تھا۔ دیہی معیشت جو صدیوں سے انقلاب کے ہر ریلے کو برداشت کرتی آئی تھی، متغیر ہو رہی تھی، تھوڑی بہت دستکاری اور صناعی جو کسی بڑے صنعتی سانچے میں نہیں ڈھل سکتی تھی ختم ہو رہی تھی اور ہندوستان کچے مال کی منڈی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی سرمایہ داری سے شروع کیا تھا اور دوسری بیرونی سرمایہ دار کمپنیوں سے مقابلہ کرکے ہندوستان میں برطانوی استحکام کی تکمیل کی تھی۔

خود برطانیہ کا صنعتی انقلاب کس حد تک ہندوستان کی دولت اور انقلاب پیداوار کا رہین منت تھا اور کس حد تک خود وہاں کی رفتار ارتقا کا نتیجہ تھا یہ بھی برطانیہ کی سماجی تاریخ کا ایک اہم مسئلہ ہے لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس صنعتی انقلاب نے ہندوستان کی صنعت کو ختم کرکے اس کی ترقی کی فطری رفتار کو بھی روک دیا یہاں کے بادشاہوں، نوابوں، امیروں اور حاکموں کا یہ حال تھا کہ وہ زوال کے دلدل میں پھنسے ہونے کی وجہ سے نہ صرف میدانِ جنگ میں شکست کھا رہے تھے بلکہ اقتصادی بساط پر بھی ہار پر ہار مانتے جاتے تھے۔ زرکشی کی یہ داستان بڑی طویل ہے۔ اس کی تاریخ بیان کرنا مقصد بھی نہیں ہے، صرف ان نتائج پر نظر ڈالنا ہے جو یہاں کے معاشی اور اسی کے اندر ہو کر تہذیبی ارتقا پر اثر انداز ہوئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہد معاشی استحصال کے نقطۂ نظر سے دنیا کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں رکھتا۔ اگر اس نے مکمل طور پر جاگیرداری اور زمینداری کے نظام کو ختم کر دیا ہوتا تو ہندوستان ترقی کی راہ میں کئی قدم آگے بڑھ گیا ہوتا لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس نے ان کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر برقرار رکھا تاکہ ان کے ذریعہ سے بھی استحصال ہوتا رہے۔ کاشتکاری جس سے ملک کا ایک بڑا حصہ وابستہ تھا، تباہ ہوئی کیونکہ ایک طرف تو محاصل کا بوجھ غیر معمولی طور پر بڑھ گیا دوسری طرف اس کی وصولیابی میں فوجوں نے وہ مظالم اور بے اعتدالیاں کیں جن کی کوئی مثال نہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ زمینوں کی زرخیزی ختم ہو گئی اور بہتر نظام حرفت اور کاشتکاری وجود میں نہیں آیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا اور زمینداری اسی لیے

برقرار رکھی گئی کہ وفاداروں کا ایک گروہ بروقت مدد کے لیے موجود رہے۔

کاشتکاری کی اس ابتری کے ساتھ صنعتوں کی ابتری بھی ہوئی۔ گویا ہندوستان اس حالت میں پہنچ گیا جہاں تباہی اور افلاس کی ساری صورتیں بھیانک شکل میں نمودار ہو گئیں۔ یہ معاشیات کے طالب علموں کے لیے ایک بحث طلب مسئلہ ہو سکتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحصال سے پہلے ہندوستان میں جو صنعتی ترقی ہوئی تھی وہ مشینی دور کی صنعتی ترقی سے کس قدر مختلف تھی، یا یہ کہ اگر ہندوستان کو اپنے ہی حال پر چھوڑ دیا جاتا تو کیا اس میں صنعتی ترقی کی منزل اپنے فطری ارتقاء کے نتیجہ کے طور پر آ جاتی؟ لیکن یہاں یہ بحث نہیں ہے۔ کہنا صرف اتنا ہی ہے کہ یہاں کی صنعت جس منزل میں بھی تھی تباہ ہو گئی اور اس کی جگہ بہت دنوں تک مشینی صنعت نے نہیں لی۔ نتیجہ وہی ہوا کہ ہندوستان کی ترقی برطانوی سرمایہ داری کی ترقی کے لیے روک دی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کچھ بنیے ساہوکار بن گئے اور معمولی طور پر سرمایہ داری یہاں بھی شروع ہوئی۔ یہ سرمایہ داری اپنی ابتدائی منزل میں برطانوی سرمایہ داری سے ٹکر لینے یا مقابلہ کرنے کے بجائے اس کی نگاہِ کرم کے سائے میں پنپ رہی تھی۔ یہ سرمایہ داری قومی دولت میں اضافہ کرنے کے بجائے انگریزوں کی ایجنٹ بن کر معمولی نفع پر خوش تھی اور انگریزوں ہی کے بل بوتے پر خود اپنے ابنائے وطن کو لوٹنے اور لٹوانے کا جرم کھلے بندوں کر رہی تھی۔

اس طرح لوٹنے کے ساتھ ساتھ انگریز ملازمین اپنی ذاتی تجارت بھی کرتے تھے یا ہندوستانی جاگیرداروں نوابوں اور راجاؤں کے ٹھیکہ دار بن جاتے تھے اور عوام اور جاگیرداروں کے درمیان واسطہ بن کر غیر معمولی لوٹ کھسوٹ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کمپنی کے پچاس ساٹھ روپے کے ملازمین جب چند سال کے بعد انگلستان واپس جاتے تھے تو وہاں لاکھوں کی جائداد خریدتے اور نوابوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ انگریزوں کے یا ایجنٹ اور انگریز ملازمین آبرو داروں کی بے عزتی کرتے، ان کے گھروں میں گھس جاتے تھے اور مارنے پیٹنے کے علاوہ انھیں خوب ذلیل کرتے۔ اس سلسلے میں بلوے اور خوں ریزیاں بھی ہوتی تھیں لیکن دشواری یہ تھی کہ ہندوستانی عدالتیں انگریزوں کے خلاف مقدمے کی سماعتیں کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ دیسی عیسائی تک ہندوستانی عدالتوں کی زد میں نہیں آتے تھے۔ اس کے خلاف راجہ رام موہن رائے اور دوسرے لوگوں کے احتجاج کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

حکومت کی توسیع کے ساتھ انگریزوں کا یہ معاشی اقتدار ہندوستان کے ہر طبقے کو کمزور اور تباہ حال بنا رہا تھا۔ خواص سے لے کر عوام تک سب مادی حیثیت سے پست اور پسپا ہوتے جا رہے تھے۔ ان حالات میں بھی انھیں اپنی چند مذہبی اور اخلاقی قدریں عزیز تھیں، جن کو وہ محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور گویا انھیں کے ذریعے زندہ رہنا چاہتے تھے، لیکن برطانوی اقتدار نے آہستہ آہستہ ان پر بھی ضرب لگائی۔ ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ سولھویں صدی ہی سے شروع ہو چکی تھی اور عیسائی بنانے والے پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی مشن بڑے جارحانہ انداز میں کام کر رہے تھے۔ ملک کے گوشے گوشے میں چرچ قائم ہو رہے تھے اور یہاں کی مختلف زبانوں کے ذریعہ مسیحیت کی برتری کا ڈنکا بجایا جا رہا تھا۔ مختلف مشن اپنے اپنے اسکول

ہیڈ مسلم یونیورسٹی نمبر

اور تعلیمی ادارے بھی قائم کر رہے تھے اور افلاس کے مارے ہوئے ہندوستانی مختلف قسم کی مراعات کے لالچ میں دینِ مسیحی قبول کر رہے تھے۔

اس پر طرہ یہ ہوا کہ خود انگریزی حکومت نے اس مذہبی تبلیغ میں مدد دینا شروع کر دیا۔ انگریز فوجی افسروں نے فوجوں کے اندر عیسائیت کی تبلیغ کی ابتدا کی اور کمپنی بہادر کے ملازمین مسیح کے سپاہی بن کر مذہبی جہاد میں مصروف ہو گئے۔ فوجوں میں عہدوں کی تبدیلی کا انحصار بہت کچھ مذہب کی تبدیلی پر رہ گیا اور یہ تحریص ایسی نہ تھی جس کا شکار بہت سے لوگ نہ ہو جاتے ہوں۔ مشن کے پادریوں کو عام اجازت تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً فوجی چھاؤنیوں اور بیرکوں میں جا کر دینِ مسیحی کی خوبیاں بیان کریں اور تبدیلیِ مذہب پر دینی اور دنیوی فلاح کی بشارت دیں۔

یہ تو ایک مشہور حقیقت ہے کہ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی حالانکہ مشن اسکولوں کا جال بچھ رہا تھا لیکن انیسویں صدی کی ابتدا ہوئی تو انگریز حکام انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سلسلے میں دو اہم بحثیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ انگریزی کی تعلیم دی جائے یا نہ دی جائے دوسری بحث تھی مذہبی تعلیم کے بارے میں۔ اب تک جو کالج مشرقی علوم کے لیے جاری تھے ان میں انگریزی کے درجے بڑھا دیے گئے لیکن انگریزی تعلیم کو پوری طرح جاری کرنے کے متعلق بحث مباحثے جاری رہے۔ سرکاری اسکولوں میں براہِ راست مذہبی تعلیم کے متعلق البتہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اجازت نہیں دی لیکن اس کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو اپنے برابر نہیں پہنچنے دینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے سرسید احمد کی زندگی ہی میں ایم اے او کالج میں داخلہ لیا تھا اسلئے وہ مسلمانوں کے اس ادارہ کے بانیوں کے جذبۂ ایثار اور اخلاص سے بخوبی آگاہ تھے۔ جب انہوں نے یہ سنا کہ سر راس مسعود نے وائس چانسلر کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا ہے تو انہوں نے ۵ مئی ۱۹۳۴ء کو سر راس مسعود کو ایک خط لکھا جسکا متن مندرجہ ذیل ہے۔

مخدوم بندہ، تسلیم

میں نے پہلے پہل جب اخبار میں آپ کے استعفے کی خبر سنی تو مجھے یقین نہ آیا۔ اسی لئے میں نے تار دیا۔ اب آپ کے جواب سے اس کی تصدیق ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ ایک روز یہ ہونے والا ہے۔ زوال یافتہ قوموں کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ اُن کے افراد میں حسد کا مادہ بے حد بڑھ جاتا ہے۔ وہ کسی کو کھاتا پیتا خوش حال یا ممتاز نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی اچھا کام کرکے نام حاصل کرے خواہ وہ کام انہیں کے فائدہ کا کیوں نہ ہو۔ آپ نے جب سے پرانی گندگی اور خرابی کو رفع کرنا پرانی بدنامی کے داغ مٹا کر یونیورسٹی کو نیک نام کرنا، جگہ جگہ سفر کرکے لاکھوں روپیہ جمع کرنا، ملک میں اور گورنمنٹ میں اس کے رسوخ اور وقار کو بڑھانا شروع کیا تھا، آپ کے استعفے کی بنیاد اسی وقت پڑگئی تھی۔ لارڈ ولڈ نے کیمبرج میں کیا خوب کہا تھا کہ ,, مشرق میں کام کرنا گناہ ہے اور میں نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہے “ مشرق کی جگہ اگر علی گڑھ کہا جائے تو آپ کے حال پر یہ مقولہ پورا صادق آتا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ سارے ملک میں ایک قومی گھر ہے اور وہ سازشوں کا گھر بنا ہوا ہے۔

خادم عبدالحق

زیادہ تر ہندوستانی عیسائی ہوگئے تو ہندوستان میں
انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہوجائے گا اور ہندوستان
کا وہی حشر ہوگا جو امریکہ کا ہوا یعنی ہندوستان پر
حاکمانہ قبضہ رکھنا مشکل ہوجائے گا۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں
کا یہ خوف ٹھیک تھا یا غلط، اس سے بحث نہیں لیکن
ہوا یہ کہ براہ راست مذہبی تعلیم دینے کے بجائے انگریز
ماہرین تعلیم نے انگریزی علم و ادب کے ذریعے اس
کمی کو پورا کرانا چاہا۔ اس کی تفصیلات سیکڑوں کتابوں
میں مل جائیں گی لیکن اس سلسلے کا انقلاب انگیز اقدام
وہ تھا جس کی تکمیل لارڈ میکالے کے ہاتھوں ہوئی۔ انگریزی
زبان میں تعلیم دئے جانے کے متعلق میکالے نے اپنی مشہور
رپورٹ میں لکھا کہ "ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی
چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان
مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور
رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق اور
رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔" یہ الفاظ
غیر مبہم ہیں لیکن میکالے کے دل میں جو کچھ تھا وہ اس
رپورٹ میں نہیں بلکہ اس خط میں تھا جو اس نے اپنے
باپ کو لکھا تھا اور جس میں یہ الفاظ ملتے ہیں: "اس
تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے، کوئی ہندو
جو انگریزی داں ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے
ساتھ قائم نہیں رہتا، بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو
رہتے ہیں مگر بہت سے یا تو ملحد ہوجاتے ہیں، یا
دین عیسوی اختیار کرلیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے
کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عملدرآمد ہوا تو
تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی
نہ رہے گا۔"

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں
دونوں نے مختلف شکلوں میں اس کے خلاف احتجاج
کیا کیوں کہ آہستہ آہستہ یہ طے ہوگیا کہ سرکاری ملازمت
میں انگریزی جاننے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔
قدیم مشرقی علوم بالکل بے معنی اور بے سود ہوتے جارہے
تھے اور ان کی طرف سے بے اعتنائی بڑھ رہی تھی
دوسری طرف نئے علوم اور انگریزی تعلیم مذہب اور
اخلاق کے لیے خطرہ بنتے جارہے تھے۔ مختصر یہ ہے
کہ نئی تعلیم نے مادی اور روحانی زندگی میں شدید
کشمکش پیدا کردی تھی۔ سارے مادی وسائل چھین
لینے کے بعد ہندوستانیوں سے ان کا مذہب بھی چھینا
جارہا تھا۔ وقتاً فوقتاً ایسے احکام بھی فوجوں میں
نافذ ہوتے تھے کہ فوج کے سپاہی ماتھے پر کوئی
نشان نہ لگائیں، ڈاڑھیاں منڈائیں اور کان میں کچھ
نہ پہنیں۔ اس کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی بغاوتیں بھی
ہوئیں۔ اس تعلیم سے بہت سے انگریزی حکام اور
ماہرین تعلیم کی یہ امیدیں وابستہ تھیں کہ اس سے تمام
ہندوستانیوں میں مسیحی اخلاق اور برطانیہ سے وفاداری
کا جذبہ پیدا ہوگا۔ ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ جو معاشی
اور اقتصادی نظام وجود میں آرہا تھا اس میں یہ جذبات
دیرپا نہیں ہوسکتے۔

انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق
کرکے معاملات کو اور زیادہ پیچیدہ بنادیا۔ بہت دنوں
تک مسلمانوں نے جدید نظام سے فائدہ نہیں اٹھایا
کیوں کہ ان کے خیال میں وہ روایات اور ضروریات
کے خلاف تھا۔ انگریزی حکومت میں تعلیم حاصل کرنے
اور ملازمتیں اختیار کرنے کا مسئلہ علماء کے یہاں زیر بحث
تھا اور جب تک اجتماعی طور پر کوئی نقطۂ نظر دلوں میں
گھر کرے، مسلمان تعلیم میں پیچھے ہوتے گئے۔ ان کو جو

مذہبی تعلیم ملتی تھی وہ بھی اوقاف کے ضبط ہو جانے کی وجہ سے کم ہوتی گئی یہی نہیں تھا بلکہ جو مسلمان انگریزی پڑھ بھی لیتے تھے بعض اوقات انھیں صرف اس بناء پر نوکریاں نہیں دی جاتی تھیں کہ وہ مسلمان ہیں یہ صورت حال پہلے بھی تھی لیکن غدر کے بعد اس نے ایسی شدت اختیار کرلی کہ ان کی زندگی دشوار ہوگئی اور بقول ڈاکٹر ہنٹر اڑیسہ کے مسلمانوں نے اس قسم کی عرضداشت پیش کی:-

"بحیثیت وفادار رعایا حضور ملکہ معظمہ ہمیں سرکاری ملازمتیں پانے کا یکساں حق ہے۔ اصل یہ ہے کہ اڑیسہ کے مسلمان اس قدر پیس دیے گئے ہیں کہ اب ان کے ابھرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ نسل کے اعتبار سے شریف، پیشہ کے اعتبار سے غریب، سرکاری سرپرستی سے محروم۔ ہماری حالت ان مچھلیوں کی مانند ہے جو پانی سے نکال کر باہر پھینک دی گئی ہوں۔ یہ مسلمانوں کی بدترین حالت ہے جو حضور کے سامنے اس لیے پیش کی جاتی ہے کہ حضور ملکہ معظمہ کے قائم مقام ہیں ہم امید کرتے ہیں کہ بلا لحاظ رنگ وملت سب قوموں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے گا۔ سرکاری ملازمتوں سے خارج ہونے کے بعد ہم مفلسی اور مایوسی کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر بیس روپیہ ماہوار کی نوکری بھی مرحمت ہوجائے تو ہم دنیا کے سب سے دور دراز مقامات تک سفر کرنے، ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھ جانے اور سائبیریا کے سنسان بیابانوں میں بھٹکتے پھرنے کو بھی خوشی سے تیار ہیں۔"

یہی حال کم وبیش اور علاقوں کا تھا۔ امیروں اور غریبوں کی حالت تو خراب تھی ہی، وہ متوسط طبقہ بھی مصیبت کا شکار ہوگیا جو نئے حالات میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان کی کیا حالت تھی اور انگریزی اقتدار نے اس میں کیا پیچیدگیاں پیدا کی تھیں اس کا کچھ اندازہ مندرجہ بالا صفحات کے مطالعے سے ہوا ہوگا لیکن یہ تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کے اور پہلوؤں میں بھی رنگ نہ بھرا جائے۔

انگریزی حکومت کی برکتوں میں جو چیزیں گنی جاتی ہیں وہ سائنس اور ٹکنالوجی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نظر انداز کرنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ انگریزی عہد ہی میں ہندوستان ریل، تار برقی بجلی اور پریس سے آشنا ہوا۔ ہندوستان ریاضی، ہیئت، نجوم، ہندسہ، فن تعمیر وغیرہ میں صدیوں سے ترقی کی غیر معمولی منزلیں طے کر چکا تھا۔ ذرائع حمل ونقل میں ڈاک اور خبر رسانی میں اپنے طور پر دنیا کے بہت سے ممالک سے آگے تھا، لیکن مشینی ایجادات اور ان سے فوائد حاصل کرنے کے لیے اسے دوسروں کا دست نگر ہونا پڑا۔ جہاں تک پریس کا تعلق ہے اگرچہ ہندوستان میں پرتگالیوں نے اس کا استعمال سولھویں صدی ہی میں شروع کردیا تھا لیکن عام ہندوستانی اس سے بالکل بے خبر تھے۔ برطانوی اثر کے ماتحت کلکتہ اور بمبئی میں متعدد پریس اٹھارویں صدی میں قائم ہوگئے لیکن کلیسائی اور سرکاری ضروریات کے باہر پریس کا اصل استعمال انیسویں صدی کی ابتدا میں شروع ہوا اور بعد کی ہندوستانی زندگی پر اس کے اثرات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح بجلی، ریل اور تار برقی جس نے مرزا غالب تک کی آنکھیں خیرہ کردی تھیں، ہندوستان کے لیے عہد آفریں وسائل ترقی کہے جاسکتے ہیں انگریزوں نے ان چیزوں کو اپنی ضروریات کے پیش نظر ہندوستان میں استعمال کرنا چاہا تھا لیکن ان سے جو فوائد مترتب ہوئے وہ عام تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر اور بہت

سے دوسرے انگریز حکام جس طرح انگریزی تعلیم کے اجرا سے خائف تھے کہ ان سے ہندوستانیوں کا ذہن یورپ کے جذبۂ قومیت اور احساسِ آزادی سے واقف ہو کر انہیں خود بیرونی حاکموں کے خلاف استعمال کرے گا' اسی طرح وہ پریس کے عام ہونے سے بھی خوفزدہ تھے کہ کہیں اس کے ذریعہ سے کسی وقت انگریز دشمنی اور وطن پرستی کے جذبات کی اشاعت بڑے پیمانے پر نہ ہونے لگے یہی حالات اور واقعات کے وہ پہلو ہیں جو ناگزیر طور پر اپنی ضد بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔

خیر ریل، تار اور پریس کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن چونکہ یہ چیزیں باہر سے لائی گئی تھیں اور ان کے پیچھے وہ سائنٹفک شعور نہیں تھا جو ان کی ماہیت اور نوعیت کو سمجھتا ہے اس لیے عام طور سے ہندوستانیوں کے ذہن میں ان کی جگہ پوری طرح نہ بن سکی۔ سائنس کی تعلیم معمولی طور پر ہو رہی تھی اور کچھ کتابوں کے ترجمے بھی انیسویں صدی کے وسط تک ہو چکے تھے لیکن پھر بھی سائنس ابھی عام شعور کا جز نہیں بنی تھی۔ اور ان ترقی یافتہ وسائل سے عام ہندوستانی کو فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل نہ تھا۔ جس چیز نے فوری طور پر اس شعور کے بننے میں مدد دی وہ پریس تھا، کیونکہ انقلاب ۱۸۵۷ء تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اخبارات کافی تعداد میں نکلنے لگے تھے اور سیاسی بیداری میں مدد کر رہے تھے۔

جو لوگ سماجی علوم سے واقف ہیں وہ اسے جانتے ہیں کہ مخصوص قسم کے معاشی نظام میں مخصوص قسم کا شعور وجود میں آتا ہے۔ مخصوص قسم کے سماجی، فلسفیانہ، ادبی اور تعلیمی ادارے وجود میں آتے ہیں اور جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ گہرے معاشی اور تاریخی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جن تاریخی اور معاشی حالات کا تذکرہ ہوا وہ کسی خلا میں نہیں ہوئے، اس لیے انھوں نے مروجہ اور روایتی مذہبی، اور فلسفیانہ اقدار کے لیے چیلنج کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے تجزیہ کی سب سے زیادہ واضح اور موثر صورت تو یہ ہوگی کہ پہلے مذہبی، فلسفیانہ اور سماجی علوم اور موقف کا خاکہ پیش کیا جائے، پھر تاریخی عمل نے جو تغیرات پیدا کیے ہیں ان پر نگاہ ڈالی جائے اور اسباب و علل کا رشتہ تلاش کرنے کے ساتھ ان کی تعبیر اور توضیح بھی کی جائے لیکن یہ طریقۂ کار تفصیل کا مطالبہ کرتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے لیکن چند اشارے ضروری ہیں۔

مختصراً اس دور کی مذہبی صورتِ حال پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اٹھارویں اور ابتدائی انیسویں صدی تک ہندو مذہب میں بھگتی تحریک کے بعد کوئی قابلِ ذکر تغیر نہیں ہوا تھا۔ بھگتی تحریک کئی قسم کے مذہبی تصورات کا مجموعہ تھی۔ وہ برہمنی نظام کے خلاف ایک عوامی ردِ عمل کی حیثیت بھی رکھتی تھی اور بدھ مت اور اسلام کے متعدد خصوصیات کو جذب کر کے ہندو مت کو ان دونوں نظاموں میں جذب ہونے سے بچانے کا آلۂ کار بھی تھی۔ اور ان سب سے بڑھ کر اس کی نوعیت ایک سماجی احتجاج کی تھی جس کا مقصد ایک خاص طرح کی روحانی مساوات قائم کر کے اعلیٰ اور ادنیٰ کے فرق کو مٹانا تھا۔ بھگتی تحریک کی بنیادیں تو ویدانتک فلسفہ پر تھیں لیکن اس کے اظہار میں اسلامی تصوف اور افکار کے واضح اثرات شامل تھے۔

مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ہندو مسلم اختلافات نے سیاسی اہمیت کبھی اختیار نہیں کی، اس لیے ہندو ذہن اور فکر کو مسلمانوں کے آنے اور ہندوستان میں پھیل جانے کے وقت تصادم کی جو شکل نظر آئی تھی اب اس سے

اندیشہ تھا لیکن اٹھارویں صدی کی بات اور تھی مغربی اثرات کا ردعمل کہیں تو شدید مخالفت کی صورت میں ظاہر ہوا کہیں اسے مکمل طور پر تسلیم کر لینے کی صورت میں ان کے علاوہ ایک متوازن شکل بھی تھی جو ہندو مذہب کی لچک کو برقرار رکھتے ہوئے رونما ہوئی۔ مذہب کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے، شعور کی مختلف منزلوں پر جو سوالات شکوک کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب مذہبی نقطۂ نظر سے دینے کی کوشش ہر عہد میں ہوتی رہی ہے، اس لیے نئے حالات میں ہندو مذہب بھی اصلاح کے دور سے گزرا اور چونکہ اس وقت یہی تصورات، مذہب و اخلاق کا زور تھا اس لیے راجہ رام موہن رائے، دیویندر ناتھ ٹیگور اور کیشپ چندر سین کی اصلاحی تحریک میں اس کے نقوش نظر آتے ہیں۔ خود ہندوؤں کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ سرکاری تعلیمی کمیٹی نے اپنی رپورٹ ۱۸۳۱ء میں یہ خیالات پیش کیے ہیں اور جن کا خلاصہ سید محمود نے اپنی تاریخ تعلیم میں دیا ہے "زبان انگریزی کی واقفیت میں ترقی کے ساتھ اخلاقی اثرات بھی نمایاں ہوئے اور اچھے خاندان اور قابلیت کے بہت سے نوجوانوں میں ہندو مذہب کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے بے چینی اور اپنی رسوم کی طرف سے بے اعتنائی کا علانیہ اظہار کیا جا رہا ہے اور غالباً دوسری نسل میں کلکتہ کے ہندوؤں کے خیالات اور محسوسات میں بڑی مادی تبدیلی ہو جائے گی۔" یوں مذہبی اصلاح کے لیے زمین تیار تھی اور عام سماجی حالات اس تبدیلی کے معاون تھے۔ نئے شعور کی بنا پر جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان میں رہنمائی کی باگ پیشہ ور مذہبی پیشواؤں کے بجائے دانشوروں کے ہاتھ میں پہنچ رہی تھی یہ بات ابھی جب ہم مسلمانوں کے یہاں مذہبی اصلاح کا ذکر کریں گے تو اور زیادہ واضح ہو گی کیوں کہ طبقاتی مفاد کی شکل بدل رہی تھی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وقتاً فوقتاً مذہبی اصلاح کی تحریکیں جنم لیتی رہتی تھیں۔ ان تحریکوں کو کبھی کبھی تجدید یا احیائے دین کہا گیا ہے۔ مغلوں کے عہد زوال میں اس کا سب سے اہم مظہر ولی اللّٰہی تحریک تھی جس نے کئی دور رس کام کیے۔ ایک طرف شاہ ولی اللہؒ نے یہ پتہ لگایا کہ اسلام میں غیر اسلامی عناصر مختلف راستوں سے ہو کر کس طرح داخل ہو گئے ہیں (اس ضمن میں انھوں نے اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت کے فرق کو بھی ملحوظ رکھا) دوسری طرف اجتہاد پر زور دیا۔ یہ اجتہاد مختلف مسلکوں کی تقلیدِ محض کے خلاف ایک اہم اعلانِ جنگ تھا۔ تیسری طرف انھوں نے اسلامی عقائد کی بنیاد پر ایک مکمل نظام معاشرت اور معیشت مرتب کرنے کی کوشش کی۔ انھیں چند اہم اور بنیادی تصورات سے اور خیالات بھی پیدا ہوئے جو ہندوستانی مسلمانوں کی عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں یہی نہیں بلکہ بعض محققین شاہ ولی اللہ کو جدید علم الکلام کا بانی سمجھتے ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے رود کوثر میں حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچے سے یہ فقرہ نقل کیا ہے "مصطفوی شریعت کے لیے وقت آگیا ہے کہ برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کر کے اسے میدان میں لایا جائے۔" اور انھیں تقلید کا مخالف قرار دے کر ہندوستان کے علما میں سب سے اونچی جگہ دی ہے۔ یہ اٹھارویں صدی کا ذکر ہے جب مشرق و مغرب کی کشمکش اچھی طرح ظاہر نہیں ہوئی تھی لیکن مسلمانوں کی مادی اور روحانی زندگی زوال کی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ اسلام کو پھر طاقتور بنانے کی یہ کوشش کوئی اہم مادی بنیاد نہیں رکھتی تھی پھر بھی جو مخالف اور

متصادم عناصر کھلے یا چھپے طور پر ایک دوسرے سے
برسرِ پیکار تھے ان کی وجہ سے مذہبی اور معاشرتی اصلاح
کے اس جذبہ کو دائرۂ عمل ہاتھ آگیا۔ اگر ہندوستان کی
سیاسی حالت تغیر کی زد سے دُور رہی ہوتی تو اس اہم
اصلاحی اقدام کی حیثیت بھی متکلمین کی رد و قدح
سے زیادہ نہ ہوتی۔ مگر ہوا یہ کہ شاہ ولی اللہ کے انتقال
کے پچاس سال کے اندر ہی وہ تحریک شروع ہوگئی
جسے عام طور سے وہابی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس
تحریک کا ایک پہلو تو محض سنتِ رسول کا اتباع تھا'
لیکن دوسرا پہلو جو جارحانہ شکل اختیار کرنے پر مجبور
کرتا تھا یہ تھا کہ اس کے مناسب فضا پیدا کی جائے
اور اگر اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوں تو انھیں دور
کرنے کے لیے جہاد کیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے
اہم نام سید احمد شہید اور سید اسمٰعیل شہید کے ہیں جنھوں نے
سکھوں کے خلاف جہاد کیا۔ اس تحریک کا ایک رُخ
انگریزوں سے بیزاری کی طرف بھی تھا اور ہندوستان کے
دارالحرب یا دارالاسلام ہونے کی فقہی بحث سے اس کا
گہرا تعلق تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بنگال کی اس فرائضی
تحریک کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے جو مذہبی اصلاح
کے بھیس میں ایک عوامی زرعی تحریک تھی، جس کا مقصد
مساوات، غریبوں سے ہمدردی اور زمینداروں کی
مخالفت تھا۔ یہاں ان کی تفصیلات میں جانے کے
بجائے محض یہ یاد دلانا ہے کہ مسلمانوں کے اندر عام
بے چینی اور بددلی پھیلی ہوئی تھی اور اس اہم انقلابی
جدوجہد کے لیے فضا تیار ہو رہی تھی جو ۱۸۵۷ء میں
رونما ہوئی۔

اس وقت تک جو مذہبی اور فلسفیانہ تصورات
وجود میں آئے تھے وہ مشرق و مغرب کے تصادم کا
نتیجہ نہیں کہے جا سکتے تھے، نظریاتی سطح پر کشمکش
شروع ہو چکی تھی لیکن اس کا مقابلہ کرنے میں ان علوم
سے کام نہیں لیا گیا تھا جو جدید سائنس اور جدید استدلالی
فلسفہ کے ساتھ آئے تھے۔ سائنس سے انفرادی طور پر
دلچسپی کا پتہ دہلی کالج میں تعلیم پانے والوں کے یہاں،
اودھ کے شاہ غازی الدین حیدر اور شاہ نصیر الدین حیدر
کے یہاں یا حیدرآباد کے شمس الامراء امیر کبیر کے یہاں
ملتا ہے یا پھر اس سے بھی قبل اکبری عہد میں یا اورنگ زیب
کے دورِ حکومت میں دانشمند خاں کے یہاں چلتا ہے۔
جس کے متعلق برنیر نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ
دانشمند خاں کو ڈیکارٹ اور گیسینڈی کے فلسفے اور ہاروے
کے نظریۂ دورانِ خون سے دلچسپی تھی اور اس نے بعض
مقالات کا ترجمہ کرایا۔ یہ انفرادی دلچسپیاں تھیں لیکن
انیسویں صدی کے وسط تک مغربی فلسفہ اور سائنس
کے اثرات کافی پھیل چکے تھے۔ سائنس اور مذہب
کی کشمکش شروع ہو چکی تھی، عقلیت اور واقعیت
کی طرف میلان بڑھ رہا تھا اور جس طرح نشاۃ ثانیہ
کے بعد سے یورپ کے لیے یہ کشمکش تھی کہ یا تو مذہب
سائنس سے مطابقت پیدا کرے یا پھر دو میں سے ایک
کو برتر تسلیم کیا جائے۔ یہی صورتِ حال ہندوستان کے
اس دورِ بیداری میں نظر آتی ہے۔ اسے چاہے جس
پہلو سے دیکھا جائے یہ مسئلہ اہمیت اختیار کرتا جا
رہا تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح کی جو تحریکات چل رہی
ہیں وہ اسی طرح چلتی رہیں گی یا انھیں نئے علوم اور
نئے شعور کی روشنی میں کسی نئے سانچے میں ڈھالا جائے
گا۔ غدر کے بعد اس کے لیے فضا بہت سازگار ہو گئی
کیوں کہ غدر نے مادی حیثیت سے مغرب کی برتری کا
فیصلہ کر دیا اور نظامِ حیات کے وہ نقوش واضح کر دیے

جو تقریباً سو سال سے ہندوستان کے افقِ زندگی پر ابھر رہے تھے۔ غدر نے ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے اندر چھپی ہوئی عیش پسندی کاہلی اور جذباتی کیفیت نئے حالات کا مقابلہ کرنے سے بچتے رہنے کی خواہش کو بہت نمایاں کردیا اور ان کے لیے فیصلہ کن گھڑی آگئی۔ انھوں نے جو کچھ کھویا تھا اس کے فوراً واپس ملنے کی کوئی صورت نہ تھی لیکن اس سے ترکِ موالات اور علاحدگی بھی ممکن نہ تھی۔ اس کو قبول کرنے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے دونوں صورتوں کے لیے اس کا جاننا ضروری تھا۔ انسانی شعور ایسے موقعے پر کوئی نہ کوئی پہلو ایسا پیدا کر لیتا ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات میں اپنی جگہ بنا سکے۔ چنانچہ مذہبی فلسفیانہ اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کو تغیرات کی بنیادوں کو سمجھنا پڑا۔ جہاں مقابلہ ہوسکتا تھا وہاں مقابلہ کیا گیا، جہاں سمجھوتہ سے کام چل سکتا تھا وہاں سمجھوتہ ہوا، اور جہاں شکست کے بغیر چارہ نہ تھا وہاں ہار قبول کی گئی۔ یہاں یہ بتا دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا رشتہ بیرونی ممالک کے مسلمانوں سے بہت کچھ ٹوٹ چکا تھا اور انھیں جو کچھ بھی رہنمائی مل سکی تھی وہ مغرب سے آئی ہوئی انگریزی سیاست اور انگریزی خیالات کے ذریعہ ہی مل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ تمام اسلامی ممالک آہستہ آہستہ یورپ کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو رہے تھے، اور جیسے ہی نہر سوئز پر برطانوی اقتدار قائم ہوا برطانیہ کا اثر سارے مشرق قریب و بعید میں پھیل گیا اور ہندوستان پر اس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ یہ ایک طویل کہانی ہے صرف یہ بات واضح کرنے کے لیے اس کا ذکر ہوا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے ہی ذرائع سے اپنا مستقبل سوچ سکتے تھے اور جو طاقت انھیں اپنے پنجے میں دبائے ہوئے تھی اس کے حوصلے اور ذرائع بہت وسیع تھے۔ انگریزوں نے ابتدا معاشی اور سیاسی اقتدار سے کی تھی اور اب آثار اس کے تھے کہ ہندوستانی مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی حیثیت سے بھی بالکل غلام ہو جائے گا۔ اس منزل پر علی گڑھ تحریک نے ایک معین شکل اختیار کی جو درحقیقت اسی دورِ بیداری کا جزو تھی جس کی ابتدا ہو چکی تھی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تحریک کن حیثیتوں سے بنیادی طور پر ایک ایسی تحریک تھی جس نے ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کی سیاسی، معاشی، معاشرتی مذہبی اور ادبی زندگی کو متاثر کیا۔ تغیرات کا جو پس منظر اوپر دیا گیا اس سے اندازہ ہوگا کہ مقررہ اقتصادی نظام ایک متحرک نظام میں بدلا تھا۔ دولت اب محض جاگیر یا زمین یا سامانِ آرائش کا نام نہیں تھی بلکہ نئے طبقات کے ہاتھ میں پہنچ کر نئی شکل اختیار کر رہی تھی اور نئے مسائل اس سے پیدا ہو رہے تھے۔ ریاست اب ایک منظم وحدت اور مضبوط ادارہ تھی جس کی تنظیم اور اصلاح شعوری طور پر حاکم طبقہ اور اس کے حلیفوں کے مفاد کے لیے ہو سکتی تھی۔ سب سے بڑا تغیر یہ تھا کہ اس وقت تک رہنمائی جاگیردارانہ یا مذہبی عناصر کے ہاتھ میں تھی۔ اب وہ نکل کر نئے تعلیم یافتہ طبقے کے ہاتھ میں آگئی تھی جو ایک طرف تو اپنے مفاد کا تحفظ چاہتا تھا دوسری طرف حاکم طبقہ سے تعلقات قائم کر کے اپنی حیثیت کو بہتر اور مضبوط بنانے کی فکر میں تھا۔ حاکم طبقہ کو بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہ تعلقات باہمی مفاد کی بنیاد پر آسانی سے قائم ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ زندگی کی نئی تشکیل میں تاثیر اور تاثر کے

مرکز بدل گئے اگرچہ اس کا رشتہ ماضی اور اس کی روایات سے نہیں ٹوٹا۔ علی گڑھ تحریک کی یہ خصوصیت کہ اس میں جرأ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے، کی آویزش اور کشمکش شامل تھی، اسے بہت پیچیدہ بناتی ہے۔ اس میں جو بعض متضاد پہلو نظر آتے ہیں وہ بھی اس بات کا نتیجہ ہیں کہ نفع اور نقصان کی حدیں واضح نہیں تھیں، فوری مفاد اور دیرپا اخلاقی اقدار میں جنگ تھی اور وفاداریاں بٹ گئی تھیں اس لیے علی گڑھ تحریک کا کوئی مطالعہ کسی بنے بنائے تصور کی روشنی میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ خود سرسید کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی تصورات میں جو تبدیلیاں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں آسانی سے ان کی تاویل اور توجیہ بھی نہیں کی جا سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ تحریک کے رہنما سرسید تھے اور اس کا نام بھی علی گڑھ کے اس محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی وجہ سے علی گڑھ تحریک پڑا جو سرسید نے ۱۸۷۵ء میں قائم کیا تھا (سرسید اس سے پہلے بھی مدرسے قائم کر چکے تھے اور سوسائٹیوں کی بنیادیں رکھ چکے تھے کیوں کہ وہ بدلی ہوئی فضا کا اندازہ لگا رہے تھے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے ساتھ بہت سے مخلص، علم پرور، انتھک اور پرجوش کام کرنے والے تھے جو ہواؤں کا رخ پہچانتے تھے، اور وقت کے تقاضوں کا احساس رکھتے تھے اور علی گڑھ کالج محض ایک علامت تھا اس نئی زندگی میں داخل ہونے کی جو اپنا در کھولے ہوئے اندر آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس دروازے کے اندر مختلف قسم کے کارواں داخل ہو رہے تھے۔ کچھ یونہی آنکھ بند کیے ہوئے، کچھ گرد و پیش کا اندازہ لگاتے ہوئے۔ سرسید جس کارواں کو لیے بڑھ رہے تھے اس میں مختلف قسم کے لوگ تھے لیکن بہ طور پر سبھوں کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وقت نے راہ میں جو رکاوٹیں ڈال رکھی ہیں انھیں عبور کر کے اپنی مادی اور روحانی زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ یہی جستجو اور آگے بڑھنے کی یہی کوشش ہے جسے علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے اس میں فتحمندی کے سنگ میل بھی ہیں اور پسپائی کے نشانات بھی، مصلحت آمیز مفاہمتیں بھی ہیں اور ناروا سمجھوتے بھی، اور سرسید کی ہمہ گیر اور عظیم الشان شخصیت کی بڑائی اس میں ہے کہ تحریک کے سارے نشیب و فراز ان کے افکار و اعمال میں دیکھے جا سکتے ہیں اس لیے سرسید ہی کے آئینہ میں اس کے خط و خال کو دیکھنا مفید ہو سکتا ہے۔

ممدوح کی زندگی کے ابتدائی چالیس سال بڑی بڑی علمی فتوحات سے خالی ہیں گو ان میں علمی کاموں کی کمی نہیں ہے۔ آثار الصنادید کی تصنیف، آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح خود اپنی جگہ پر اہم کارنامے ہیں لیکن وہ سرسید جو علی گڑھ تحریک کے روح رواں بنے وہ رسالہ اسباب بغاوت ہند، تبیین الکلام، مضامین تہذیب الاخلاق، مجموعہ لیکچر، خطبات احمدیہ اور تفسیر قرآن کے سرسید ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا ابتدائی علمی اور تحقیقی ذوق ہی ان کی بعد کی تصانیف میں کام آیا۔ سید احمد شہید اور سید اسمٰعیل شہید کے مذہبی تصورات سے وابستگی ہی نے ان کے ذوق اجتہاد کو پروان چڑھایا اور اشاعت تعلیم اور خدمت خلق کے شوق ہی نے ان سے علی گڑھ کالج قائم کرایا۔ پھر بھی غدر اور غدر کے عام اثرات کو نظر انداز کر کے سرسید کے ارتقائے ذہن کو سمجھنا مشکل ہے۔

سرسید نے مغل حکومت کا چراغ بجھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مسلمانوں کی بدحالی اور زوال کا نظارہ کیا تھا۔ زمانے

کی بدنظمی اور بدامنی کا مشاہدہ کیا تھا۔ غدر نے جس طرح رہی سہی آن بھی ختم کر دی تھی اس نے ان کے قلب کو بے حد متاثر کیا اور ان میں جو عملی صلاحیتیں سو رہی تھیں وہ جاگ اٹھیں۔ وہ اس وقت کے مسلمان رہنماؤں میں سب سے زیادہ جری، باعمل، جلد فیصلہ کرنے والے، ذکی الفہم، پرجوش، حوصلہ مند، دور بین اور عقل پرست تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ غدر نے انگریزی حکومت کو مستحکم کر دیا اور اب مسلمانوں کے لئے مستقبل تاریک ہے تو پہلی دفعہ انگریزی سرکار کے ملازم ہونے کے باوجود، غدر کے نازک سیاسی پہلوؤں پر اپنا رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا۔ ان کی ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں داخل ہونے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ اور بھرپور تھی۔ انہوں نے دردمندی اور جرأت کے ساتھ انگریزی حکومت کی بعض چیرہ دستیوں کو بے نقاب کیا۔ اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ انگریزوں نے کبھی ہندوستانیوں پر بھروسہ نہیں کیا اس لئے وہ ان برکتوں کو نہ تو اچھی طرح محسوس کر سکے اور نہ ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ جو انگریزی حکومت اپنے ساتھ لائی تھی اس کے بعد سے ہندوستانی سیاست میں سرسید کی جگہ بن گئی۔ انہوں نے اپنی ساری قوت اس بات پر صرف کر دی کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں دوستی ہو جائے۔ سیاسی مفاہمت کی تکمیل مذہبی مفاہمت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جن سے انگریزوں اور مسلمانوں کے مذہبی تصورات، نظام اخلاق اہل کتاب ہونے کی وجہ سے آپس کی معاشرت میں یکسانی او اشتراک پیدا ہو لیکن اس کوشش کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم سمجھتے تھے بلکہ جب وہ اپنے سیاسی تصورات کی توضیح کرتے تھے تو دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی مساوات پر بڑا زور دیا۔ بار بار یہ کہا کہ جو عہدے انگریزوں کو ملتے ہیں ہندوستانیوں کو بھی ملنے چاہئیں۔ کونسلوں

سرسید نے مغل سلطنت کا چراغ بجھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا
تصویر میں بہادر شاہ ظفر مرحوم شہزادہ فخرو مرزا کے ساتھ

اور لوکل بورڈوں کے لئے انتخاب کے اصول کی تائید کی اور ہندوستانیوں سے کہا کہ وہ ایسی تعلیم حاصل کریں جو انہیں حکومت کے قابل بنائے لیکن جیسا کہ ذرا سے غور و فکر سے سمجھ میں آ سکتا ہے یہ ساری سیاست متوسط طبقہ کے رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے اور متوسط طبقہ اگر اپنے مفاد کے لئے متحد اور متفق ہو سکتا ہے تو اپنے جماعتی یا فرقہ وارانہ مفاد کے لئے دوسرے فرقوں کا مخالف بھی بن سکتا ہے۔ چنانچہ سرسید اگر ایک طرف ہندوؤں

اور مسلمانوں دونوں کے لئے آواز بلند کرتے تھے تو دوسری طرف محض مسلمانوں کے حقوق کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ انگریزی سیاست اس جذبہ کو مسلسل ہوا بھی دے رہی تھی۔ صرف دو اقتباس اسے واضح کردیں گے۔ امبکا چرن مزمدار نے اپنی کتاب (INDIAN NATIONAL EVOLUTION) میں لکھا ہے: "اول اول انگریزی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا اور اس کے بعد ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا جو باہمی رنجش اور عداوت کا موجب ہوا۔" جیمس او کینلی نے کلکتہ ریویو میں لکھا ہے کہ: "ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد ہے ـــــ سالہا سال سے مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے یا انہیں ایسی رعایا سمجھا جا رہا ہے جن کی اطاعت مشتبہ ہے۔ ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت کی جا رہی ہے حتیٰ کہ ان کے اوقات کی آمدنیوں کو جو اسلامیہ کالجوں کے قیام کے لئے تھیں، دوسرے کاموں میں صرف کیا جا رہا ہے۔" اس پالیسی کا شکار ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے تھے اس لئے کبھی ہندی، ہندو، ہندوستانی کا نعرہ لگایا جاتا تھا۔ کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں لیکن سرسید کی ابتدائی سیاسی زندگی میں اس تنگ نظری کا پتہ نہیں چلتا۔ اگرچہ وہ مسلمانوں کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے تو اس لئے کہ انگریز مسلمانوں کو غدر کا بانی سمجھ کر زیادہ پیس رہے تھے۔ تاہم اس وقت کا ہندوستان اپنے غیر متوازن اور ناہموار قومی ارتقاء کی وجہ سے مذہبی اختلافات کے جراثیم کی پرورش کر رہا تھا۔ چنانچہ مولانا حالی سرسید کے یہاں جب اس بات کا پتہ لگانا چاہتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کیسے پیدا ہوئی تو یہ واقعہ ان کے سامنے آتا ہے:

۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے مشترک کوشش محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہوکر میری گفتگو سن رہے تھے آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ اس طرح سرسید کے ذہن میں مسلمانوں کی علیحدہ تعلیم، ان کے علیحدہ حقوق وغیرہ کے خیالات نے جڑ پکڑنا شروع کیا۔ اتفاق سے اس کے بعد ایسی صورتیں پیدا ہوتی گئیں کہ سرسید کا مطمح نظر بدلتا گیا۔

۱۸۶۹ء میں سرسید انگلستان گئے اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد واپس ہوئے۔ اس سفر نے ان کے ذہن میں بہت سے مسائل واضح کردیئے اور انہیں اپنا نصب العین روشن نظر آنے لگا۔ یوں تو انہوں نے غدر کے بعد ہی سے انگریزی معاشرت اختیار کرلی تھی۔ جس سے مذہب پرست مسلمان ان سے بدظن ہوگئے تھے لیکن انگلستان سے واپسی کے بعد انہوں نے جب اس کی تبلیغ شروع کی تو پانی سر سے اونچا ہوگیا۔ معاشرت میں ظاہری تبدیلیاں بھی سرسید کی تعلیمی تحریک کا جز تھیں لیکن ان کا اصل کام ذہنوں کو بدلنا تھا جو ان کے جذبہ اجتہاد اور تجدد کا نتیجہ تھا۔ اسی کے لئے انہوں نے

انگلستان سے واپس آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد تہذیب الاخلاق نکالا جو ان کے حوصلوں اور خیالوں کا آئینہ ہے۔ سرسید نے اسلام کے اصل اصولوں سے کس حد تک انحراف کیا۔ کس حد تک معتزلی انداز نظر اختیار کیا اور کتنا جدید سائنس اور مغربی علوم سے مستعار لے کر اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ کہاں تک یہ سب کچھ محض تاویل اور نئی تشریح کی حیثیت رکھتا تھا اور کہاں تک مغربی عقلیت کی برتری تسلیم کرنے کے مترادف تھا ان تمام باتوں پر وہ شخص تفصیل سے بحث کرے گا جو ان کے علم کلام کا مقابلہ اسلامی علم کلام سے کرے گا۔ لیکن ایک سرسری مطالعہ کرنے والا بھی یہ بات آسانی سے سمجھ لے گا کہ وہ مسلمانوں کو پستی سے نکالنا چاہتے تھے اور انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کے ذرائع جدید تعلیم، انگریزوں سے وفاداری، معاشرے میں تبدیلی، مذہب اور عقل کی مطابقت، تقلید سے نجات اور اصلاح رسوم ہیں۔ ان کے ہر اقدام میں انہیں ذرائع سے کام لینے کی کوشش نظر آئے گی۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید کے مضامین پڑھتے جائیے، آپ کو بار بار یہ خیالات واضح یا ڈھکے چھپے الفاظ میں دکھائی دیں گے: "علم سے مراد صرف علوم دینیہ نہیں ہیں۔ محض روزہ نماز وغیرہ عبادت نہیں۔ جس طرح علوم دینیہ کا پڑھنا فی نفسہ عبادت نہیں اسی طرح علوم دنیوی کا پڑھنا عبادت نہیں لیکن اگر علوم دنیوی اس لئے پڑھے جائیں کہ ان سے مذہبی علوم کے سمجھنے میں مدد ملے گی تو ان کا پڑھنا بھی عبادت ہو جاتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ امور معاش و تمدن و حسن معاشرت اور علم کی ابتری و خرابی کے سبب روز بروز خراب و ذلیل و حقیر ہوتے جاتے ہیں اور واعظ و مولوی صاحب و پیر جی، خدا اور رسول کے دشمن ان کو روز بروز تباہ و برباد کرتے جاتے ہیں۔ مذہب اسلام کے دوست دار کا کام یہ ہے کہ اپنے تئیں پیر جی یا حضرت صاحب یا مولوی صاحب کہلاتے اور دغا بازی سے دنیا کمانے کے لئے انہیں باتوں کا جن کی ضرورت نہیں ہے بیٹھا ہوا وعظ کہا کرے یا جن کی ضرورت درحقیقت مسلمانوں کو اور خود اسلام کو ہے اس کی تدبیر اور اس کی کوشش کرے۔ مسلمان عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی تعلیم سے عقائد خراب ہوتے ہیں۔ پہلے مسلمانوں کو یہ دیکھنا ہے کہ انگریزی پڑھنا تو روز بروز ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ مذہب کو کیا کریں اور کیسے بچائیں۔ ہم (سرسید) اس خیال پر ہنستے ہیں۔ اگر اسلام ایسا ہی بودا مذہب ہے تو اس کو چھوڑ دینا اچھا، ہمیں جدید علوم سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے اسے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ شیعوں کا یہ عقیدہ بالکل درست ہے کہ ہر عہد میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے ۔۔۔ شاہ ولی اللہ نے بھی بہت سے حوالوں سے یہی بات کہی ہے۔ عقائد مذہبی کو ہمیشہ علوم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور ہمیشہ ان کوششوں کو الحاد و زندقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام احمد ابن حنبل کے زمانے میں یہی ہوا اور یہی خلفائے عباسیہ کے دور میں جب مسلمان عالموں نے معقول و منقول کی تطبیق کو لازمی سمجھا اور یقین کیا کہ بغیر اس کے ایمان کامل نہیں تو ضرور اس کی طرف مائل ہوئے۔ اس فن میں امام غزالی کی احیاء العلوم اور شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب ضرورت یہ ہے کہ جس طرح قدماً نے یونانی علوم سیکھے تھے۔ ہم آج جدید علوم سیکھیں اور انہیں کی طرح معقول جدیدہ اور منقول اسلامیہ قدیمہ کی تطبیق کی کوشش کریں۔ قدیم یونانی معقولات گمراہ کرنے والے ہیں اور جدید علوم حقیقت اشیاء بتاتے ہیں ۔۔۔" یہ چند جملے تہذیب الاخلاق سے بے ترتیب طور پر نقل کر دیئے گئے ہیں۔ لیکچروں کے مجموعوں میں بھی یہی باتیں ملتی ہیں مثلاً دنیوی علوم اور دنیوی دولت و حشمت سے اسلام کو رونق ہو گی ۔۔۔ دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑنے سے دین جاتا ہے ہمارے بزرگوں نے علم کی حقیقت کو اس قدر جانا کہ ایک

نئے عقلی ہے جو خیال اور حافظہ میں رہتی ہے۔ مگر اس زمانے میں اصلی علم اسی کو کہتے ہیں جو دیکھنے اور برتنے اور تجربے میں آوے۔ رسومات متناقضہ کا موجود ہونا اس کا ثبوت ہے کہ رسومات کو توڑنا اور تبدیل کرنا اور ترقی دینا نہایت فرض کی ہے مجھے (سرسید کو) تکفیر کے فتووں کا ڈر نہیں کیونکہ ایسا ہی غوث الاعظم، امام غزالی اور مجدد الف ثانی کے ساتھ کیا گیا۔ حکمت مسلمان کے لئے گم شدہ چیز کی طرح ہے۔ جہاں کہیں پائے لے لے۔ ہماری (سرسید کی) سمجھ میں کوئی مسئلہ حقیقت اسلام کا یا جو کچھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کسی قدیم یا جدید علم کے برخلاف نہیں ہے۔"

طویل اقتباسات دینے اور ان پر بحث کرنے کے بجائے یہ چند جملے ادھر ادھر سے دیئے گئے ہیں جو اپنی کہانی آپ کہتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ سرسید وقت کے تقاضوں سے مطابقت رکھنے والا ایک علم الکلام مرتب کر رہے تھے جسے پوری طرح وہ قوم سمجھ نہیں سکی تھی جس کی وہ رہنمائی کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی جو مخالفتیں ہوئیں ان کے مختلف پہلو تھے، کوئی انہیں مذہبی خیالات کی بنا پر کافر، غیر مسلم دہریہ اور نیچری سمجھتا تھا، کوئی اصلاح معاشرت کی وجہ سے کرشان اور عیسائی کہا کرتا تھا۔ کوئی مذہبی اصلاح کے اس جوش کو محض ایک سیاسی ڈھونگ سمجھتا تھا جس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا وفادار بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی چنانچہ جمال الدین افغانی نے ایک جگہ لکھ ہی دیا: تفسیر کا تجزیہ کرنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کے اعتقادات کو جو زائل کرنے کی جو کوشش اس مفسر (سرسید) نے کی ہے اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ مسلمانوں پر غلامی مسلط کی جائے اور ان کو اغیار میں ضم کر دیا جائے۔" حقیقت یہ ہے کہ سرسید ہندوستانی تاریخ اور عالمی سیاست کے اس دور ٹ ار رہنمائی کے لئے اٹھے۔ جب اسلامی جوش اور خلوص کے باوجود

ان کے خیالات نے انگریزی حکومت کے دست و بازو مضبوط کئے اور اگر مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر چند قدم آگے بڑھایا تو چند پیچھے گھسیٹ دیا ان کی ایک دشواری یہ بھی تھی کہ مذہب کے معاملہ میں قدیم علماء اور عوام تو ان سے بدظن تھے ہی وہ خود یہ نہیں سمجھتے تھے کہ سیاسی مسائل کے حل کرنے میں مذہب سے کس طرح کام لینا چاہیے۔ چنانچہ وہ ایک طرف تو وہابیت کے بعض پہلوؤں کو سراہتے ہیں دوسری طرف یہ کہتے تھے کہ "انگریز اہل کتاب ہیں۔ خدا نے فرمایا ہے کہ کوئی غیر مذہب والے مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے، اگر ہو سکتے ہیں تو وہ عیسائی ہیں" یا دوسرے موقع پر ایک لیکچر میں انگریزوں کا وفادار رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ "مسلمانوں کے لئے محض عقلی اور انسانی نہیں، خدا کا حکم ہے، رسول کا حکم ہے کہ حاکم کی اطاعت کرو۔" اس طرح عقل پرستی اور اجتہاد فکر نے وقتی مصالح سے ساز کر کے انہیں یہ بھی سکھا دیا کہ وہ مذہب کا سہارا لے کر غلامی کو حق بجانب ثابت کریں۔

علی گڑھ تحریک اپنی مکمل شکل میں ۱۸۷۵ء کے بعد سے نمودار ہوئی اس وقت تک سرسید کے ذہن میں اس تحریک کے واضح نقوش ہوں تو ہوں، عام طور پر اس کی ہمہ گیری ــــ اور ہندوستان کی تاریخ خاص کر مسلمانوں کی ذہنی اور سیاسی تاریخ پر اس کے جو اثرات پڑنے والے تھے اس سے زیادہ لوگ واقف نہیں تھے لیکن نئی زندگی کا جو ولولہ تھا اس نے تھوڑے ہی دنوں کے اندر اس کا رخ معین کر دیا۔ ۱۸۹۸ء تک اس کے مثبت اور مفید پہلو ابھرتے رہے۔ نئے علوم حاصل کرنے، مذہب کو علوم عقلی کی مدد سے قابل قبول بنانے، سماجی اصلاح کرنے اور ہندوستانیوں کو مایوسی کے جہنم سے نکال کر زندگی کی جدوجہد میں شریک ہونے پر آمادہ کرنے، اپنی زبان اور ادب کو سربلند بنانے اور سنجیدہ علمی اور عملی کاموں کی طرف متوجہ کرنے میں علی گڑھ تحریک نے ہندوستان کے عام دور بیداری

کو وسیع تر اور مضبوط تر بنایا۔ اس وقت تک سر سید نے ہندستان کو زیادہ تر ایک قوم کہا اور اگر کبھی ہندو اور مسلمان کے لئے الگ الگ قوم کا لفظ استعمال کیا تو انہیں ایک دلہن کی دو خوبصورت آنکھوں سے تشبیہ دی لیکن جتنا وقت گزرتا جاتا تھا ان کے یہاں ہندو مسلم کی تفریق بڑھتی جاتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ انگریزوں کو بھی وہ ایک ہندوستانی قوم کہنے لگے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۷ء میں اپنے ایک لکچر میں کہتے ہیں کہ "صدیوں سے ہندو مسلمان یہاں آباد ہیں، چند سال سے خدا کی مرضی یہ ہوئی کہ ایک تیسری قوم (انگریز) بھی یہاں آباد ہو — اب یہ تینوں کا ملک ہے۔" اور اس کے تھوڑے دن بعد انہیں یہ احساس بھی ہوگیا کہ وہ قوم ہندوستانی قوموں سے برتر ہے چنانچہ کہتے ہیں: "میں کئی جگہ کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان کے لئے ناممکن ہے کہ ہندو یا مسلمان میں سے کوئی حاکم ہو اور امن قائم رکھ سکے، پھر یہی ہونا ہے کہ کوئی دوسری قوم ہم پر حکمران ہو۔"

شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس مقالہ میں علیگڑھ تحریک کی مکمل تاریخ بیان کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی بلکہ جن حالات نے اسے جنم دیا اور اسے ایک راہ پر لگایا ان کا تجزیہ کیا جائے گا اس لئے ان تمام وجوہ کی جستجو، جن سے یہ تبدیلی ہوئی، یہاں نہیں کی جا سکتی تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ انگریزی حکومت نے غدر کے بعد اپنے استحکام کے لئے جو کوششیں کیں اور جو ذرائع اختیار کئے ان میں ہندو مسلم اتحاد کو روکنا بھی تھا۔ دونوں فرقوں میں اُن عناصر سے ساز باز کرنا بھی تھا جو اس کے معاون اور حلیف بن سکیں۔ یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ ساری رعایا حکومت کی نظر میں یکساں ہے اور اس کے لئے ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں، اس معاشی استحصال اور لوٹ پر پردہ بھی ڈالنا تھا جو ڈیڑھ صدی سے جاری تھا۔ اس طرح غدر کے بعد مغربی اثرات سے پیدا ہونے والی بیداری کے باوجود ہندوستان میں اصل کشمکش یہ تھی کہ یہاں غیر ملکی حکومت ہوگی یا ان قومی عناصر کا اتحاد ہوگا جو ہندوستان کی ترقی انگریزوں کے مفاد کے لئے نہیں، ہندوستان کے مفاد کے لئے چاہتے ہیں۔ اس میں وفاداریوں کی تقسیم واضح نہیں تھی اور سیاسی شعور جس منزل پر تھا اسے دیکھتے ہوئے ہو بھی نہیں سکتی تھی لیکن حاشیات اور تاریخ کے ہر طالب علم کو وہ نشانات نظر آسکتے ہیں جو انگریزی مفاد کے تابوت میں کیلوں پر کیلیں ٹھونک رہے تھے۔ ہندوستانیوں کو ہی نہیں باشعور انگریزوں کو انگریز دشمنی کے بھوت منڈلاتے نظر آرہے تھے۔ ۱۸۵۶ء میں نیک دل لارڈ کیننگ نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالتے ہوئے کہا: "میں اپنے عہد حکومت میں امن چاہتا ہوں لیکن میں اس بات کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا کہ کہیں ایسا نہ ہو ہندوستان کے افق پر جو بظاہر نہایت پرسکون اور خاموش نظر آتا ہے۔ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ابھر آئے، شاید ٹکڑا آدمی کی ہتھیلی سے بڑا نہ ہو لیکن بڑھتا ہی جائے، بڑھتا ہی جائے یہاں تک کہ یکایک طوفان کی طرح پھٹ پڑے اور ہمیں برباد کر دینے کی دھمکی دینے لگے۔" اور سال بھر کے اندر ہی اندر یہ بادل اٹھا، گرجا، برسا اور انگریزوں کے لئے تباہی کی دھمکی بن گیا ——؟

علی گڑھ تحریک کے ابتدائی دور اور بعد کے ادوار میں جو فرق ہوتا چلا گیا۔ اس کی جڑیں ہندوستان کی قومی تحریک کی تاریخ، اس کی خامیوں اور خوبیوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ دو باتیں اکثر کہی جاتی ہیں اور دونوں غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہیں ایک تو یہ کہ ہندوستان میں قومی احساس کانگریس کے قیام (سنہ ۱۸۸۵ء) سے شروع ہوا اور دوم یہ کہ اس کی ابتدا انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی کیونکہ اس کی بنیاد ایلن آکٹیوین ہیوم نے رکھی اور وائسرائے لارڈ ڈفرن نے اس کی کامیابی کا پیام بھیجا۔ گویا اس احساس کے لئے انگریزوں کا منت کش ہونا چاہیے۔ اس خیال میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ قومیت کا احساس انیسویں صدی میں پیدا ہوا اور یہ نہ محض تھا انگریزوں

کے وجود کا۔ یہ بھی درست ہے کہ اس میں مغربی طرزِ فکر سے مدد ملی لیکن اسے انگریزوں کی دین سمجھنا غلط ہوگا۔ ہندوستان میں قومیت کا ارتقا اس معاشی پستی اور غلامی کے احساس کا نتیجہ ہے جس کا پیدا ہونا لازمی تھا چنانچہ اگر ہم سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی جدوجہد کو نظر انداز بھی کر دیں تو اس احساس کی جماعتی شکلیں برٹش انڈیا سوسائٹی (سنہ [illegible]ء) برٹش انڈیا ایسوسی ایشن (سنہ ۱۸۰۱ء) بمبئی ایسوسی ایشن (تقریباً سنہ ۱۸۵۰ء) بنگال نیشنل لیگ، انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ، سروجنک سبھا پونا (سنہ ۱۸۷۰ء) نیٹو ایسوسی ایشن مدراس، مہاجن سبھا مدراس (سنہ ۱۸۸۴ء) جیسے اداروں کی صورت میں نمودار ہو چکی تھیں اور ہندوستان کے کئی سو اخبار نرمی اور گرمی کے ساتھ ہندوستان کے قومی جذبات کا اظہار اور قومی احساس کی تشکیل کر رہے تھے اس لئے نیشنل کانگریس کو پہلا قومی ادارہ کہنا درست نہیں، یہ ضرور ہوا کہ اس نے دوسرے قومی اداروں کی اہمیت کم کر دی۔ اب رہا یہ کہ ایک انگریز نے کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ اس کی داستان بھی دلچسپ ہے، مسٹر ہیوم کے سوانح نگار سر ولیم وڈربرن نے اس کی تفصیلات دی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جب ہیوم نے سات بڑی بڑی جلدیں صرف ان رپورٹوں سے بھری دیکھیں جو گاؤں، قصبوں، شہروں و ضلعوں سے اکٹھا کی گئی تھیں اور جن میں لوگوں کی بافیانہ بات چیت، کچھ کر گزرنے کے ارادے، ہر حالت میں متحد رہنے کے عہد و پیمان، اسلحوں کی درستی اور بغاوت کے عزم کی کہانیاں تھیں تو وہ حیرت زدہ اور خوف زدہ ہو گیا اور اس نے انگریزوں کی مخالفت کے اس جذبہ کو "دستوری" اور "آئینی" شکل دینے کے لئے ایک قومی ادارہ بنانے کی تجویز پیش کی۔ اس لئے یہ رائے قائم کرنا ٹھیک نہ ہوگا کہ قومی تشکیل کی ابتدا انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ تو واضح ہے کہ ایسے سارے ارتقا میں ارتقاء بالضد کا اصول کارفرما ہوتا ہے اور تعمیر و تخریب کا عمل ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہاں اس تذکرے کا مقصد یہ ہے کہ قومیت کے نشو و نما کے لئے فضا تیار تھی اور انگریزی حکومت یا ملکہ وکٹوریہ سے وفاداری کے اعلان کے پردے میں اس کی تشکیل ہو رہی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابھی نیشنل کانگریس کی عمر دو سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور اس کے اجلاسوں میں وفاداری کے اعلانات کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی کہ حکومت اور اس کے حلیف عناصر نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ کانگریس کی ابتدائی کارروائیوں میں ہندوستان کے ابھرتے ہوئے متوسط اور سرمایہ دار طبقہ کے مقاصد اور مفاد کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، معمولی پیمانے پر سہی، یہ مفاد غیر ملکیوں کے مفاد سے متصادم تھا اس لئے تھوڑے ہی دنوں کے اندر حکومت نے سرکاری ملازموں کو کانگریس کے جلسوں میں شرکت کرنے سے روک دیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک یا سرسید کا اس سے کیا رشتہ تھا۔ سنہ ۱۸۸۸ء تک کی کانگریس کی کارروائیاں دیکھی جائیں تو اندازہ ہوگا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی سرسید جس کے مخالف ہوتے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ سرسید کو ہندوستان کی معاشی پستی کا احساس نہ تھا لیکن عملاً ہوا یہی کہ سرسید کا نقطۂ نظر محدود ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے کانگریس کی مخالفت شروع کی۔ مسلمانوں کو سیاسی امور میں حصّہ لینے سے روکا۔ رئیس اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں کی تفریق پر زور دیا۔ لوکل بورڈ کے انتخاب کی مخالفت کی، سیاسی شورش سے خوفزدہ ہو کر مسلمانوں کو سمجھایا کہ ہم کو الگ رہنا چاہئے بجز بیہودہ غل کرنے کے ہم کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتے۔ بنگالی رہنماؤں کی سیاسی جدوجہد کو مسلمان قوم پر بغاوت اندازی سے منسوب کیا۔ اس بات پر زور دیا کہ اگر انگریز چلے گئے تو ملک میں امن نہ رہیگا۔ مسلمانوں کو بار بار یہ بتایا کہ صرف انگریز تمہارے دوست ہیں اور یہ سب کچھ تقریباً دو تین سال کے اندر ہوا۔

بعض حضرات نے اس تبدیلی کو تھیوڈور بک پرنسپل علی گڑھ کالج کی سیاسی چال کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اور ایسا نتیجہ نکالنا کچھ بہت غلط بھی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کی ایک خاص منزل پر "بیک کی جادو بیانی" اس لئے "کارگر" ہوگئی کہ سرسید نے مسلمانوں کے صرف فوری مفاد پر غور کیا۔ یہ فوری مفاد سرکاری ملازمت حاصل کرنا تھا اور سیاسی یا قومی تحریکوں میں شرکت کے ساتھ یہ بات ناممکن ہوگئی تھی۔ یہ چیز ان کے طبقاتی مفاد سے بھی ہم آہنگ تھی۔ ترقی کی دوڑ میں مسلمان پیچھے تھے، دولت میں کم تھے، تعداد میں کم تھے۔ بڑی دشواریوں کے بعد حکومت نے ان پر بھروسہ کرنا شروع کیا تھا بغاوت اور شورش پسندی کا دھبہ ان کے دامن سے دھویا گیا تھا اور سرسید جب ترقی کا تصور کرتے تھے تو ان کے ذہن میں "زرق برق وردیاں پہنے کرنیل اور میجر بنے ہوئے" مسلمان نوجوان ہوتے تھے۔ اعلیٰ عہدے حاصل کرنے والے تعلیم یافتہ لوگ ہوتے تھے اس لئے سرسید نے تعلیم و تربیت کے ان پہلوؤں پر زور دینا شروع کیا۔ اگر کوئی شخص اس مسئلہ کے طبقاتی پہلو کو سمجھنا چاہئے تو اس کے لئے انکے ایک لکچر (۱۶ مارچ سنہ ۱۸۸۸ء) کی یہ چند سطریں کافی ہوں گی: "ہم علم میں کم ہیں، دولت میں کم ہیں۔ ہندو چاہیں تو ہم کو ہمیں گھنٹے میں تباہ کر دیں۔ اندرونی تجارت بالکل ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ بیرونی تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ جو تجارت ہندوؤں کے پاس ہے وہ انہیں کے ہاتھ میں رہنے دو۔ کیونکہ نہ ہم دوکان پر بیٹھ کر آٹا دال بیچ سکتے ہیں، نہ سوت کپاس۔ ہمارے ملک کی پیداوار کی تجارت جو انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور جس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں اس کو ان کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرو ان سے کہدو کہ آپ آپ تکلیف نہ کریں ہم خود اپنے ملک کا چمڑا انگلستان لے جائیں گے اور وہاں بیچیں گے۔ ہڈیاں امریکہ

سرسید مرحوم نے غدر کے دوران انگریزوں کے مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے

لے جائیں گے، غلہ اور روئی کی تجارت کریں گے، انگریز اس میں دخل نہ دیں گے مگر یہ سب باتیں تعلیم پر موقوف ہیں۔" یہاں وہ کشمکش نمایاں ہے جو اس عہد کے دوسرے رہنماؤں کے یہاں بھی تھی لیکن اس کا لب ولہجہ اس کا مقصد دادا بھائی نوروجی، سریندر ناتھ بنرجی، لال موہن گھوش، اریش چندر دت کے لب ولہجہ اور مقصد سے مختلف ہے حالانکہ ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جو انگریزی حکومت کی برکتوں کا ثناخواں نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ سرسید انگریزی حکمت عملی کا شکار

ہوگئے۔ ان کی نگاہ محدود ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ
انہوں نے صرف مسلمانوں اور وہ بھی ہندوستانی مسلمانوں
کے ایک چھوٹے سے طبقے کے مفاد کو اپنے تمام اعلیٰ خیالات
کا مرکز بنالیا اور انگریزوں کی حمایت میں یہ بھی بھلا دیا کہ انگریز
مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کا خون بھی چوس
لینا چاہتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک اس طرح آہستہ آہستہ تضاد
کا شکار ہوتی گئی اور سرسید کے غیر معمولی ذہن نے اپنی کمان
سے ترقی کے تیر نکال کر رجعت پسندی کے تیر لگالئے جس سے
خود انکی تحریک زخمی ہوگئی۔

جیسا کہ کہا گیا علی گڑھ تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی
یہ ہندوستان کے دورِ بیداری کا ایک اہم جزو تھی۔ اس نے
ہندوستان کے مسلمانوں کو حالات کا ساتھ دینا، وقت کے
تقاضوں کو سمجھنا اور مایوسی کے جنگل سے نکلنا سکھایا تھا
اس کے اصلاحی مشن نے طرزِ کہن پر اڑنے اور تعلیم نو سے ڈرنے
سے بچایا تھا۔ اس نے کسی حد تک جاگیردارانہ تصورِ حیات سے
نکال کر جدید صنعتی دور کی طرف متوجہ کیا تھا لیکن اس کی تعمیر
میں جو خرابی کی صورت مضمر تھی وہ یہ تھی کہ اس میں ضرورت سے
زیادہ حاکم طبقہ سے مدد لی گئی اور اسے عوام کی پہونچ سے
باہر رکھا گیا۔ جن عناصر کی مدد سے اس تحریک کو چلانے کی کوشش
کی گئی انہوں نے اس کے صحتمند پہلوؤں کو دبا کر محض وقتی
فائدہ پہنچانے والے پہلوؤں کو ابھارا لیکن پھر بھی اس نے جو کچھ
حاصل کیا وہ ہندوستان کے تاریخی اور سماجی ارتقا میں سنگ
میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید کے ادبی کارنامے تہذیب
الاخلاق اور اس کی جاندار نثر، علمی اور ثقافتی مسائل پر بحث
مباحثے، ڈاکٹر نذیر احمد کے ناول اور لکچروں کے مجموعے، خواجہ
الطاف حسین حالی کی شاعری اور تنقیدی بصیرت، محسن الملک
چراغ علی، وقار الملک، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی کے ادبی کارنامے
تحریک سے مخالفت کے باوجود شبلی کے ادبی اور علمی شاہکار
اور ان سب سے بڑھ کر وہ زندہ تحریک اور ترقی پذیر ادبی اور
علمی فضا جو ان بزرگوں کے کارناموں سے وجود میں آئی۔
یہ ساری چیزیں علی گڑھ تحریک کے دفترِ عمل میں لکھی جائیں گی۔

یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے قومی زبانوں
کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہونچا دیا، معمولی بول چال
کی زبانوں کو ادبی خزانوں سے مالا مال کر دیا، یہ بات
ہندوستان کے ادبی ارتقا کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے یہاں
کی سبھی جدید زبانوں میں شعر و ادب موجود تھے لیکن اس
دورِ بیداری نے حقیقت پسندی، تنومند اسلوب بیان، ادب
اور زندگی کے رشتہ پر زور دے کر ادب کو جاندار بنایا۔
سرسید اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں اردو ادب نے
ایک نئی کلاسکی عظمت حاصل کی جس کے حسن میں رعنائی کم،
صحت زیادہ ہے، ان لوگوں نے جن نئی چیزوں کو قبول کیا اسے
محض نقالی یا تقلید نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ نئی زندگی میں داخل
ہونے کا شعوری احساس تھا جس نے ادب کو سماج اور
تہذیب کے ارتقا کا ایک اہم آلۂ کار بنا دیا۔ شعر و ادب کے
گیسو تو ہمیشہ ہی شانے کے منت پذیر رہتے ہیں آرائش
کاکل کا سلسلہ جاری ہی رہتا ہے لیکن سرسید کے دور میں
اور علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر اردو ادب کی ایک منزل آئی
اور ایک نئی منزل کی طرف ادب کا کارواں رواں ہو گیا، نئے
یقین اور نئے حوصلوں کے ساتھ نئے امکانات اور نئے
جذبے کے ساتھ، علی گڑھ تحریک کی یہی وہ ممتاز خصوصیت
ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی نہیں بلکہ اسے اس
تحریک کی بہت سی خامیوں کا کفارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ●

Registered with the Registrar of News Paper at R. N. No. 12786/61
Regd. No. D. 1645 'HUMA Phone : 78864
MONTHLY URDU DIGEST DELHI
Vol. 8 August 1972 No. 73

جس نے آغاز سفر ہی میں
اہلِ ذوق سے وہ بے پناہ
خراجِ تحسین حاصل کیا ہے
جسکی نظیر اردو تاریخ میں
ملنی مشکل ہے۔

بلاشک وشبہ
اسلامی ڈائجسٹ **هدیٰ**
علمی، ادبی اور اسلامی رسالوں
کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔

اس عدیم المثال علمی ادبی اور
اسلامی گلدستہ کا تازہ شمارہ
ہر ریلوے بکسٹال اور اخبار فروش سے ملسکتا ہے۔

- از اول تا آخر رنگین فوٹو فلم کی نظر افروز طباعت اور نادر و نایاب تصاویر سے آراستہ
- دلچسپ ادبی، علمی اور تفریحی مضامین کا خزانہ
- اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب، اسلامی روایات، اسلامی فتوحات، اسلامی علوم، عظیم مسلم شخصیتوں اور ماضی وحال کی مسلم اقوام کے کردار و حالات کا حقیقی عکاس

انڈین فائن آرٹ پریس دہلی ۶